آگ کا دریا
جلد سویم
قرۃ العین حیدر
KURF
FlamingText.com
جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم دانش

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

ناول

آگ کا دریا

از

قرۃ العین حیدر

بشکریہ

اقبال سائبر لائبیری

تعارف،سرورق،ترتیب و پیشکش

محمد علی جنید

www.facebook.com/kurf.ku
www.kurfku.blogspot.com

جامعہ کراچی دارالُتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University Research Forum

تعارف

از:محمد علی جنیدَ:ریسرچ اسکالر،شعبہ سیاسیات،جامعہ کراچی۔

قرۃ العین حیدر کا نام اردو ناول نگاری میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے لکھنوی تہذیب کے ضمن میں انکی تحریریں لکھنو کی اگر چہ یادیں اور تاریخ تو ضرور یاد دلاتی نظر آتی ہیں ، مگر ان میں جو امر انھیں منفرد بناتا محسوس ہوتا ہے وہ انکا سلیس ،آسان اور عام فہم انداذ ہے جس میں لکھنوی ادب و طرز کلام کے برخلاف سلاست،روانی،ربط و ضبط کا پایا جانا ہے،لکھنوی میں نے اس لئے کہا کہ انکی تحریروں میں لکھنو ،اسکے نوابوں انکی تشیعت کی بابت اشارے وہ گفتگو اکثر چھلکتی نظر آتی ہے ،اور خصوصاً آگ کا دریا میں ایسا اکثر نظر آتا ہے،اور خود انکی بھی اہل تشیع حضرات سے وابستگی کا اتا پتا معلوم ہوتا ہے،مگر کہیں بھی وہ عقائیدی تعصب کی خبر لگنے نہیں دیتی ہیں ہاں جدید نسائیت ،لبرل فکر کی طرف انکا جھکاو واضح لگتا ہے۔

اس پیرائے میں انکی بھلے لکھنو سے انسیت رہی ہو مگر انکا طرز کلام جدید دھلوی انداز کا طرزِ کالم نظر آتا ہے،مگر بحر حال وہ مولد کے لحاظ سے یو۔پین و علیگڑھی ہیں اور فکری لحاظ سے لکھنوی۔

انکا تعارف کرانا میں ضروری جانتا ہوں کیونکہ اس سے انکے پس منظر کا اندازہ قایم کرنا آسان محسوس ہوگا،جہاں تک خاندان کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ انکا خاندان اردو ادب میں ایک معروف خاندان تھا بلخصوص افسانے اور مختصر کہانی نویسی میں جانا مانا جاتا تھا ۔

حیدر، مرحوم سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰ تا ۱۹۴۳) کی دختر تھیں ،جنکا شمار برصغیر کے اولیں ،افسانہ اور مختصر کہانی نویسوں میں کیا جاتا ہے،خود سجاد حیدر کی زوجہ اور قرۃ العین کی والدہ محترمہ بھی اول اول بنتِ نظرالباقر اور نظر سجاد ظہیر (۱۸۹۵ تا ۱۹٦۷) کے قلمی نام سے لکھا کرتی تھیں ،اس ضمن میں وہ ناول نگاری میں محمدی بیگم اور ممتاز علی کے زیر تربیت بیان کی جاتی ہیں۔

قرۃالعین حیدر (۱۹۲۷ تا ۲۰۰۷) بمقام علیگڑھ،اتر پردیش (یو ۔پی) میں پیدا ہوئیں اور بمقام نوئڈا انکا ارتحال ہوا،اندر پرستھ ،کالج اور جامعہ الہٰ آباد کو انکے مادر علمی ہونے کا شرف حاصل ہے،انھونے مختصر کہانی نویسی اور ناول نگاری میں اردو ادب میں اپنا لوہا منوایا،انھونے قریباً بارہ کے قریب ناول و ناولٹ تحریر فرمائے جبکہ چار مختصر کہانی کے مجموعے بھی انکے طبع ہوئے انکا سب سے عظیم شاہکار آگ کادریا نامی ناول ہے جو تین جلدوں میں طبع ہوا:

انکی خاص الخاص تحریریں درج ذیل بیان کی جاتی ہیں :

عدد	ادبی کارنامے	سنہ
۱	آگ کا دریا	
۲	میری بھی صنم کہانی	۱۹۴۹
۳	سفینا ئے غمِ دل	۱۹۵۲
۴	پتجھڑ کی آواز	۱۹۶۵
۵	روشنی کی رفتار	۱۹۸۲
٦	مختصر ناول :چائے کا باغ	۱۹۶۵
۷	exploring gender injustice ،دلربا، سیتا ہرن، اگلے جنم موہے بیتیا نا کیجیو: نامی ناولٹ وغیرہ	
۸	خاندنی تاریخوار آب یتی:جہاں دراز ہے،	
۹	۱۸۵۷ کے پس منظر میں شرفا کے خاندانوں کے عورتوں کی حالتِ ذار پر ایک ضخیم دستاویزی ناول بنام :کارِ جہاں دراز ہے	
۱۰	آخری شب کے ہمسفر:جسمیں بنگال اور نکسال بغاوتی نما تحریکِ آزادی کو بیان کرتی منظر کشی عیاں کرتا ناول	
۱۱	چاندنی بیگم :تقسیم کے چالیس سالوں کے نسائی پسِ منظر کو عیاں کرتا ناول	
۱۲	میرے بھی صنم خانے :اولیں ناول	
۱۳	انھونے کم عمری میں بچوں کے ادب کے ضمن میں بی چوہیا نام ایک کہانی بھی رقم بند فرمائی تھی	

انھیں انکی خدمات کے ضمن میں جن اعزازات سے نوازا گیا ان میں خاص الخاص درج ذیل ہیں :

عدد	ایوارڈ	سنہ
۱	جنپتھ ایوارڈ برائے آخری شب کا ہمسفر	۱۹۸۹
۲	ستھیا اکیڈمی ایوارڈ	۱۹۶۷
۳	سویت :نہرو ایوارڈ:	۱۹۶۹

۴	غالب ایوارڈ	۱۹۸۵
۵	ستھیا اکیڈمی ایوارڈ:برائے :پتجھڑ کی آواز:ضمن :مختصر مجموعہ کہانی نویسی	۱۹٦۷
٦	اردو اکیڈمی:بہادر شاہ ظفر ایوارڈ	۲۰۰۰
۷	بھارتی حکومتی:پدما شری ایوارڈ	۱۹۸۴
۸	بھارت کے تیسرے سب سے بڑے سول اعزاز:پدما بھوشن	۲۰۰۵

انکی پیشہ وارانہ خدمات ادب،تعلیم اور صحافت تک محیط نظر آتی ہیں :

	خدمات	سنہ
	انتظامی ایڈیٹر :رسالہ :امپرنٹ [1] :بمبئی	۱۹٦۴۔۔۱۹٦۸
	رکن مجلس ایڈیٹوریل :السچریٹیٹ ویکلی آف انڈیا[2]	۱۹٦۸۔۔۱۹۷۵
	تعلیم:	
	جزوقتی مہمان لیکچرار[3]: جامعات:جامعہ کیلیفورنا،جامعہ شکاگو،جامعہ وسکونسن ،اور جامعہ ایریزونا	
	دورہ جاتی پروفیسر [4]برائے شعبہ اردو،جامعہ علیگڑھ ۔بھارت	
	پروفیسر ایمرٹس [5] :خان عبدالغفار چییر :جامعہ ملیہ،نئی دھلی	
	بین الاقوامی تحریری پروگرام:ریزیڈنٹس[6]	۱۹۷۹

انھونے اگر چہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان ہجرت کی تھی اور اسکے لئے دلایل بھی دئے تھے جیسا کے آگ کا دریا میں انھونے آخری صفحات میں اس امر کی تصویر کشی بھی کی ہے ،اور وہاں پر رہ جانے والوں کی مالی و سماجی حالتِ زار پر بھی روشنی ڈالی ہے مگر لگتا ہے پاکستان مین چلتی تعصبانہ ،لسانیت،و صوبائیت ،ذہنی

[1] **Imprint.**
[2] **Illustrated weekly of India.**
[3] **Visiting Lecturer**
[4] **Visiting professor**
[5] **Professor Emeritus**.
[6] **Resident.**

صـــورتحال و جمود کے ســـبب انھونے واپس بھارت جانے کو ترجیع دی،کچھ انک دلی وابستگی بھی اجداد کی سرزمیں سے تھی۔

کچھ عرصہ انگلستان میں بھی رہایش پزیر رہھیں جیسا کہ انکا کردار روپا بھی انگلستان کی فضـاوں میں بسلسلہ تعلیم اور فکری غذا کے لئے سـرگرداں نظر آتی ہے ،کچھ انکی طبیعت کی تیزی،انا پرستی،یا اصول پسندی کی روش کے سبب ان میں خاص حریت نمایاں رہی ہے جســکا ایک اثر روپا کے کردار میں نظر آتا ہے جو چار اہم کرداروں میں ســـے واحد مگر اہم نسائی کردار ہے جو آگ کا دریا میں نظر آتا ہے۔

یہ ناول ایک دیو مالائی ناول ہے جسکا آغاذ قبل تاریخ چوتھویں یا پانچویں قبل مسیح کے ہندوستان سے ہوتا ،جہاں وہ چندرگپت موریا،اور چانکیہ کا ضمناً تذکرہ کرکے کرداروں کو ارتقائی طور پر تقسـیم پاکسـتان تک چار کرداروں کے ضـمن میں دکھاتی نظر آتی ہیں ،اور یہ چار کردار،کمال الدین،روپا،سیرل صـاحب،اور گوتھم کے ہیں اس ناول میں جا بجا ہندو دیومالائی رنـگ،ہندوی فسـلفہ،واحدۃ الوجود،تصـوف،تاریخ کو اپنے پلاٹ کے ضـمن میں پیش کرکے اپنے کرداروں کا مختلیف وقتوں میں ارتقا کرتا دکھایا گیا ہے یہاں تکہ تقسیم ہوکر ہندوستان، پاکستان و ہندوستان میں منقسم ہوجاتا ہے ہر کوئی اپنی اپنی دنیا میں مست زمانے میں ضم ہوجاتا ہے سوائے ان چار کرداروں کے۔

روپا اور اسکے کرداروں کےضمن میں لگتا ہے روپا کے کردار کی اصل قرۃ العین حیدر ا پنے کسی کزن سے عشق تھا جس سے وہ ذہنی ہم آہنگی کا نا ہوسکی یا انکو غالبا انا کی روپائی فکر، انکی کچھ مجبوریوں کے سبب وہ شـادی نا کرسـکیں اور کنواری رہ گئیں مگر ،ہمیں اسکے حقیقی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بس اتنا ہے کے خاندانی خود نوشـتوں اور کرداروں کی کچھ اصـل پر شـک بھی ہوتا ہے ،ظاہر ہے تخیلی کرداروں کی کچھ نا کچھ اصل موضوعیت کے ضمن میں خالق تحریر کے اذہان میں پس پشت کرداروں کاتعین کرتی رہتی ہے ۔

میں یقین سے تو دعویٰ نہیں کرسکتا نا میں کوئی ادیب یا اردو ادب کا ناقد ہوں اور نا میرا اس قسم کا سرے سے دعویٰ ہے مگر آج جو اردو پاکستانی ادب جسکا چلن یہاں عام ہے وہ تاریخی و دیومالائی ناول ہیں جن میں ایک عجب سا سحر ،جاذبیت،پرسرارئیت

ارتقا ملتا ہے جس کی ایک پوری ادبی فصل یہاں تاریخی و دیومالائی ناول نگاری کے ضـمن میں انوار صـدیقی، قمر اجنالوی، اسـلم راہی، ایم۔ آصـف،ایم۔اے۔راحت جیسـوں کی صورت میں نظر آتی ہے اسکی اصل روح کہیں نا کہیں آگ کا دریا سے اخذ کردہ ہے۔

خود میں نے آگ کا دریا کچھ سال قبل اس تجسس کے ساتھ پڑھا تھا کہ اس میں ایسا آخر کیا ہے کہ اتنی واہ واہ کی جاتی ہے،جبکہ مذکورہ بالا ناول نگاروں کو میں اپنی کم عمری میں پڑھ چکا تھا۔

مگر آگ کے دریا کا تقدم زمانی اور انداز بیان مجھ کو یہ ادراک کرواگیا کہ ان سب کی ممکن ہے کہ اصل حیدر صاحبہ کی ہو ،کرف کے تحت اگر چہ ہم نے جدیدیت،فلسفہ،علم کلام،معاشرتی علوم ،معاشیات و سیاسیات کے میں ۲۰۱٦ میں کئی برقی مطبوعات پیش کیں تھیں ،مگر میں اپنے مزاج ،مذہبیت،اور علمی تحقحقات کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے فروغ میں بھی دلچسپی کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا ۔

جبھی فکر ساز ادبی کتب و تراجم کو بھی پیش کرنے کا سلسلہ قایم کیا اور ۲۰۱۷ میں قرۃ العین حیدر کی یہ کتاب مذہبی،فکری،اختلاف جدیدیت،الحادیت ،مغربیت کے خلاف ہمارے جہاد کے باوجود نسائیت ،جدید دور کی عورت کی فکر ،ذہنی پرواز،قدامت سے جدیدیت کی طرف سفر اور ماضی سے عشق کو عیاں کرتی ہے جبھی اس ضمن میں ادب کو پڑھنا لازمی ہے ،لکھنے،پڑھنے،بولنے ،تہذیب کے سیکھنے اور تخیل کی پرواز کا اندازہ کرنے کے لئے ادب کا مطالعہ لازماً کرنا چاہئے یہ کوئی مذہبی صحیفہ نہیں ہے جبھی اس سے مذہبی مواد و عقاید کی توقع بھی وابستہ نا کی جائے،اسے ادب ہی کی طرح لیا جائے اور ادب کی طرح پڑھا جائے۔

مجھے کئی اہل علم نے بتایا ہے کہ خود عربی و فارسی قدیم ادب میں بھی عشق و محبت ،رزم و بزم ،فطرت کی تصویر کشی کے ضمن میں ایسی ایسی تحریریں ملتی ہیں جنکو شاید کوئی مذہبی پیرائے میں انھیں فحاشی و عریانی،اور جزبات کو برانگیختہ کرنےوالا گردانے ، مگر انکا ادبی مقام مسل ہے اور علما بھی اکثر صرف و نحو،اشعار ونثر کے ضمن میں ان سے دلایل لیتے ہیں ،امرا و لقیس یا لیلی و مجنوں ،یا سبعہ معلقات میں بھی ڈھونڈنے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔

متبنی کا کلام بھی ایسے اشارے دے جاتا ہے باقی،حافظ،خیام،رومی سے بھی یہ سب ڈھونڈنھے سے مل جائیگا بس فکر و نظر کا اختلاف ان میں اپنا اپنا مطلوب ڈھونڈھنتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی یہ تحریر تین جلدوں میں پیش کی جارہی ہے ،اور میں دقیق و مشکل ،بے کیف فلسفیانہ فکر کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی ذہنی سکون کے لئے ایک ذہنی دوا و طریقہ گردانتا ہوں ۔

اس تحریر سے خیر مصنفہ کی نسائیت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ اجداد و اکابر کی فکر سے عشق و وابستگی بھی چھلکتی نطر آتی ہے ،اس میں جو آواگون کے تحت چار کردار دکھائے گئے ہیں، انھیں تخیل کی پرواز تک ہی محدود کرکے مذہبی عقائید کی فکر و نقد سے دور رکھیں تو بہتر ہوگا۔

اور بستر پر دراز خود کو بس گنگا جمنا کے دیس میں ملاح کے چلتے چپوؤں کے زیر سایہ کشتی پر دراز دیکھیں اور پانی کی چھینٹوں سے دامن بچائیں رکھیں اور اسکی چاشنی و شیرنی کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا غم اسکے کرداروں کی صورت میں محسوس کریں۔

قرۃ العین حیدر کو سب پیار سے عینی آپا کہتے تھے،وہ ۲۰۰۷ مین بمقام نوئیڈا بعارضہ مرض جگر انتقال فرماگئیں اور انھیں جامعہ ملیہ دھلی کے قبرستان میں سپرد خاک فر مایا گیا:

ذیل کے کچھ نمونے انکے اس شاہکار آگ کا دریا کے کرداروں کے مختصر پہلووں کے ساتھ ساتھ انکے طرز کلام کی عکاسی کرتے نظر آئینگے :

جلد اول: آغاز:

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے پیچھے ٹھٹھک کر دیکھا، راستے کی دھول بارش کی وجہ

سے کم ہوگئی تھی، گوکہ اس کے اپنے پاوں مٹی سے اٹے ہوئے تھے.. برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے، اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کے ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں.. ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی.. گوتم کو خیال آیا گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں.. اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاحنے زور زور سے ساون الاپنا شروع کردیا تھا، آگے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا شراوستی یہاں سے پورے پچیس کوس دور تھا اور گوتم نیلمبر کو ندی تیر کر پار کرنی تھی گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، ان کے ہنسنے کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں لڑکیاں کتنی باتونی ہوتی ہیں، گوتم نے سوچا، انہیں بھلا کونسے مسئلے حل کرنے ہیں، اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انہیں دیکھ لے.... خصوصا اس کیسری ساڑھی والی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑس رکھا تھا.. اسکے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی.. اسکے گھنگھریالے بال تھے اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھنویں. قریب پہنچکر گوتم نے ان دونوں کو لحظہ بھر کے لیے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں گھاٹ کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے چھلانگ لگادی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے میں مصروف ہوگیا

لڑکیوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا کوئی ودیارتی تھا جان پڑتا ہے، ان میں سے ایک نے کہا.. ملاح اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا انتظار کرتے رہے، کشتیاں جو برگد کے سائے میں بندھی تھیں ان میں چولہے روشن کیے جا چکے

تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا
ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپا کے بالوں پر آن کر گرا، اس نے ندی کی اور دیکھا جدھر وہ اجنبی طالب علم لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مارتا کسی انجانی سمت جا رہا تھا

ایک جگہ لکھتی ہیں کہ :

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرمانبردار اور عقیدت مند چیلا تھا اور گرو کے احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھا لہٰذا جب کبھی وہ شراوستی کے ناچ گھر یا قمار خانے کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتا

دوسری جگہ رقمطراز ہیں کہ :اور بدھا کے طرف اشارہ دیتی ہیں؛

سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں..جنوب کے راجہ بھون کہلاتے تھے..شمال کے وراٹ اور مغرب کے سوراٹ لیکن سامراجیہ کی داغ بیل مگدھ میں پڑنی شروع ہو چکی تھی..یہاں کے بادشاہ مدتوں سے سمراٹ کہلا رہے تھے..جس عالمگیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نیتی شاستروں میں کیا جا رہا تھا..اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکرٹ بادشاہ جو کہ سارے ملک کا بادشاہ ہو ابھی تک پیدا نہیں ہوا تھا..چکرورتی بادشاہ....جس کی مملکت کے ساتھ رتھ کا پہیہ بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا رہے
اور شاکیہ منی نے کہا تھا...میں شہنشاہ ہوں اے سیلا...میں نے اچھائی کے رتھ کا چکر چلایا ہے....

<u>بعد ازاں وہ ایران کی تاریخی حقیقت و قدامت کا حال بیان کرتی ہیں :</u>

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی... اتنی زبردست کے ایک لمحے کے لیے بھی اسے احاطہ تصور میں نہ لایا جا سکتا تھا... اس سامراج میں مصر اور بابل اور شام اور ایشیائے کوچک اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اترا پتھ صوبے سبھی شامل تھے اور سر یوش کے بعد دارا نے کہا تھا.. میں دارایوش ہوں.. شہنشاہ.. شاہوں کا شاہ.. ملکوں کا بادشاہ جن میں بھانت بھانت کے انسان بستے ہیں... اس وسیع و عریض زمین کا حاکم... گشتاسپ اک بیٹا.. ایرانی... ایرانی کا بیٹا.. آریہ... آریہ گھرانے کا فرزند... اور اس کے جہازوں کے بیڑے مقدس سندھو کی لہروں پہ تیرتے تھے...

اور دارایوش اول کے بیٹے ارتخشیر نے اترا پتھ کی ان مقبوضات کے متعلق فخریہ اعلان کیا تھا... یہ علاقے جہاں دیو پوجے جاتے تھے.. اہورمزدہ کی خواہش کے مطابق میں نے ان دیوں کے مندروں کی بنیادیں ہلا دیں...

اب اچانک سے تاریخی جست لگا کر وہ کمال الدین کے کردار کے ساتھ چپما کو دکھاتی نظر آتی ہیں ؛

''جانتی ہوں مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو۔۔۔یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔''

''چپا رانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ اس کے اور پگڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔ تم اودھ والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندھیل کھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔ دیکھے ہیں کبھی! ایک مرا یار ہے اودے سنگھ راٹھور۔ قنوج کا راجپوت ہے۔ کیا بانکا آدمی ہے۔ آج کل جانے کہاں ہوگا۔ سنا تھا گوالیر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔ پتا نہیں شاید مالوے میں کہیں لڑ بھڑ رہا ہوگا۔'' کمال الدین چند لمحوں کے لیے اپنے میدان جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔ ''تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں کہ بس گائیں بجائیں گے، پوجا پاٹ میں لگے رہیں گے۔ ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدان جنگ میں آتا ہے۔''

''ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی افغانوں کا کام ہے۔ تم کو پتا لکھتے ہو۔''

وہ جھنجھلا گیا: ''تم عورتوں سے بحث کون کرے۔'' اس نے امرتیل کا ایک پتا اور توڑا۔

''دیکھو'' لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھٹک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی، ''جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔ میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔''

وہم۔۔۔وہ کیا چیز ہے؟''

کمال الدین کے کردار کو گنگا جمنا کی سرزمین میں عربی مولد سے دور یوں بیان کرتی ہیں :

ابوالمنصور کمال الدین، جو پہلی دفعہ بہرائچ آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ کی دیوار سے لگ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور اچنبھے سے عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں سنبھالے سامنے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے آ رہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گوناشدہ اور وکرم شیلا اور اجین اور امراوتی کے عظیم الشان بین الاقوامی دارالعلوم اب اجڑ چکے تھے اور شراوستی کے پرانے آشرم سنسان پڑے تھے اور ان پوتھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب و غریب زبانوں میں لکھے گئے تھے اور عجیب و غریب باتیں ان میں لکھی تھیں، ناقابل فہم فلسفے اور عقل سے بالاتر الٰہیات۔

سرل کے کردار کے متعلق کچھ ایسے تصویر کشی کرتی ہیں کہ :

جب سرل ایشلے نے کوئنز کالج کیمبرج سے بی۔اے کیا اس وقت اس کی عمر صرف بیس سال کی تھی، اس کا باپ ایک بہت مفلوک الحال پادری تھا اور سرل بڑی مشکلوں سے اپنے قصبے کے زمیندار کی مدد حاصل کر کے کیمبرج تک پہنچ پایا تھا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن آ کر اس نے مڈل ٹمپل میں داخلہ لیا۔ یہاں پڑوس میں فلیٹ اسٹریٹ تھی جس کے قہوہ خانوں میں لکھنے والے اور اخبار نویس جمع ہو کر دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتے۔ اکثر سرل بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا یہیں ایک روز ایک شراب خانے میں سرل کی ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دنوں وطن آیا ہوا تھا، وہ اسے موٹی آواز میں تفصیل سے بتاتا رہا کہ بنگال میں اسے نیل کی کاشت میں کتنے ہزار پاؤنڈ کا نفع ہوا۔ نیٹو کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں۔ ان کے امراء کتنے دولت مند ہیں۔ کلکتہ کس قدر دلچسپ شہر ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہندوستان چلو۔ تم سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو، اگر عقل سے کام لیا تو چار روز

<u>پھر اس دور کے انگریزوں کو ہندوستانیوں پر یوں تبصرہ کرتا دکھاتی ہیں :</u>

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف لیلوی داستانیں سنانا شروع کیں، پھر میسور والوں کا اور ارکاٹ کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دو سو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی بربریت۔ ایک سرخ زبان والی مورتی کو پوجتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں۔ ننگے پیر گھومتے ہیں۔ گائے اور بندر اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھ اسے بتایا وہ خاصا پریشان کن تھا مگر بہر حال حقائق سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حقائق تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیٹو بلحاظ نسل کمتر تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ ''نیٹو چونکہ نسلاً گھٹیا ہیں۔ لہٰذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور فارسی اور ڈھاکا۔ مردہ زبانیں جن میں جادو ٹونے کے نسخے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔'' پیٹر نے بات ختم کی۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتے کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی اسٹائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پالکی بردار ہر وقت سرخ وردی میں ملبوس رہتے۔ سونٹا بردار چاندی کے موٹھ کی چھڑیاں لے کر چلتے۔ رات کو مشعلچی اس کی فینس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانساماں اور خدمت گار اس کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگراں تھے۔ حقہ بردار اس کا حقہ تازہ بھرتا تھا۔ دفتر میں اس کا کلرک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف، بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان گنت ہرکارے اور پیادے اور چپراسی۔ ایک تن تنہا سرل ایشلے اور اس کے ذاتی عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گراس کٹ اور سائیس اور چابک سوار اور بہشتی دربان، چوکیدار، پھر اس کا بجرہ تھا جس کے مانجھی اس کے ملازم تھے۔ درزی، دھوبی اور نائی ان سب سے علیحدہ۔ اس سلطنت کا، جو اس کی سفید رنگ کی کوٹھی میں قائم تھی، سرل ایشلے بلاشرکت غیرے مالک و مختار تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا اور ایسا اس نے اکثر کیا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشق سخن کرتا پھرتا تھا اور کسی پب میں جا کر چند پنس کے آلو کھاتا تھا، جو مڈل ٹمپل کے پھاٹک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنتا سنسان سڑکوں پہ ٹہلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم ساتھی کے یہاں جا کر سو رہتا تھا۔

<u>ذیل میں تقسی سے قبل کے لکھنو کے ضمن میں وہ بھیا صاحب کا کردار پیش کرتی ہیں</u>

<u>یہ بھیا صاحب ہیں جن پر ہمیں عینی آپا کے محبوب کا شک ہوتا ہے ،اب وہ خود کو رویا کے روپ میں ظاہر کرتی ہیں یا پھر آپا جی کہ یہ وہ خود جانتی ہیں مگر رویا یا چمپا کا کردار انکے اصول و انا پر منطبق بیٹھتا ہے:</u>

بھیا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی بن جائیں گے تب اپی کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ میں بچپن سے بھیا صاحب پر عاشق تھا، وہ میرے ہیرو تھے میرے لیے گیری کوپر اور اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لئے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی نائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتا جی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آ کر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا، پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو، ان کے کمرے

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کلیان پور میں، جو گھاگھرا کے کنارے آباد تھا، تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آ کر رہا کرتے تھے، بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اس بنگلے میں جا کر رہے۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہلاتا تھا اور اس کے برآمدے میں بیٹھ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہلائیں گے۔

اب چمپا کلی جو ماضی کی ہندو تھی حال میں مسلم گھرانے کی چشم و چراغ بن کر نمودار ہوتی ہے کی طرف اشارہ کرتی ہیں :

چمپا احمد نے بیسنٹ کالج کے کلاس روم کے دریچے میں آ کر نیچے نظر ڈالی۔ لو چل رہی تھی۔ دور سڑک پر ایک بگولا اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ سارے میں املتاس کے زرد پتے تیرتے پھر رہے تھے۔ نیچے کالج کا وسیع' بے رونق میدان گرمی کی سہ پہر میں پڑا تپتا تھا۔ جانے بارش کب ہوگی' چمپا نے سوچا۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے لڑکیوں کی ایک ٹولی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ کلاس روم کے ڈائس کے اوپر سے مسز اینی بیسنٹ کی بڑی روغنی تصویر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ بھی چمپا کو بہت اداس معلوم ہوئی۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برابر کے کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ لیلا بھارگوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا۔ قریب کے ایک برآمدے میں ہائی سکول کے امتحان کا کوئی پرچہ کیا جا رہا تھا۔ چھتری سنبھال کر وہ اور لیلا سڑک پر نکل آئی۔ ابھی انہیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا۔ تانگے پر بیٹھ کر وہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا۔ بسنت کالج' یونیورسٹی' گھر

جس سال چمپا کیمبرج پہنچی طلعت اور نرملا وہاں سے جا چکی تھیں۔ (میں ہمیشہ ٹمبرسٹ جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ مگر اب کے ویک اینڈ پر ضرور ٹمبرسٹ چلیں گے' بے چاری نرملا کو دیکھنے) اب وہ اونچے طبقے کی برطانوی لڑکیوں کے لہجے میں گفتگو کرتی۔ کیمبرج کی بددماغی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی۔ کچھ طور طریقے اس نے ادیبوں کے گروہ میں رہ کر لندن میں سیکھ لیے تھے۔ اس کے علاوہ رکھ رکھاؤ' سلیقہ' نفاست' بردباری' ایک خاص سطح کا دھیما دھیما مزاج۔ رات کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دفعتاً سوچتی: چمپا احمد کہاں رہ گئی! چمپا احمد جو ایک دیو مالا' ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ بسنت کالج بنارس والی لڑکی کہاں گئی' یاد ہے لڑکی

جس کو عامر رضا نے گلفشاں کے سائیڈ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضحکہ خیز لگتا۔ وہ فلم اسٹاروں کے حلیے والا ڈیلو میٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوٹ پہن کر اور

مذکورہ بالا حوالہ بیان کرتا ہے کے اب سارے کردار لنڈن میں پڑھائی و فکر کے جھمیلوں میں سر پھنسالیتے ہیں ۔یہیں پر میرے تعارف کا اختتام ہوتا ہے۔

۷۰

جس سال چمپا کیمبرج پہنچی طلعت اور نرملا وہاں سے جا چکی تھیں۔ (میں ہمیشہ ٹڈ ہرسٹ جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ سرل' اب کے ویک اینڈ پر ضرور ٹڈ ہرسٹ چلیں گے' بے چاری نرملا کو دیکھئے) اب وہ اونچے طبقے کی برطانوی لڑکیوں کے لہجے میں گفتگو کرتی۔ کیمبرج کی بد دماغی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی۔ کچھ طور طریقے اس نے ادیبوں کے گروہ میں رہ کر لندن میں سیکھ لیے تھے۔ س کے علاوہ رکھ رکھاؤ' سلیقہ' نفاست' بردباری' ایک خاص سطح کا دھیما دھیما مزاج۔ رات کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دفعتاً سوچی: چمپا احمد کہاں رہ گئی! چمپا احمد جو ایک دیو مالا' ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ بسنت کالج بنارس والی لڑکی کہاں گئی' یا وہ لڑکی

جس کو عامر رضا نے گلفشاں کے سائیڈ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضحکہ خیز لگتا۔ وہ فلم اسٹاروں کے حلیے والا ڈپلو میٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوٹ پہن کر اور کون سی لڑکی کو لے کر تھیٹر دیکھنے جائے۔

پھر ایک روز کیمبرج میں فلسفی لڑکی روشن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ

لائبریری کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے ایک پلپا پر بیٹھی مائیکل سے باتیں کر رہی تھی جو سائیکل پر سوار ایک پاؤں پلپا سے ٹکائے یہودیوں کی جلاوطنی کی نفسیات پر روشنی ڈالنے میں مصروف تھا۔ دفعتاً اس نے نرہ لگایا ـــــ روش ـــــ مگر روشن سوچ میں ڈوبی سامنے سے نکل گئی۔ چمپا احمد نے کندھے اچکائے۔

ہاں ڈون اسپنوزا۔۔ مائیکل نے کہا۔ دوسرے روز روشن سیاہ فریم کی پڑھنے والی عینک لگائے بڑے غور و خوض میں ڈوب کر سگریٹ پیتی کیم کے کنارے بیٹھی نظر آئی۔ چمپا کو وہ بہت اچھی لگی۔ اب چمپا اپنی دانست میں اس اسٹیج پر پہنچ چکی تھی جب انسان خود غیر متعلق ہو کر دوسروں کا مطالعہ کرتا ہے اور فراخ دلی سے دوسروں کو معاف کرتا رہتا ہے۔

روشن نے چمپا کو بڑے شک وشبہے کی نظروں سے دیکھا۔ کسی لڑکی نے اسے بتایا کہ یہ چمپا احمد عامر کی اولڈ فیم ہے۔ چمپا اگر یہ لفظ سن لیتی تو سوچ کر ہی اسے بڑی دہشت ہوتی۔ وہ بے حد تو بہ تلا کرتی اور کہنے والے کو صلواتین سناتی کیونکہ اس قدر جدید بن جانے کے باوجود تھوڑا سا کھرچنے کے بعد وہ وہی خالص یو۔پی کی باعزت مڈل کلاس لڑکی تھی جس کے تصورات اس قسم کی باتوں کے سلسلے میں بڑے قدامت پسندانہ ہوتے ہیں اور بہر حال وہ خود کو کسی کا اولڈ فیم کہلانا پسند نہ کر سکتی تھی۔

اس نے اس کے باوجود ایک گھنٹے تک روشن اسپنوزا کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ روشن حکومت پاکستان کے کسی بہت اعلیٰ افسر کی لڑکی تھی اور اسے طرح طرح

کے وظائف ملے تھے اور یہاں بھی بہت قابل اور سنجیدہ مشہور تھی۔ قصہ مختصر وہ ان ہونہار طلبا میں سے تھی جو بیرونی ممالک میں وطن عزیز کے نام میں چار چاند لگاتے ہیں اور پبلسٹی کے رسالوں میں اکثر جن کی تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔

ایک چھٹی کے روز وہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ایک دیہاتی چاء خانے کے باغ میں بیٹھی تھی۔ ایک اطالوی طالب علم انجلو سیب کے نیچے گٹار بجا رہا تھا۔ قریب کی آرام کرسی پر مائیکل نیم دراز بڑی اداسی سیب کی کلیاں سونگھنے میں مصروف تھا۔ اس روز اس نے اناؤنس کیا تھا کہ وہ ترک وطن کر کے اسرائیل جا رہا ہے۔ وہ کئی گھنٹے سے وطنیت کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے تھک کر اب خاموش بیٹھے چاء کا انتظار کر رہے تھے۔ میں یہ پیارا' ہرا بھرا خوبصورت انگلستان چھوڑ دوں گا اور اسرائیل کے ریگ زاروں میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بناؤں گا۔ اس نے کہا۔ سرل اسے دیکھا کیا۔ ہاں' مائیکل' تم ضرور ایسا کرو گے۔ مجھے معلوم ہے۔ اس نے کہا۔ یونیورسٹی کے کئی پروفیسر' سائنس دان' موسیقار اس وقت اسرائیل میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بنا رہے تھے۔

''وژن میں بڑی طاقت ہے۔'' ڈینس نے کہا۔ ''ذرا شاعروں کی شاعری دیکھو۔''

''طاقت تباہ کن ہوتی ہے۔'' سرل نے منہ لٹکا کر کہا۔ سامنے چاء خانے کے پھاٹک پر ایک کار آن کر رکی۔ گوتم نیلمبر' کمال اور طلعت اور چند اور لوگ اتر کر چاء خانے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اور چپر ڈ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہیں دیکھا۔

گوتم نیلمبر بھی بڑی تباہ کن طاقت ہے کیونکہ اس کا وژن سب سے زبردست

ہے۔نہرو کا ہندوستان۔انجلو نے کہا۔

''جدید تصورات میں شاونزم خطرناک ترین تصور ہے۔''سرل نے مائیکل سے کہا۔''تمہاری صیہونیت' پاکستانیوں کا اسلام' ہندوستانیوں کی گپتا عہد کی تجدید ۔''

''گوتم شاونسٹ نہیں ہے۔''سریکھا بولی۔''وہ صرف امن کا خواہاں ہے جس میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی ہو سکے۔ہم مذہب ہو سکے۔ہم مذہب کی لائنز پر نہیں سوچتے۔ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اور وہ لوگ' جن کے خیالات کی اہمیت ہے' پہلے پانچ سالہ منصوبے کی کامیابی کے درپے ہیں۔ہند کا کسان اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے۔زمینداری کے خاتمے کے بعد سے' آکر دیکھو' اس کی حالات کتنی سدھرتی جارہی ہے____ہمارا______''

''تم تو انڈیا ہاؤس کے کسی پمفلٹ کی زبان میں گفتگو کر رہی ہو۔''سرل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔

''اقتصادی ترقی سے مذہب کا کیا تعلق یہ بات پاکستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتی ''،گلشن نے کہا۔

''امریکہ اسلام کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔آج کل ترکی میں قرآن شریف کے نسخے چھاپ چھاپ کر تقسیم کر رہا ہے۔جس طرح نپولین اور مسولینی اسلام کے بڑے زبردست خیر خواہ تھے۔''ڈینس نے کہا۔

''پاکستان کا اسلام______''مائیکل نے کہا۔

''تم تو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہو۔''روشن نے مائیکل سے کہا۔

''نفرت کی نفسیات ______ ''ڈینس نے کہنا شروع کیا'' ''آج کی دنیا نفرت کے تانے بانے پر زندہ ہے۔جیرس نے بالکل غلط کہا تھا کہ دنیا محبت پر قائم ہے۔اصلیت یہ ہے کہ ہم سب درندوں کی طرح ایک دوسرے کو کھارہے ہیں۔''

''میں درندہ ہوں؟'' مائیکل نے اداسی سے پوچھا۔''میں صرف حیفہ جا کر سڑکیں کوٹنی چاہتا ہوں۔''

''تم سب کو کواکرز سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔گاندھی کا مطالعہ کرو'' ڈینس نے کہا۔

''ذرا گوتم کو بلا کر پوچھو جو ہر وقت پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔'' روشن نے جذبے سے کہا۔

''اور پاکستان اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔'' سریکھا نے جواب دیا۔

''اگر صرف ایک روز کے لیے ساری دنیا میں پروپیگنڈے کی مشینری رک جائے تو کتنا سکون ملے۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا۔

''یہ کس طرح ممکن ہے۔ہم سب کو تو صبح شام گوئبلز کی تصویر پر پھول چڑھانے چاہئیں۔تم گاندھی کی بات کرتے ہو'ہمارے عہد کا سب سے بڑا پیغمبر گوئبلز تھا۔ڈاکٹر گوئبلز زندہ باد'' گلشن نے کہا۔

''دراصل'' ڈینس نے بات شروع کیا'' ہم سب غیر شعوری طور پر فاشٹ ہیں۔ہم سب تباہی اور موت کے خواہاں ہیں۔میں رومان پرستوں کی 'موت کی خواہش' کے معنی خوب سمجھتا ہوں۔''

''میں تو نہیں چاہتی کہ یہ خوبصورت اور چرڈ تباہ کر دیا جائے۔'' چمپا نے

دہشت کے ساتھ کہا۔

''ہم سب چھپے ہوئے فاشٹ ہیں۔ہم سب کے ہاتھ میں غیر مرئی مشین گنیں ہیں جن کا رخ ہم نے دوسروں کی سمت کر رکھا ہے۔خیالات کی مشین گنیں ۔صرف بوڑھی عورتیں امن چاہتی ہیں لیکن دنیا کو بوڑھی عورتوں کی ضرورت نہیں۔ ''اس نے چمپا کو دیکھا۔وہ اسے ایک بوڑھی رنجیدہ ماں کی طرح نظر آئی۔

''مجھے ہمیشہ تباہ کیا گیا'' مائیکل نے سر اٹھا کر کہا۔''لیکن میں نے اپنے عزیزوں کی لاشوں کے انبار میں بیٹھ کر تمہارے لیے موسیقی کمپوز کی اور خیالات کی قندیلیں روشن کیں۔میں درندہ ہوں؟ میں صرف ________''

''سڑکیں کوٹنی چاہتے ہو________'' ڈینس نے بات کاٹی۔''ہم تم کو اس کی اجازت دیتے ہیں مائیکل۔تم اپنے وژن کے راستے پر چلو۔''

''دوسروں کے وژن میں مخل ہو کر اس کو برباد کرنے کی خواہش سب سے بڑا گناہ ہے۔دس احکام میں اس گناہ کا کہیں ذکر نہ تھا۔'' سرل نے کہا۔''میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔''

انجلو نے گٹار ایک طرف رکھ دیا۔ مائیکل تم یہودی ہو لیکن تم انگریزی بھی ہو۔تم نے اپنے بمبار طیارے پر آکر میرے خوبصورت شہروں کو برباد کیا تھا لیکن میں تم کو معاف کرتا ہوں۔

''مائیکل'' سریکھا نے کہا'' تم یہودی ہو لیکن تم انگریز بھی ہو لہٰذا خود کو ہم سے برتر سمجھتے رہے۔اب تم بڑے ذوق وشوق سے ایشیائی بننے جا رہے ہو کیونکہ تمہارا خیال ہے کہ تمہاری جڑیں فلسطین میں ہیں۔حالانکہ تمہاری جڑیں دراصل ہمپسٹیڈ

میں ہیں۔ لیکن ہم تم کو معاف کرتے ہیں۔ روشن! مائیکل ایشیائی بننے جارہا ہے' اسے خوش آمدید کہو۔''

''میں اسے خوش آمدید نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں مسلمان ہوں لہٰذا مجھے اسے قابل نفرت سمجھنا چاہیے۔ یہ سب زبردست گھپلا ہے۔''اس نے میز پر پانا سر ٹکا دیا اور پیالیوں کے نقش ونگار کو دیکھنے لگی۔

''تمہیں سریکھا سے نفرت کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہندو ہے۔''

''ہاں۔''

''لہٰذا روشن مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔''مائیکل نے سنجیدگی سے ہاتھ بڑھایا۔ ''ہندوؤں نے تم کو ہندوستان سے نکالا۔''

''میں نے نہیں نکالا' یہ خود نکلی۔''سریکھا نے احتجاج کیا۔

مائیکل سنی ان سنی کر کے کہتا رہا:''تمہاری طرح ہم نے بھی ایک نیشنل ہوم لینڈ بنالیا تو ہم کیوں قابل گردن زنی ہو گئے؟''

''تم ______ تم نے عربوں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ سینکڑوں سال سے رہتے آئے تھے۔''

''تم نے بھی ہندوؤں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے آئے تھے۔''

پھر بڑی غمگین خاموشی چھا گئی۔ درختوں کے جھنڈ میں تیتریاں اڑ رہی تھیں۔ سامنے ندی پر سے ایک کشتی گزر گئی۔ اینجلو نے پھر گٹار کا بجانا شروع کر دیا۔

۱۷

گوتم نیلمبر اور اس کے ساتھی کار سے اتر کر چاء خانے کے اندر چلے گئے۔ لاؤنج میں بیٹھ کر انہوں نے لسٹ کی ورق گردانی کی اور چاء منگوائی اور گوتم نے چند خط ویٹرس کو پوسٹ کرنے کے لیے دیے۔ وہ لندن سے آرہے تھے اور مڈ ہرسٹ جارہے تھے۔ ان کے ساتھ بل تھا اور خوبصورت برنارڈ جو اسکول آف اکنامکس میں استاد تھا اور شانتا' طاعت اور نرگیش۔ وہ لوگ بھی کوئی آفاقی مسئلہ حل کرنے میں مصروف تھے۔ کمال نے دریچے سے باہر جھانکا جہاں سے باغ کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھلان پر ندی بہہ رہی تھی۔ بید مجنوں اور پرم روز کے پتوں میں سے ایک سفید لانچ نظر آرہا تھا جس پر اس کا نام ''کلاراجین'' لکھا تھا۔ امن امن۔ کمال نے دہرایا۔ گوتم نے اسے دیکھا۔

''باہر چمپا باجی اور سرل وغیرہ بیٹھے ہیں۔'' طلعت نے دریچے میں آکر کہا۔

نرملا کے لیے میں اینگلس ولسن کی کتاب ولسن کی کتاب لانا بھول گیا'' بل نے کہا۔ شانتا پیالیوں میں چاء انڈیل رہی تھی۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ لوگ نرملا کو دیکھنے جارہے تھے اسے اب سینی ٹوریم میں تیسرا سال تھا۔ اس کے ایک پھیپھڑے کا آپریشن ہو چکا تھا اور اس کے معالج سر رونلڈ گرے کا خیال تھا کہ ممکن ہے اب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے ہفتے کے روز اس کے دوست لندن سے اسے دیکھنے کے لیے آتے گوتم بھی برابر' جب اسے فرصت ملتی' کملاال اور طلعت کے ساتھ اسے دیکھنے کے لیے جاتا اور پابندی

سے اسے رسالے اور کتابیں بھیجتا۔ اس کے آپریشن کے موقعے پر ہری شنکر بھی واشنگٹن سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ گوتم بڑی لگن سے نرملا کا خیال کرتا اکثر جب کمال ہفتے کے روز مڈ ہرسٹ نہ پہنچ سکتا تو گوتم کو تار دے دیتا۔ گوتم سب کام چھوڑ کر وہاں چلا جاتا۔ وہ اور نرملا چمپا کا ذکر کبھی نہ کرتے۔ زندگی اس قدر گنجلک' اتنی مصروف' اتنی بے ربط اور غیر منطقی تھی کہ انسان سارے شناساؤں اور جاننے والوں کے ساتھ نباہ نہ کر سکتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔

گوتم اب بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کی فارن پالیسی' اس کے اقتصادی مسائل اور ملکی سیاست پر دو کتابیں لکھی تھیں جن کی دھوم مچ گئی تھی۔ وہ اب بہت بڑا سے لے بریٹی تھا۔ کامیاب اور ہر دلعزیز ________ متوازن اور سلجھے ہوئے خیالات کا مالک۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ جذباتی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ "۴۷ء میں ہم نے کیا کیا۔ ہم بیمار لوگ تھے۔ اب ہم اپنے ذہنی عارضوں کا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہم کو اتنی مہلت دے دو کہ ہم تندرست ہو جائیں۔ پھر ہم سے مذہب اور روحانیت اور گیتا کی گفتگو کرنا۔ مجھے بھی گیتا بہت پسند ہے لیکن مجھے فی الحال پانچ سالہ پلان زیادہ پسند ہے۔ اس کی رپورٹوں کی تلاوت سے مجھے نسبتاً زیادہ سکون حاصل ہوتا ہے۔" وہ کہتا

ہے مارکیٹ کے رائٹرز کلب میں بیٹھے ہوئے اکثر کوئی برطانوی جرنلسٹ اس سے سوال کرتا! "گوتم تمہاری کوئی ذاتی زندگی بھی ہے یا نہیں۔ تم تو بالکل کرشنا مینن بنتے جا رہے ہو۔"

"مجھے خطرہ ہے کہ گوتم لیڈر بن جائے گا۔" سرل کہتا۔

"گوتم لیڈر نہیں بنے گا بہت بڑا اسٹیٹس مین بنے گا' وہ ایک بے حد صاحب نظر انسان ہے۔" کمال فخر سے کہتا۔

۴۷ء نے ذہنوں کی دنیا ہلا کر رکھ دی تھی۔ گوتم اور کمال بدلے ہوئے عالمگیر حالات بین الاقوامی سیاسی جرائم اور ریا کاری اور بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے اس عظیم الشان دور جدید سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ گوتم کے سیکولر خیالات کی وجہ سے ہندو شاونسٹ اور مہا سبھائی نظریات کے لوگ اس سے خفا تھے۔ کمال کی قوم پرستی اور صاف گوئی نے اسے کہیں کہ نہ رکھا تھا۔ اس کے بیشتر مسلمان دوست اور رشتے دار پاکستان جا چکے تھے مگر وہ مصر تھا کہ انگلستان سے ہندوستان ہی واپس جائے گا۔ لندن اور کیمبرج کے پاکستانی طلباء اسے انڈیا ہاؤس کے گوتم نیلمبر کا اسٹوج کہتے۔ یہ سب سن کر اس کے دل پر چھریاں چل کر رہ جاتیں۔

نرملا کی بیماری نے' جو اسے طلعت کی طرح عزیز تھی' زندگی کے متعلق کمال کا سارا رویہ بدل دیا تھا۔ اسے دفعتاً احساس ہوا تھا کہ زندگی اور موت میں بال سے زیادہ باریک حد فاصل قائم ہے۔ زندگی ایسی شے نہیں کہ اس سے مذاق کیا جائے۔ انسان بہت عظیم ہے۔ اس کا دل کائنات کی سب سے قابل قدر چیز ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ عیسائی یسوع مسیح کی تصاویر میں ان کے دل کو کیوں اس قدر نمایاں کرتے ہیں' دل کی تصویریں کیوں بناتے ہیں جس میں کانٹے چبھے ہیں۔ ہاں' دوسروں کا دل دکھانا کیوں سب سے بڑا گناہ ہے!

نرملا کی بیماری نے گوتم کی ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ نجی جہنم' جو انسان کی روح ہے' اس میں کیسی کیسی دنیائیں آباد تھیں'

ان میں کون لوگ بستے ہیں؟ آفاق کے اس کے اس کونے میں، جہاں پر ''گوتم نیلمبر'' کو بورڈ لگا ہے، کیسی کیسی آندھیاں چلتی ہیں، اس گھر میں (جس طرح کا گھر ہر نوجوان کے دل میں ہوتا ہے) کون لڑکی بیٹھی ہے۔ ہر نوجون جو صرف ایک بار اس کے گھر کے دروازے وا کر کے صرف ایک لڑکی کی مانگ میں سیندور لگتا ہے۔ مگر اس نوجوان کا اسرار کون جانے جس کا نام گوتم نیلمبر ہے۔ اس کے دل میں دراصل کون ہے، شاید اس کو بھی معلوم نہیں، یا شاید معلوم ہو۔ دوسرے جاننے والے کون!

اور اس بال سے زیادہ باریک پل پر، جسے زندگی کہتے ہیں'' نرملا کھڑی تھی۔ زندگی سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔ دل جو بہت عظیم شے ہے اس سے مذاق نہیں کیا جا سکتا۔

گوپی کا دل جو ساری کائنات کا مرکز ہے۔

''چمپا باجی باغ میں بیٹھی ہیں۔'' طلعت نے دریچے میں جا کر دہرایا۔

''چلو ان سے ملتے چلیں۔ عرصے سے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

گوتم نے گھڑی دیکھی۔ ''نہیں۔ اب سیدھے ٹڈ ہرسٹ چلو۔ ورنہ ہمیں واپسی پر دیر ہو جائے گی۔''

وہ سب چاء خانے کی لاؤنج سے نکل کر کار میں جا بیٹھے اور ٹڈ ہرسٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

۲ے

چمپا نے دیکھا کہ کارزن سے چاء خانے کے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ اینجلو درخت کے نیچے بیٹھا گٹار بجایا کیا۔ روشن، مائیکل، ڈینس، سریکھا اور گلشن میز سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے ندی کی طرف جا چکے تھے۔ چمپا نے آرام کرسی پر سے جھک کر گھاس کی ایک پتی توڑی۔

''کیا سوچ رہی ہو۔'' سرل نے پوچھا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ایک رسالہ چہرے پر رکھے مقابل کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔

''کچھ بھی تو نہیں۔''

''وہ تمہارے دوست لوگ جارہے تھے، کاریں۔''

''ہاں۔''

''میں نے دیکھا ہے کہ تم کراؤڈ سے خود کو مماثل بھی نہیں کرنا چاہتیں مگر کراؤڈ کی چاہت بھی بہت ہے۔ ایک عجیب قسم کی وفاداری۔ اس لیے کہ تمہارا اور ان کا ماضی مشترکہ رہا ہے۔ تم عجب مجموعہ تضاد_______'' سرل نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ ''میں تم کو دیکھتا ہوں تو بہت اداس ہوتا ہوں۔''

''اطالویوں کی طرح باتیں مت کرو۔'' چمپا نے کہا۔

''یہ بھی تمہارے ساتھ ایک اور مصیبت ہے۔ ذاتی سطح تک پہنچتے ہی تم زور سے دروازہ بند کر دیتی ہو_____بزدل_____ تمہیں اپنی بزدلی اور کمزوریوں کا علم ہے؟'' وہ کرسی اتر کر درخت کے تنے سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ ''اکثر جھوٹ بولتی ہو۔ حاسد ہو۔ دوسروں کی مسرت کو رشک سے دیکھتی ہو۔ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتی ہو۔ دوسروں کو خود سے بہتر نہیں

دیکھنا چاہتیں۔" وہ کہتا رہا۔ "مثال کے طور پر ______ تمہیں روشن پسند نہیں کیونکہ وہ یونیورسٹی میں تم سے زیادہ مشہور اور ہر دلعزیز ہے۔ تم لکھنو میں مشہور رہی ہو گی مگر وہ ۱۹۴۲ء تھا اور تم بھولتی ہو کہ اس بات کو دس سال گزر چکے ہیں اور روشن تم سے دس سال چھوٹی ہے چمپا۔ وقت کا سب سے بڑا کمینہ پن یہ ہے کہ ہم ابھی اس چیز کے لیے تیار نہیں ہو پاتے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا زمانہ نکل چکا۔ چمپا! خدا کرے تم شنیلا مکرجی کبھی نہ بنو۔"

"شنیلا مکرجی؟"

"ہاں۔ میں تم کو ایک انسٹی ٹیوشن میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ چمپا احمد' جو آج سے دس سال بعد چیلسی کے ایک فلیٹ میں آرٹسٹوں اور ذہن پرستوں کی سرپرست اور گرو ہو گی۔ خداوند ______ یہ بڑا دہشت ناک خیال ہے۔"

"میں اس قدر قابل رحم ہوں؟"

"نہیں۔ ہم سب قابل رحم ہیں۔ تم ان ساری باتوں کے باوجود بہت پیاری ہو۔ تم نیک دل ہو۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اور شاید تم میں دوسروں کو معاف کرنے کی اہلیت بھی ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں شاید"

وہ خاموش ہو گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر چاء خانے کے لاؤنج میں آ گئے۔ روشن اور مائیکل اور ان کے ساتھ دور لانچ پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر چند ردی کاغذ اور اخبار رکھے ہوئے تھے جو گوتم نیلمبر وہاں بھول گیا تھا۔

''تم دوستی کر سکتی ہو۔'' سرل کہتا رہا۔ ''ورنہ باقی تم سارے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھری ہوئی ہو۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کی طرح۔'' اس نے بے دھیانی سے خالی لفافہ اٹھایا جس پر گوتم کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو توڑ موڑ کر آتشدان میں پھینک دیا۔

''سرل، میں اتنی تیز روشنی میں ہوں، جتنی تم نیا بھی ظاہر کی؟''

''ہم سب اسی تیز روشنی میں موجود ہیں۔'' اس نے صوفے پر سے ایک رسالہ اٹھایا۔ اس پر بھی گوتم کا نام چھپا تھا۔

''تم اسے بہت زیادہ چاہتی ہو نا؟'' اس نے رسالہ چمپا کی طرح پھینک دیا۔ ایک وقت تھا خود گوتم نے اس سے عامر رضا کے متعلق اسی قسم کے امتحانی سوالات کیے تھے۔

''لیکن وہ تم سے ملتا کیوں نہیں؟'' اس نے دوبارہ کہا۔

''پتا نہیں۔ مجھ اس سے ملنے کی فرصت کہاں ہے۔''

''تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔''

وہ ایک اونچی چوٹی پر کھڑی تھی اور ساری دنیا اس کے رتی رتی احوال سے واقف تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس طرح کیوں بکھرنے دیا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ سارا زمانہ نکل چکا______ سارا زمانہ______

باہر بارش میں چند اور موٹریں آکر رکیں۔ چند مشہور شیکسپیئرین اداکار لاؤنج میں داخل ہوئے وہ اپنی تمثیل لے کر کسی تہوار کے لیے برابر کے گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایکٹر سرل کو جانتا تھا۔ وہ سب آتشدان کے قریب

جا بیٹھے۔ دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

۴۳

ڈہرسٹ کا عظیم الشان اور پُر فضا سینی ٹوریم سینکڑوں ایکٹر پر پھیلے ہوئے معطر جنگلوں اور باغوں میں گھرا سکون سے بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے بشاش اور خوبصورت ماحول میں ہر طرف پھول ہی پھول تھے اور مسکراتے ہوئے ہمدرد چہرے۔ شفاف طویل گیلریاں۔ حسین ڈرائنگ رو۔ جھلملاتا ہوا اوڈی ٹوریم جہاں مشہور تھیٹر کمپنیاں آ کر مریضوں کے لیے تمثیلیں اسٹیج کرتیں۔ اس دل آویز جنت میں لوگ آرام سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اپنے خاتمے کا انتظار کرتے یا کسی دوسری طرح کے خاتمے تک کے وقفے کے لیے پھر باہر کی دنیا میں واپس چلے جاتے۔ عمارات کے ایک ونگ میں سرے پر نرملا کا کمرہ تھا جس کے تین طرف باغ تھا۔ یہ میرا کمرہ آئی ٹی نشاط محل ہوٹل کے کسی کمرے کا ایسا ہے نا۔ نرملا نے طلعت سے کہا تھا۔ یہ لوگ ہر شے ماضی سے منسلک کرتی جاتی تھیں۔ (سوئیٹزرلینڈ نینی تال تھا۔ لیک ڈسٹرکٹ دہرہ دون کی طرح تھی لندن میں بمبئی کی جھلک تھی)۔ ماضی محفوظ تھا کیونکہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی کسی حادثے کا امکان نہ تھا۔

نرملا تکیوں کے سہارے نیم دراز خوشی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ ”اب مجھے لندن کی تازہ خبریں سناؤ۔“

''اچھا۔''طاعت اچک کر دریچے میں بیٹھ گئی۔ اس نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

شانتا' کمال اور ربل کے ساتھ نرملا کے پلنگ کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔ گوتم پھولوں کے بڑے واز کے نزدیک کونے میں بیٹھا برنارڈ سے باتیں کر رہا تھا۔

''گوتم جی'' نرملا نے اسے مخاطب کیا'' اب ہندی ساچار ہو جائیں۔'' وہ اٹھ کر اس کے سامنے دریچے میں جا بیٹھا۔

''مجلس میلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔'' نرملا نے طاعت سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''بڑے زوروں میں۔'' طاعت نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے لیے وہ سب خاموش ہو گئے۔ ہر سال نرملا مجلس کے سالانہ میلے کی تیاریوں میں پیش پیش رہا کرتی تھی میلے میں اس کی غیر موجودگی کا یہ تیسرا سال تھا۔

''بس صرف اس اگست میں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔'' کمال نے کہا'' اگلے سال انشاءاللہ تم پھر میلے کی لیڈری کر رہی ہوگی۔''

''انشاءاللہ'' نرملا نے مسکرا کر کہا۔

''کل بھیا صاحب سے ملے تھے۔'' گوتم بولا۔ ''کہتے تھے کہ شاید آج تمہارے پاس آئیں۔''

''وہ تو مجھے کئی بار دیکھنے کے لیے آ چکے ہیں بے چارے۔'' نرملا نے کہا۔'' ان کی لڑکیوں کی صورت حال کیسی چل رہی ہے۔''

''ٹھیک چل رہی ہے۔ روشن آرا ______ ''طاعت نے کہا۔

''پھر اسکینڈل شروع ہوئے۔'' کمال نے ڈانٹا۔

''نہیں۔ میں تو اس کے بعد ابھی پروفیسر ٹوئن بی کا ذکر کرنے والی تھی۔

''طلعت نے ذرا سہم کر کہا۔

''تم نے ان کو میلے میں بلایا ہے۔'' گوتم نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''یہ اچھا ریکٹ ہے۔ برطانیہ کے ان سب جغادری انٹلکچولز کو اپنی محفلوں میں بلا بلا کر دہی بڑے کھلاتی ہو اور اس طرح ہندوستان کے لیے ان کی موافقت حاصل کرتی ہو۔ دہی بڑا ڈپلومیسی۔'' بل نے ہنس کر کہا۔

''دہی بڑا اور بھرت ناٹیم۔ انہی حرکتوں سے پاکستان ہاؤس والے جلتے ہیں۔'' گوتم نے کہا۔

''اب رام گوپال کے مقابلے میں انہوں نے بلبل چوہدری کو کھڑا کیا ہے۔'' برنارڈ بولا۔

''تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کہ بہت بڑا اکھاڑہ ہے اور رام گوپال اور بلبل اس میں کشتی لڑنے کے لیے اتر رہے ہیں۔'' طلعت نے اداسی سے کہا۔

''تمہاری یہ تشبیہ'' گوتم نے کہا ''بالکل صحیح ہے۔ سب سے بڑی ٹریجڈی وہ ہے جب فن کاروں کو غیر فنی اغراض کے لیے استعمال کیا جائے''

''ہم نے میلے میں اسپنڈر کو بھی بلایا ہے۔'' طلعت نے منہ لٹکا کر کہا۔

''یہ بکے ہوئے اور خریدے ہوئے انٹلکچوئر کا دور ہے۔'' گوتم نے کہا۔'' اس عہد میں آرٹسٹ کی بڑی بھاری قیمت مقرر ہو چکی ہے۔ کون کہتا ہے کہ دنیا

آرٹسٹ کی قدر نہیں۔ دیکھو ایشیا کے فن کار لوگ کسی طرح فل برائٹ اور طرح طرح کے وظیفوں پر دھڑا دھڑ امریکہ چلے جا رہے ہیں۔"

"ایشیا کے فن کار لوگ تو دھڑا دھڑ سوویٹ یونین اور چین بھی جا رہے ہیں" بل نے کہا۔ وہ بڑا سخت غیر جانبدار تھا۔

باہر دیودار کے جنگل پر شفق کی روشنی چھا گئی۔ عمارت کے مختلف کمروں سے موسیقی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"اب چلیں۔" گوتم نے کہا۔ "لندن واپس پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی"

"تم سب جا رہے ہو" نرملا نے یک لخت دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ "میں پھر اکیلی رہ جاؤں گی۔"

"تم اکیلی نہیں ہو نرمل" کمال نے اس کے پلنگ پر جھک کر کہا۔ "ہم سب ہر سے تمہارے ساتھ ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اگلے ہفتے تک کے لیے خدا حافظ نرملا" طلعت نے اس سے کہا۔

"نرمل، شاید میں اگلے ہفتے نہ آسکوں۔ پنڈت جی کسی کانفرنس کے لیے دلی سے آ رہے ہیں۔ بڑی سخت مصروفیت رہے گی۔" گوتم نے نرمی سے کہا۔

"ہاں گوتم، تم میرے کارن اپنے کام میں حرج نہ کیا کرو۔" نرملا نے رسان سے جواب دیا۔

وہ سب گیلریاں عبور کر کے باہر آ گئے۔ دور ونگ کے روشن دریچے میں سے

نرملا ان کو دیواروں کے اندھیرے میں اوجھل ہوتا ہوا دیکھتی رہی۔

۴ے

طلعت کا فلیٹ سینٹ جانز ووڈ میں تھا۔ اس کے نزدیک ہی شانتا اور بل رہتے تھے۔ آس پاس اور بہت سے مشہور مصنفوں اور اداکاروں کے مکان تھے۔ بہار کا موسم آتا تو ان مکانوں کے پائیں باغ پھولوں سے بھر جاتے۔ شفاف سڑک پر سے سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر زسکون سے گزرتی رہتیں۔ چوراہے کی گروسر اور تمباکو فروش کی دکانوں میں خریداروں اور دکانداروں کے درمیان نپی تلی گفتگو جاری رہتی۔ آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا اطالوی ریسٹوران تھا۔ اس میں ایک داڑھی والا پولش یہودی آرٹسٹ اپنے کونے میں بیٹھا اسکیچ بناتا نظر آتا۔ وہ ہمیشہ متوقع رہتا کہ کوئی اس سے اس کے اسکیچ خرید لے گا۔ کوئی اس سے اس کی تصاویر نہ خریدتا۔

سینٹ جانز ووڈ کے ان خوبصورت مکانوں میں رہنے والوں کی ذہنی زندگیاں بڑی طوفانی تھیں۔ محبتوں، طلاقوں، نفسیاتی الجھنوں، کشمکشوں اور سیاہ قہوے پر یہ لوگ اپنی زندگیاں بتاتے تھے۔ ان کے نشست کے کمرے انتہائی آرٹی انداز میں سجے تھے۔ لڑکیاں بالوں کی پونی ٹیل بناتی تھیں اور سیاہ رنگ کی تنگ موری والی پتلونیں پہنتی تھیں۔ اپنے والدین سے نفرت کرتی تھیں۔ اور اپنی سائیکو انالسس کرواتی تھیں۔ اکثر مرد اداکار اور ادیب 'ہومو' تھے۔ یہ کامیاب اور دولت مند

فنکاروں کا محلّہ تھا۔ یہ لوگ قدیم ایشیائی تہذیبوں، بازنطیم، رومن کیتھولک چرچ اور گپتا عہد کے آرٹ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ برطانیہ کی ذہنی ارسٹوکریسی تھی۔

چندر فرلانگ پر سریکھا کا مکان تھا۔ اس کا شوہر گلشن آہوجہ اسکول آف اکنامکس میں تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی لاہور کے شرنارتھی تھے اور دلی سے یہاں تعلیم کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سریکھا رقاصہ کی حیثیت سے بہتر شہرت حاصل کر چکی تھی اور رائل اکیڈیمی آف آرٹ میں کریوگرفی سیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب میاں بی بی چوپڑہ رہتے تھے۔ اشا سنگتراش تھی۔ ستیش چوپڑہ بی بی سی کے ہندی سیکشن میں تھا۔ بدھ کے روز ان کے یہاں ہندی کے حلقہ ارباب ذوق کا اجتماع ہوتا۔ چیلسی کی ایک عالیشان موڈرن بلاک میں کملا کا الٹرا ماڈرن فلیٹ تھا۔ کملا طاعت اور نرملا کی بچپن کی ساتھی تھی۔ قیامت کی ذہین اور بڑی زبردست انٹلکچول تھی اور بے حد خوش شکل لڑکی تھی کلاسیکل رقص کی ماہر، وہ فارن سروس میں تھی۔ نرگیش بمبئی کے کسی کروڑ پتی کی لڑکی تھی۔ کیمبرج کی تعلیم یافتہ۔ دوسری پارسی لڑکیوں کی طرح مغربی لباس پہنتی۔ وہ بھی کہیں ملازم تھی اور کسی انگریز سے شادی کرنے والی تھی۔ کملا کی بڑی بہن شکنتلا کا مکان نائیٹس برج میں تھا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک اور بہت اونچے پائے کی انٹلکچول تھی اور بے حد دلکش اور پیاری لڑکی تھی۔ اس کے شوہر انڈیا ہاؤس میں پبلک ریلشنز آفیسر تھے۔ فیروز جبیں یونیورسٹی میں اردو میں ریسرچ کر رہی تھی اور ریجنٹ پارک میں رہتی تھی۔ زرینہ بھی یونیورسٹی میں تھی اور اوسٹرلی میں اپنے والدہ اور بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والد دلی میں تھے۔ ان سب کی بڑی مصروف زندگیاں تھیں۔ یہ سب اپنے

اپنے مقاصد کی تکمیل میں جٹے تھے۔صرف نرملا سریواستوا اس ہنگامے سے الگ مدہرسٹ میں پلنگ پر پڑی تھی۔اس کا خیال کر کے طاعت کا دل ڈوب جاتا۔اس کو مسرت اب کس طرح حاصل ہو گی؟ نرملا' جس کو اور سب کی طرح زندگی سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔خوشی بے حد عظیم چیز یں ہے لیکن بے حد اضافی۔

طاعت دوسروں کی خوشی سے خوش ہوتی تھی۔سریکھا کے ڈانس کے بعد کئی مرتبہ آنکور' ہوتا یا گوتم کی کتاب کا نیا ایڈیشن نکلتا یا کملا کی کسی اخبار میں تعریف چھپتی تو اس روز طاعت کی عید ہو جاتی وہ دوسروں کے غم سے غمگین ہوتی تھی۔وہ چمپا کا خیال کر کے بھی کافی ملول ہوتی۔اکثر وہ انگریزی میں ایک زبردست ناول لکھنے کا وقتاً فوقتاً اعلان کرتی رہتی مگر کاہلی اور مختلف مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ کبھی شرمندہ تکمیل نہ ہو پاتا۔دن بھر اور اکثر راتے گئے اخبار کی رپورٹنگ کے سلسلے میں دوڑنا دھوپنا پڑتا اور اس میں طرح طرح کے ایڈونچر ہوتے۔اسے عموماً سے لے بر ٹیز کے انٹرویو کے لیے بھیجا جاتا جو قریب سے دیکھنے کے بعد پتا چلتا کہ بے حد معمولی انسان تھے۔غیر معمولی انسانوں سے بے حد معمولی حالات میں ملاقات ہوتی۔

طالب علموں نے طرح طرح کی مصروفیات بنا رکھی تھی۔ایک ایشین فلم سوسائٹی قائم کی گئی تھی جس میں ایک سے ایک بوگس ہندوستانی فلم دکھائے جاتے۔انڈیا کلب میں نیٹو آرٹسٹوں کی نمائشیں ہوتیں۔فیروز کے گھر کے پاس ہمراز بھائی رہتے تھے۔ان کا مکان علی گڑھ کا ایکسٹنشن تھا۔یہاں ہر وقت مشاعرے ہوا کرتے۔

بی بی سی والوں کی ساری زندگی باتیں کرتی گزرتی تھی۔بعض اوقات یہ لوگ سارا سارا دن کنٹین میں بحثیں کرتے بتا دیتے ۔ہر ایک اپنی اپنی ہانکتا۔آل حسن اوراس کی بی بی کرشنا کا مکان بھی ایک اور گپ کا سنٹر تھا۔کرشنا قانون پڑھ رہی تھی۔آل بی بی سی کے ہندوسیکشن میں تھا۔ترونا اور فیروز کے مکانوں پرلڑکوں اور لڑکیوں کا جھمگٹ رہتا۔اس میں زیادہ تر بنگالی شامل تھے۔یہی لوگ لندن مجلس کے روح ورواں تھے۔

طلعت مڈ ہرسٹ سے لوٹ کر اپنے فلیٹ پر پہنچی ۔اسی وقت اوجیت کا فون آیا:''ہلو،سنو۔''وہ دہاڑ رہا تھا۔''دیکھو،یہ ٹیگور ٹیگور کا ہر وقت بنگالی شور مچاتے ہیں ۔اب اقبال ایوننگ ہونا ضروری ہے۔''(اوجیت خود بنگالی تھا۔اسے ایک لفظ اردو کا نہ آتا تھا۔پراگ میں اس نے انجینئرنگ پڑھی تھی۔)طلعت نے رالف رسل کو فون کیا۔یہ علی گڑھ سے اردو پڑھ کر آئے تھے اور یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے۔''اقبال سنگھ سے کہہ دیا ہے؟''انہوں نے پوچھا۔''ہاں''طلعت نے جواب دیا۔''اوراوجیت نے تو انگریزوں کے جگرمرادآبادی کو بھی بلایاہ ہ۔''

انگریزوں کے جگر صاحب انگریزی کے غزل گوشاعر تھے۔جگرمرادآبادی ان پر کچھ ایسا چپک گیا تھا کہ ان کا اصل نام اب کسی کو یاد ہی نہ رہا تھا۔یہ انگریزی کے اچھے خاصے دوسرے درجے کے شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔روحانی طور پر سخت مسلمان تھے اور مشرق کے افلاس مین ان کو خدا کی قدرت اور روحانی برتری نظر آتی تھی۔

اب پھر ریہرسلیں شروع ہوئیں۔۔ڈھاکے کا عطاءالرحمٰن،اقبال کے کلام

کے لیے موسیقی کمپوز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ فیروز اسکرپٹ تیار کرنے میں جٹ گئی۔ تروناؔ، شیلاؔ، پرمودداؔ، اوجیت اور سارے بنگالی اور کشمیری اور گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں نے گانے کے لیے صحیح تلفظ کی پریکٹس شروع کی۔

طاعت اور رمیش سنگوی مڈل ٹمپل کی لائبریری میں اقبال کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مصروف رہے۔

اقبال ایوننگ منعقد ہو چکی تو میلے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

۷۵

لندن مجلس کا سالانہ میلا شروع ہوا۔ ہال کے اوپر کے زینے پر آ کر روشن نے نیچے کا منظر دیکھا۔ لڑکیوں نے دکانیں لگا رکھی تھیں۔ ایک کمرے میں دہی بڑے اور کچوریاں بک رہی ہیں۔ بالکل امین الدولہ پارک کا نظارہ ہے۔ ''ہاکرز'' اپنے اخبار بیچ رہے ہیں۔ کمیونسٹ اپنا لٹریچر فروخت کرنے کے لیے آواز لگا رہے ہیں۔ سوشلسٹوں کا ایک گروہ اپنے پمفلٹ لیے کھڑا ہے۔

بل ایک ستون سے لگا چپ چاپ کھڑا تھا۔ ''ہلو روشن'' اس نے کہا۔

وہ ٹہلتے ہوئے دوسرے ہال میں چلے گئے جہاں مختلف ایشیائی ممالک کے اسٹال تھے۔ تصویروں کی نمائش۔ ایک طرف ڈوکومنٹری فلم دکھائے جا رہے تھے۔

دفعتاً خاموشی چھائی اور وہ سب گاتے ہوئے اسٹیج پر آئے۔ پرمودداؔ حسب معمول آرکیسٹرا کنڈکٹ کر رہے تھے۔

لائی سال چھے پیار بھرے ناواں ______

''کشمیر؟'' ایک انگریز تماشائی نے پوچھا۔

''کشمیر۔ یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔'' روشن نے کہا۔

''یہ لوگ جو گا رہے ہیں کون سے کشمیر سے آئے ہیں؟ مقبوضہ یا آزاد؟'' تماشائی نے سوال کیا۔

پوش مالہ کرناواں چھس

شالیمار گوشن چھس دوراداں ______

''دونوں طرف کا کشمیر ایک دوسرے کے لیے آزاد اور مقبوضہ ہے۔'' گلشن نے کہا۔

بل خاموشی سے پائپ پیتا رہا۔

روشہ روشہ یزاں وچھ پوش کارواں

پوش مالہ کر ______

پھر بنگالی گاتے ہوئے آئے۔

''یہ اتنے جوش و خروش سے گا رہے ہیں۔ کیا یہ دہشت پسندوں کا گروہ ہے؟'' ایک ٹوری اخبار کے نمائندے نے پوچھا۔

''یہ؟ ہاں یہ دونوں بنگالوں کے رہنے والے ہیں۔'' طاعت نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

پون گھنٹہ گزر گیا۔ ٹوری اخبار نویس خفا بیٹھا تھا۔

''تم لوگ ہر وقت سیاسی گفتگو کیوں کرتے ہو؟'' ایک برطانوی ادیب نے

آہستہ سے کہا۔ اب تک وہ بڑی اداسی سے ان منظر کو دیکھتا رہا تھا۔

''ہم لوگ بے حد بدقسمت ہیں اس لیے۔'' طلعت نے ملول آواز میں جواب دیا اور پھر کسی کام سے اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے چلی گئی۔

اب ڈھولک بج رہی تھی۔

''پنجاب؟'' ایک اور اخبار نویس نے پوچھا۔

''ہاں۔ پنجاب بھی وہ دیں۔'' قریب بیٹھے ہوئے سریکھا کے میاں گلشن آہوجہ نے اسے تلخی سے جواب دیا۔ ''اور سوال کرو' میں تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا۔''

____ دھرتی چی آمی ہی لے کر بھا گوان ____ دھرتی۔

شینا اور جادویا۔ سنگاتی گادویا ________ رانو پاکھر ________

یہ مرہٹی گیت تھا۔

پھر گجراتی کورس شروع ہوا:

ہے کھتر تی واڑی وتی ____ جنگل تی جھاڑی وتی

ساگر تھی گرور تھی

سونی ساد آویا ____ او ہمیں سونی ساد آویا

فلیٹ اسٹریٹ کے نمائندے اسٹیج کے قریب فٹ لائٹس کے اندھیرے میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے سامنے کے جگمگاتے منظر کو دیکھا کیے

اسٹیج پر وہ گا رہے تھے۔

ہمیں جگ جگ کیرا کنگال

بھانگی نر کونہ دوار

دتیاڈگ ایک تال

دھرنی پر آویا____ اوہمیں دھرنی پر آویا______

دیکھ دیکھ اورے اندھ

کارسین آویا

کارسین آویا-____

پھر ہال کے وسط میں وہ سب گھیرا بنا کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے انٹرنیشنل شروع کیا۔

ہر جگہ جوانیاں ہیں گا رہی

ہنسی خوشی منا رہی

اور لا رہی وشومترتا________

دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش مہان لیے

خطرہ ہو بلیدان کا_____ پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین

سکھ چین______ سکھ چین_____

ان کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ روشن باہر آ گئی۔ یہ سب کیا بکواس ہے۔ ہجوم میں سے نکل کر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے سوچا۔ یہ درست ہے کہ اس طرح کے گیتوں سے خون میں ایک لمحے کے لیے جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس قدر ہلڑ کیوں مچا رہے ہیں کیونکہ سب فنا ہے اور انسان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ انسان کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا

کر رہا ہے۔

''مس کاظمی'' کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ یہ تروتا تھی۔ پھر لڑکیوں کے ایک ریلے نے اسے آلیا جن سے بچ کر وہ اب باہر نکلی تھی۔

''روشن فیروز نے کہا'' ''نذرل دادا آگئے ہیں۔ اس وقت ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ کل صبح سے ہم ان کے لیے چندہ جمع کرنے نکلیں گے۔ تم کو لینے کے لیے آٹھ بجے پہنچ جائیں گے۔ سمجھیں' تیار رہنا؟''

طلعت اس کے نزدیک آئی۔ ''یہ کنجی لیتی جاؤ' میں شاید دیر سے آؤں۔ یا شاید سریکھا کے یہاں رہ جاؤں۔ صبح کو ضرور چلنا ساتھ۔ گڈ نائٹ۔''

وہ سب دوسری سڑک پر مڑ گئیں۔ وہ حسب معمول مصروف معلوم ہوتی تھیں۔ مصروفیت' تکمیل مقاصد کا ہنگامہ۔ ہجوم ندی کے پانی کی مانند چاروں طرف بہا کیا۔ کالج میں چھٹیاں تھیں اور وہ یورپ جاتے ہوئے چند روز کے لیے طلعت کے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ میڈ اویل کے اسٹیشن پر پہنچ کر وہ اوپر آرہی تھی کہ اچانک اسے عامر رضا مل گئے۔ وہ کار میں اسی کی تلاش میں ادھر آرہے تھے۔

''تم کہاں تھیں؟ میں تمہارے سارے ٹھکانوں پر تمہیں ڈھونڈ آیا۔''

''میلے میں۔''

''میلہ؟ وہاں۔ میلہ ٹھیک ہے۔ آؤ۔''

وہ نکڑ کے اطالوی ریسٹوران میں داخل ہوئے۔ یہودی آرٹسٹ انہیں دیکھ کر فوراً اپنے کاغذ پر جھک گیا۔

''روشن'' عامر نے میز پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا' تم بڑی غلطی

کررہی ہو۔تمہارے ابا کوتمہاری رپورٹ پہنچ جائے گی۔

''اوہ''_____وہ ہنس پڑی۔''لیکن عامر ان لوگوں میں بہت سے میرے عزیز دوست ہیں۔ان کے سیاسی خیالات یا ان کی قومیت دوستی کے راستے میں تو حائل نہیں ہوسکتی۔''

''یہ تمہارا نظریہ ہے۔''عامر نے کہا ''لیکن زیادہ پریکٹیکل بنو اور اپنے نفع نقصان کا دھیان رکھو۔تمہاری سرگرمیوں سے تمہارے والد کی ملازمت پر بھی اثر پڑسکتا ہے۔''

''اور شاید میری اور تمہاری دوستی پر بھی۔''روشن نے معادل میں کہا۔''لیکن عامر_____میری کیا سرگرمیاں ہیں؟''اس نے چڑ کر کہا۔اس آدمی کو سمجھانا بیکار تھا۔پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ یہ انسان' جسے وہ اتنے عرصے سے اپنا دیوتا تصور کررہی تھی' ایک مختلف ہستی تھی ایک دوسرے جزیرے پر بیٹھا تھا' اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔مگر وہ تیار ہوگئی کہ اس کے خیالات کی تابعداری کرے گی مرد کی تابعداری عورت کا فرض ہے۔فلسفے یہاں بیکار تھے۔مرد ہر حالت عورت کی مکمل اطاعت کا خواہاں ہے۔یہ کامریڈ وامریڈ سب غلط بات ہے اور یہ عامر رضا بہر حال کامیرڈ نہیں تھا۔اب یک لخت اس کی سمجھ میں آگیا کہ چمپا احمد سے اس کی کیوں نہ نبھ سکی۔چمپا' اپنے خیالات میں' خواہ وہ کتنے ہی گنجلک کیوں نہ رہے ہوں' خودمختار رہنا چاہتی تھی لیکن شاید چمپا بھی مکمل طور پر خودمختار نہ تھی۔کاش وہ چمپا سے پوچھ سکتی کہ وہ اب کس کے خیالات کی اطاعت میں مصروف ہے۔وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔باہر ریسٹوران کے دروازے پر چیتھڑوں میں ملبوس ایک

ہنگرین سازندے نے وائلن پر ''ہسپانوی باغ میں ایک رات'' بجانا شروع کر دیا تھا۔

''اسپین چلو گی؟ عامر نے پوچھا۔

''ہاں''

''جرمنی؟''

''ہاں' جہاں کہو گے چلوں گی۔ اس نے دل میں کہا۔ فلسفے اور آزادی افکار لغو بات ہے۔ اگر اس وقت طاعت یا کملا کو اس کے ان خیالات کا پتا چل جائے تو وہ فوراً سے پھانسی پر لٹکا دیں۔ یہ سوچ کر وہ اداسی سے مسکرائی۔

عامر رضا نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔

دوسرے دن وہ لڑکیوں کے ساتھ قاضی نذرالاسلام کے لیے چندہ جمع کر کے طاعت کے فلیٹ واپس پہنچی تو اس نے ایک اجنبی کو موجود پایا جو اس کے انتظار میں نیچے باغ میں ٹہل رہا تھا۔

''آپ کے خلاف رپورٹ پہنچی ہے کہ آپ کمیونسٹوں کے جلسوں میں شریک ہوتی ہیں''، اجنبی نے کہا۔

''جی؟'' وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''یہ غلط ہے؟''

''بالکل۔ وہ لوگ کمیونسٹ قطعی نہیں ہیں۔''

''آپ کو برابر ایک خاص گروہ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہے''

''مگر یہ تو محض طالب علمانہ ہنگامے ہیں۔ ہر جگہ ہوتے ہیں۔''

''جی!''

''آپ کا مطلب ہے'' وہ وہیں مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی'' کہ میں انسانی رشتوں کو سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دوں؟ ان لوگوں میں سے بہت سے میرے عزیز ترین دوست اور ساتھی ہیں۔''

''انسانی رشتے؟'' اجنبی نے حیرے سے پوچھا۔ ''وہ کیا چیز ہے؟ رشتے صرف سیاسی ہوتے ہیں۔ انسانی رشتے کس چڑیا کا نام ہے۔ اس بے تکلفی کو معاف فرمائیے گا مس کاظمی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فلسوفوں اور آئیڈیلز نے آپ کو کہیں کا نہ رکھا اسی لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ فلسفے اور ادب عالیہ کی تعلیم آج کی دنا میں بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ آپ نے بزنس ایڈمنسٹریشن کیوں نہ پڑھا؟''

روشن غصے سے تلملا رہی تھی لیکن ہنس پڑی۔

''تشریف رکھیے'' اس نے دوسری سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔'' اجنبی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی قابلی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ ________''

''کہ میں غلط راستے پر پڑ گئی؟! میں آپ سے عرض کروں مسٹر ______''

''____ خان ____''

''مسٹر خان کہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں؟''

''نہیں ہیں؟ اس کا ثبوت آپ کے پاس کیا ہے؟''

یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ خیالات جیسی غیر مرئی چیز کے متعلق کس طرح کوئی

ثبوت پیش کیا جا سکتا تھا۔ وہ فلسفے اور خیالات کی طالب علم، اس بے بسی پر بے حد تلملائی۔

اب امریکہ جانا گول سمجھو۔ اس رات پلنگ پر لیٹے ہوئے اس نے سوچا۔ (اسے آئندہ سال ہارورڈ جانے کے لیے فل برائٹ وظیفہ مل چکا تھا) دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد نیند آئی۔ صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ عدالتیں، سزائیں، جیل، بندوق، گولہ بارود، نعرے، رات بھر اس نے اس قسم کے خوفناک خواب دیکھے تھے۔

''آخر جن کو جیل بھیجا جاتا ہے وہ آسمان سے تو نہیں اترتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح ہی کے انسان ہوتے ہیں۔'' ناشتہ تیار کرتے ہوئے اس نے طاعت سے کہا۔

طاعت نے اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

''تم مذاق سمجھ رہی ہو۔'' روشن نے جھنجھلا کر کہا۔

''بالکل نہیں۔'' طاعت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''سوال یہ ہے'' روشن انڈے پھینٹتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی'' کہ ایک طرف روپیہ اور عزت اور شان و شوکت ہے اور سیکیورٹی اور دوسری طرف محض دھندلکا ہے، اور دھندلکے میں خواب نظر آتے ہیں۔''

''ہاں۔ ایک طرف سیکیورٹی ہے، دوسری طرف سیکیورٹی ایکٹ، فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔'' طاعت نے کہا۔

سریکھا نے جلدی جلدی چاء پینے کے بعد گھنگرو باندھ لیے۔ وہ سب نذرالا سلام کے پروگرام کی ریہرسل کے لیے صبح صبح طلعت کے یہاں جمع ہو چکے تھے۔

''روشن'' گوتم نے اسے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھ کر سوال کیا' تمہارا پروبلم کیا ہے؟ وہ حسب معمول پیغمبرانہ شان سے آ کر دیوان پر بیٹھ گیا۔

''ذہنی کشمکش۔'' طلعت نے مختصراً جواب دیا اور توس سینکنے میں مصروف رہی۔

''تو کیا ہوا؟ اپنے وطن واپس جاؤ۔ چند سال بعد وہاں ریوولیوشن آئے گا۔ اس میں تمہاری بڑی ضرورت ہوگی۔'' گوتم نے اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ روشن کو ہنسی آ گئی۔

''لیکن میں ریولیوشن نہیں چاہتی'' اس نے کہا۔

''وہ تو میں جانتا ہوں۔'' گوتم نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں نے صرف یہ کہا تھا کہ جب ریوولیوشن آئے گا تب تم کام کرو گی۔''

''اسے غلط راستے پر مت لگاؤ۔'' طلعت نے کہا۔ ''پہلے ہی اس کی رپورٹ ہو چکی ہے۔ اسی طرح تم نے چمپا باجی کو ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فیل ہو گئے اور دیکھو ان کا کیا ہوا؟''

''کچھ بھی تو نہیں ہوا' یہی افسوس ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا کچھ نہیں ہوتا۔ معلق رہتے ہیں' کہیں نہیں پہنچ پاتے' بہتے رہتے ہیں'' گوتم نے آہستہ آہستہ کہا۔

کیا اس وقت یہ چمپا کو یاد کر رہا ہے۔ طلعت نے سوچا۔

''لیکن روشن تم اس سفارت خانے جا کر کہہ دو کہ تم کو ہم لوگوں سے کوئی

مطلب نہیں۔'' گوتم' روشن کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

''میں غلط بیانی نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی ضمیر پرستی پر اب تک بہت ناز رہا ہے مجھے تم لوگوں سے بہت بڑا مطلب ہے۔تم لوگ میرے دوست ہو۔ میں دوستی کا مطلب سمجھتی ہوں' اس کی قدر و قیمت۔''

''مطالب سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت دکھی ہوگی۔'' گوتم نے دفعتاً بڑی رنجیدہ آواز میں کہا۔ طلعت نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ یہ اس وقت چمپا کو یاد کر رہا ہے' اس نے دل میں دہرایا۔

''اجی انکار کرنے میں کیا رکھا ہے۔'' اس نے گوتم کا دھیان بٹانے کے لیے شگفتگی سے بات شروع کی۔ ''ایک سے ایک لوگ ایک زمانے میں ترقی پسند تھے۔اعلان کر دیا کہ اب ترقی پسند نہیں ہیں اور دیکھو کیا مزے کر رہے ہیں۔'' اس نے روشن کی طرف مڑ کر کہا۔ ''اور تم تو کبھی بھی ترقی پسند نہیں تھیں۔ نہ کل نہ آج______''

''بھیا صاحب نے بھی تو مضامین لکھے تھے؟ فیروز نے سوچ کر کہا۔''

''مگر اب تو وہ بہ بانگ دہل کہتے ہیں کہ تائب ہو چکے ہیں۔'' طلعت نے جواب دیا۔

''بھیا صاحب کو لٹریچر میں بھی دخل تھا؟'' گوتم نے پوچھا۔

''جی ہاں' ایام جہالت میں۔ اب انہیں گیان حاصل ہو چکا ہے۔ ورنہ فارن سروس میں یونہی لے لیے جاتے۔'' طلعت نے کہا۔

''یہ ایام جہالب کب تھے؟'' گوتم نے سوال کیا۔

۳۹ء وغیرہ میں۔ طلعت نے جواب دیا۔ ''ارے تم کو کیا معلوم۔ بہت بڑے انقلابی تھے ایک زمانے میں لکھنو کے اندر۔ چمپا باجی بھی سب کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھیں۔ رشیدہ آپا کے یہاں بیٹھ کر یہ سب آزاد نظمیں لکھتے تھے۔''

''چمپا باجی اتنی پرانی ہیں؟'' روشن نے چونک کر پوچھا۔

''معلوم نہیں ہوتیں'' تروتا نے کہا۔

''سدا بہار ہیں'' فیروز نے جواب دیا۔

''دوستی محبت سے بلند تر شے ہے۔'' گوتم نے آہستہ سے کہا۔ ''بہت سے لوگ یہ بات نہیں سمجھ پاتے۔''

''تم بھی اعلان کر دو جی'' طلعت نے پھر جلدی سے گفتگو کر رخ اصل موضوع کی طرف موڑا'' کہ مجھے ان موئے سرخوں سے کوئی مطلب نہیں۔''

''تم کہہ دو کہ تم سرخا سرخ فرخ آبادی کبھی نہ تھیں' نہ ہو' نہ ہوگی۔'' فیروز نے کہا۔

''دست صبا لائے؟'' کورس ہوا۔

''جی ہاں۔'' انہوں نے کہا۔

سب آگ کے پاس جا بیٹھے اور ''دست صبا'' عقیدت سے ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی۔

''سمجھیں تم؟'' گوتم نے کتاب کے صفحے پلٹے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔ ''بس تم جا کر کہہ دو' آئندہ ہم سب سے قطع تعلق کر لوگی۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ قطع تعلق کرنا دراصل بے حد آسان ہوتا ہے۔''

"تم سٹیون اسپنڈر کی طرح" طاعت نے کہنا شروع کیا۔

"یہ بے بات انگریزی ادیبوں کا ذکر کیے بغیر تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

فیروز بولی۔

"کیا کیا جائے۔ اپنی اپنی کمزوری ہے۔" طاعت نے کہا اور بات جاری رکھی۔ "تم ایک کتاب لکھنا کہ کس طرح تم کو ڈوپ بنانے کی کوشش کی گئی مگر تم صاف بچ گئیں۔"

"تم نے فریڈم کا انتخاب کیا۔" فیروز نے لقمہ دیا۔

"وغیرہ وغیرہ۔" سریکھا نے کہا۔ اب تک وہ کمرے کے سرے پر کھڑی تلانا کی پریکٹس کر رہی تھی۔

"کیا بیوقوفی کی باتیں کر رہی ہو تم لوگ۔" ترونا نے پیانو پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "روشن تم جرمنی جا رہی ہو کل؟"

"ہاں۔"

"تو ہمارے ساتھ ہی چلو۔ ہم لوگ بھی یوتھ فیسٹوں کے لیے کل جا رہے ہیں مشرقی برلین۔"

"مشرقی برلین میں کیسے جا سکتی ہوں؟" روشن نے کہا۔

"کیوں؟" "تم میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے۔ ساری دنیا کے لوگ جا سکتے ہیں، تم نہیں جا سکتیں۔"

"کمال یہ بھئی" فیروز نے سر ہلا کر کہا۔ "ساری رامائن ہو گئی، آہ پوچھتی ہیں سیتا کون تھی؟ ارے یہی تو قصہ ہو رہا ہے۔"

''بکواس''سریکھا نے کہا۔چلو روشن' یہ ایسا تجربہ ہے جو زندگی بھر کبھی حاصل نہ ہوگا۔''

''نہیں''

''ارے' کیا رکھا ہے؟ واپس آ کر سوویٹ یونین اور مشرقی یورپ کے خلاف تین چار مضمون لکھ دینا۔ سب یہی کرتے ہیں۔''

''یہاں اتنی بے ایمانی ہے' اتنی ضمر فروشی ہے۔ روشن بیگم' جس کا تم کو اندازہ نہیں ہوسکتا۔'' گوتم نے کہا۔ ''آج کی دنیا میں تم اپنے ضمیر کو بچائے نہیں رکھ سکتیں۔''

وہ کوٹ پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔

''ہم تم سے برلین میں ملیں گے۔'' روشن نے مسکرا کر کہا۔

''مغربی برلین میں۔'' روشن مسکرا کر کہا۔

''نہیں ہم تم سے مشرقی برلین میں ملیں گے۔''

''یہ تقسیم شدہ دنیا ہے۔ **ملک** 'انسان' نظریے' روحیں' ایمان' ضمیر ______ ہر شے تلواروں کو سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کر دی گئی ہے۔ یہاں ہر طرف سرحدیں ہیں۔ اس تقسیم شدہ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے سرحدوں ہی پر مل سکتے ہیں۔ روشن'' گوتم نے کہا' ''ہم تم سے مشرقی اور مغربی برلین کی سرحد پر ملیں گے۔''

''اگر اس وقت تم کو جیل نہ بھیج دیا گیا۔'' طاعت نے ہنس کر کہا۔

۷۶

بارش ختم ہونے پر چمپا اور سرل دیہاتی چاءخانے سے باہر نکلے۔ لانچ پر بیٹھ کر وہ سب کیمبرج واپس پہنچ گئے۔ راستے میں ندی ہرے بھرے کنجوں میں سے گزری جہاں گھنی شاخوں نے پانی پر چھت سی بنا رکھی تھی۔ یہ ٹرم کا آخری دن تھا۔ کل سے چھٹیاں شروع تھیں۔ چمپا نے سرل پر نظر ڈالی۔ ہر چیز کہی جا چکی تھی۔ اب کہنے کو کیا باقی تھا؟ ہر شے میں گھسا پٹا پن آ گیا تھا' سرل اپنے شیلے میں بھی۔ وہ اسے اتنی اچھی طرح جانتا تھا اور وہ اس سے اتنی اچھی طرح واقف تھی۔ کتنے رنج کی بات تھی۔ اب وہ کن جنگلوں میں جا کر چھپے گی۔ اپ بن اپ بن میں۔ چنچل مورے من میں کین کن پھرے شام وہ ریلنگ پر جھک کر ایک بہت پرانا گیت گنگناتی رہی۔ سریکھا نے ندی کی سطح کو دیکھا جو بہت پرسکون تھی۔ کنارے پر پہنچ کر وہ لندن کی طرف روانہ ہوگئی۔

اسے واپس پہنچ کر مجلس میلے کی تیاری کرنا تھی۔ اس کے بعد وہ برلین جا رہی تھی۔ وہاں سے لوٹ کر اسے ٹی وی پر ناچنا تھا۔ پھر وہ رام گوپال کے ساتھ سارے یورپ کا دورہ کرنے والی تھی' گریٹ سریکھا دیوی ________ انڈیا اینا پاولووا۔ سرل نے تمسخر سے کہا۔ ''خدا حافظ''

''خدا حافظ'' سریکھا نے اپنے خلیق تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ وہ اسے رخصت کرنے کے بعد لکڑی کے بوٹ ہاؤس کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ سرل کے سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ چمپا کو اس قدر مانوس معلوم ہوا گویا کا شوہر تھا۔ اسے

ایک پھریری سی آئی۔ وہ اس کا نہیں کسی اور لڑکی کا شوہر تھا۔ اس لڑکی کو چمپا نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ منظر پر سائے پھر پھیل گئے۔ کشتیاں کنارے سے بندھی کھڑی تھیں اور موسم کی ساری خوشبوئیں اکٹھی ہو کر گلابوں کی چھاؤں میں پانی پر تیر رہی تھیں۔ آسمان پر سے مرغابیاں گزریں۔ گایوں نے آ کر پانی میں اپنا عکس دیکھا اور مطمئن ہو گئیں۔ بوٹ ہاؤس کی بالکنی پر ایک لڑکی آ کھڑی ہوئی۔ بہت سے لوگ پرم روز کی بیلوں کے کنارے کنارے چھتریاں اٹھائے پانی کی اور جا رہے تھے۔

"چمپا ______" سرل نے ایک الٹی ڈونگی پر بیٹھ کر کہا" "مجھے اپنے پس منظر کے متعلق بتاؤ۔" اس نے دیکھا کہ دور دیس سے آئی ہوئی یہ لڑکی اس کے سہارے وہاں بیٹھی تھی۔ وہ بے حد غیر محفوظ تھی۔ اپنے پس منظر میں شاید وہ محفوظ رہ سکے لیکن اس کی اپنی دنیا جانے کون سی تھی۔ دنیائیں برابر بدلتی رہتی ہیں۔ یہ لڑکی اسے بے انتہا مانوس نظر آئی۔ روز ماری اس کے لیے اجنبی تھی۔ وہ یکلخت بہت گھبرا گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اس لڑکی چمپا احمد سے ایک غیر مرئی بندھن میں بندھا ہوا ہے۔ اسے اپنے آپ پر اور اس لڑکی پر بڑا ترس آیا۔

"کیا تم بھی میرے متعلق ناول لکھو گے؟" چمپا نے پوچھا۔

"نہیں اور کون لکھنے والا تھا؟"

"بل ______ ولیم کریگ"

"نہیں۔ میں ناول نہیں لکھنا چاہتا۔"

"کیا میں تم کو بہت عجیب معلوم ہوتی ہوں؟"

''تم عجوبہ روزگار نہیں ہو۔ تمہاری طرح کی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں۔ ذہین' حساس اور دلکش۔''

چنانچہ ان تین الفاظ سے میری وضاحت ہو جاتی ہے۔ چمپا نے دل میں کہا۔ اس نے آنکھ بند کر کے اپنا پس منظر یاد کیا۔ بنارس کا محلّہ' گھر۔ آنگن میں کھری چار پائیاں پڑی ہیں۔ بابا پیچوان پی رہے ہیں اور مقدموں کی مسلیں دیکھتے جاتے ہیں۔ سرل کو یہ منظر دکھانا اسے اچھا نہ لگا۔ وہ اسے پھلانگ کر آگے بڑھ گئی۔ لکھنو۔ آئی ٹی کالج۔ کیلاش۔ گلفشاں ــــــ لیکن گلفشاں اس کا گھر نہ تھا (ہو سکتا تھا)۔

''یہ دیکھو کون آ رہا ہے تمہارے پس منظر سے نکل کر۔'' سرل نے کہا۔

چمپا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کنارے پر دور دور تک بکھرے ہوئے تعطیل منانے والوں کے مجمعے سے نکل کر کمال بوٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھاس پر اس کا سایہ آگے آگے چلتا رہا۔

''ہلو چمپا باجی۔ ہلو سرل۔'' اس نے قریب آ کر کہا۔

''ہلو''

''کل صبح ہم نے آپ کو ایک روڈ ہاؤس میں دیکھا تھا۔''

''ہاں۔''

''مگر ہم لوگ ذرا ــــــ جلدی میں تھے۔''

''ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔''

وہ بھی ایک الٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گیا۔

''میں سرل کو لکھنو کے متعلق بتا رہی تھی۔''چمپا نے کہا۔

''واقعی۔'' کمال نے اخلاقاً دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ یہ ابھی تک وہیں بیٹھی ہیں، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کمال نے تاسف سے سوچا۔

چمپا نے کمال کے لہجے کے رنج کا اندازہ لگا لیا۔ تم مجھے کبھی نہیں سمجھ سکو گے کمال۔ اس نے کہا۔ تم نے مجھ پر ہمیشہ چیزوں کی پرستش کا الزام لگایا ہے لیکن گرمی کی دوپہروں میں بھوسے کے ڈھیر کی مہک اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز اور خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی بیل گاڑ ـــــ مجھ میں شاید زیادہ عقل نہیں ـــــ لیکن میں ان سب چیزوں کو محسوس کرنا اور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں، اگر میں بہت زیادہ عقلمند ہوتی تو تمہارا فلسفہ پڑھتی اور مطمئن ہو جاتی۔

اوجیت ندی میں سے نکل کر آیا اور کمال کے نزدیک بیٹھ گیا۔

''سرل کاش تم نے بارش کے بعد چاند باغ کے کنجوں پر جو رنگ بکھر جاتے تھے وہ دیکھے ہوتے۔ یا رام نگر کی وہ گرد آلود سڑک جس میں گرمیوں کی بھری دوپہر کے سناٹے میں ایک چھوٹا سا اداس ہندو بچہ لمبی سی چوٹی رکھائے ایک منڈیر پر تنہا بیٹھا سوائیوں کا پہاڑہ یاد کر رہا تھا۔ ـــــ نہیں سرل ـــــ میں تم کو اپنا پس منظر نہیں بتا سکتی۔ بہت مشکل ہے اور تم سمجھ نہیں سکو گے۔''

''میں تم کو بتاؤں گا۔'' کمال نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا، وہ معاً اس دنیا میں داخل ہو گیا جو یہاں سے بہت دور تھی، جس پر وہ عاشق تھا۔ ان مناظر کی روح کو کمال سے بہتر کون جان سکتا تھا، وہ اس کا پیارا ہندوستان تھا۔

''لو سنو: گیان وتی کندھوں پر بال چھٹکا کر ایمن کا خیال گاتی تھی

زہرا کے فرزند حسنؓ ______ آلِ نبیؐ اولادِ علیؓ پر واری واری جاؤں ______ حسینؓ ______ اب میں اس کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہوں ______ اور مالتی گاتی تھی ______ کانہا موہے آ ساوری راگ سناؤ ______ اور شادیوں کے مقعوں پر کلیان پور میں دالان کے پردے گرا دیے جاتے تھے اور تختوں کے چوکے پر بیٹھ کر میراثنیں الاپتی تھیں۔ اس بنے پر سایہ علی کا۔ مورا شیام سندر بنا۔ ______ کون مغربی سوشیولوجسٹ اس منظر کے حسن کو سمجھ سکتا ہے ______ مورا شیام سندر بنا ______ ''

''اور ____ '' چمپا نے کہا ''میرے گھر کی میراثنیں گاتی تھیں ____ منگل گاؤں ___ چوک سجاؤں ____ گجرا چنبیلی کا لاؤ ری ______ چنبیلی کا گجرا تم نے دیکھا ہے سرل؟''

''اور گھاگھرا کے کنارے کنارے میرے گاؤں کے کسان کھیتوں کی منڈیر پر بیٹھ کر چاندنی رات میں آلہا اودل کی تانیں اڑاتے تھے ______ علیؑ علیؑ کر کے سید دوڑیں ______ آلہا کھینچ لیں تلوار ______ اور قدیر کا بھانجا نوٹنکی میں چہرے پر سفیدہ پوت کر گایا کرتا تھا:

خدا کا سکر ہے لیلیٰ ترے دربار میں آیا
کہ جس سرکار کا تھا میں اسی سرکار میں آیا

''چمپا باجی ______ وہ نوٹنکی تم کو یاد ہے ______ ہم تمہیں کرسمس کے زمانے میں اپنے گاؤں لے گئے تھے اور رات بھر کمبلوں میں لپٹ کر ہم نے لیلیٰ مجنوں ملاحظہ کیا تھا اور گاؤں کے اکارہم کو خوش کرنے کے لیے اپنا سارا آرٹ

صرف کیے ڈال رہے تھے۔''

''ہاں۔'' چمپا نے' جو اس وقت لکھنو سے پچیس میل کے فاصلے پر کلیان پور میں موجود تھی' وہیں سے جواب دیا: ''ہاں۔ اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا تھا:

تیرا چہرہ مرا قبلہ' تری جلفیں میرا ایماں
طواف کعبہ کرنے کو ترے دربار میں آیا۔''

''ہاں۔'' کمال نے کہا' وہ بھی کلیان پور میں موجود تھا' وہ سب نوٹنکی میں منڈپ کے نیچے شال اور کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ شکستہ حال اسٹیج پر صرف مدھم سا گیس کا ہنڈ' روشن تھا۔ پردے پر ایک فوارہ' بنا ہوا تھا اور چارپریاں جو کہنیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ قدیر کا بھانجا ماشٹر پھرید' جو اپنی تیز پاٹ دار آواز کی وجہ سے جھنگروا کہلاتا تھا' لیلیٰ کے سامنے کھڑا دہاڑ رہا تھا۔ گاؤں کا آرکسٹرا زور شور سے ہار مونیم اور طلبہ بجانے میں مصروف تھا۔ ماشٹر پھرید نے گایا:

زلیخا کی طرح جب ترا عاسک ہوا لیلیٰ
تو یوسف کی طرح بکنے ترے بازار میں آیا

برابر کے مونڈھے پر گوتم نیلمبر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر ی ہری شنکر موجود تھا اور ساتھ کی ساری لڑکیاں اور گوتم آگے جھک کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ چمپا کے سامنے فوک کلچر کے مسئلے پر روشنی ڈال رہا تھا' وہ سب صبح چار بجے تک نوٹنکی کے منڈپ میں بیٹھے رہے تھے اور انہوں نے مٹی کے کورے کلہڑوں میں ادرک والی چاء پی تھی اور گنے کا رس ______ یہ کمال کے والد نواب تقی رضا بہادر کا موروثی گاؤں تھا۔ یہاں کمال کی موجودگی میں اس کی رعیت میں صرف سید اور

برہمن پلنگ پر بیٹھ سکتے تھے۔ باقی لوگوں کے لیے حکم تھا کہ کھڑے ہو کر باتیں کریں۔ اب اسٹیج پر ماسٹر مراری لال' جو کلکتہ تک تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ گھوم آیا تھا' سوہنی میں گا رہا تھا:

یاس کا عالم نہ تھا' یوں بے کسی چھاتی نہ تھی
اب تو لیلیٰ تھی تماشا' خود تماشائی نہ تھی

وہ سب مونڈھوں پر بیٹھے نوٹنکی دیکھتے رہے۔ باہر آم کے جھرمٹ میں پوس کی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی گرم اور محفوظ' وہ منڈپ میں بیٹھے طبلے پر کہروا سنتے رہے۔ دفعتاً ایک موٹر لانچ ایک انگریزی ریکارڈ بجاتی ہوئی تیزی سے کیم کی لہروں پر سے گزر گئی۔ چمپا اور کمال واپس آ گئے ___

''ہمارے گاؤں کی نوٹنکی میں نل دمینتی اور اندر سبھا بھی بہت فرسٹ کلاس ہوتا تھا۔'' کمال کی ملوں آواز سنائی دی' وہ جھک کر سرل کا سگریٹ جلا رہا تھا۔

''اور تم کو جوتھیکا رائے یاد ہے کمال۔'' چمپا نے آہستہ آہستہ کہا۔ ''اور روشنی کا وہ گیت: جوگن کھوجن نکلی ہے۔''

''ہاں'' کمال نے اس کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔

''اور جاڑوں کی دھوپ میں بیٹھ کر ہری شنکر گاتا ________ اگر دینی تھی ہم کو حور و جنت تو یہاں دیتے ____ اور پیا ملن کو جات تھی میں' سج دھج سیس گندھائے ____ لوگ کہت میں باوری ____ سب جگ ہنسی اڑائے ____ تم کو کیا پتا'' اس نے غصے سے سرل کو مخاطب کیا' ''کہ پنکن ملک کون ہے' پہاڑی سانیال اور آرزو لکھنوی اور نرائن راؤ دیاس اور کانن دیوی ____ ان لوگوں کا

ہماری زندگیوں میں کیا مقام ہے۔''

''تمہیں کیا پتا ـــــــ'' چمپا نے اس کی خفگی کا کیولے کر کہنا شروع کیا۔ ''تم جو مجھ سے میرا پس منظر دریافت کرتے ہو ـــــــ کہ پیارو قوال کی کیا ہستی ہے اور فیاض خاں اور روپیا لی تعلق دار ـــــــ اور ـــــــ''

''اور تم کو کیا معلوم کہ لکھنو اور علی گڑھ کے مشاعرے کیا ہوتے تھے اور جگر صاحب کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہے اور فراق صاحب کی اور آنند نرائن ملا کی۔'' کمال نے کہا۔

''اور تم کو کیا پتا'' اب چمپا کی آواز میں غصے کی جگہ اتھاہ رنج نے لے لی'' کہ کالی داس کے اس شعر کے کیا معنی ہیں ـــــــ یہ شعر ـــــــ''

نروندھیا اور سندھو پر سے گزرتا بگلوں اور بطخوں کی معیت میں بادل پیغام لے کر چلا ـــــــ''

''اور تم کو کیا معلوم کہ ہالڈر کی بنائی ہوئی تصویر: اشوک کے جھنڈ میں سیتا' ہمیں کیوں اتنی خوبصورت لگتی ہے۔'' کمال نے کہا۔ ''نہیں سرل' یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

''اور یاد ہے کمال'' چمپا واپس جانے پر مصر رہی'' ہم سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر بیٹھ کر پندرہ پندرہ سال پرانے ریکارڈ بجایا کرتے تھے۔ کملا جھریا اور جانکی بائی اور ہری متی ـــــــ''

''ہاں۔'' کمال نے کہا۔ ''اور محمد حسین ساکن نگینہ کا ریکارڈ دھوئیں کی گاڑی اڑائے لیے جا ـــــــ''

''ہاں۔''چمپا خوش ہوئی کہ کمال کو واپس لے جانے میں کامیاب رہی' مگر اب کمال حال میں آ کر ماضی سے پیچھا چھڑا کر نکل بھگنا چاہتا تھا لیکن چمپا اس کے سامنے وقت کے ضمیر کی طرح بیٹھی تھی۔

دفعتاً کمال کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وقت کی آندھی میں پتے کی طرح ادھر ادھر ڈول رہی ہے' اڑی جا رہی ہے اور وہ اس کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا' وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کمال۔''سرل نے سحر زدہ آواز میں اس سے کہا''مجھے کچھ اور بتاؤ''

''اور کیا بتاؤں؟''اس نے رنج کے ساتھ جواب دیا اور بوٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر جا کر کھڑا ہو گیا اور ندی کو دیکھتا رہا۔ندی گومتی میں تبدیل ہو گئی۔

''کمال ـــــ سنو ـــــ''چمپا نے کچھ یاد کر کے کہنا شروع کیا۔''رات کا سماں ہے۔کتے بھونک رہے ہیں۔سناٹا بازار بھر میں پڑا ہے۔چڑیاں چنگن تک سوتی ہیں۔چوکیدار خربوزوں کے کھیت بچا رہے ہیں۔باغبان گوندنی کے کھٹکھٹے کو کھٹکھٹاتے ہیں۔اب کوئی دم مین چکیاں چلیں گی۔''

''سرشار؟''

''ہاں۔''وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

''ہم لوگ عموماً ہری شنکر کے کمرے میں جمع ہوا کرتے تھے جو دراصل ایک برجی تھی۔''کمال نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔''س کے نیچے دریا بہتا تھا۔اس کمرے کی دیواروں پر ان گنت پرانے فوٹو گراف تھے اور دو ٹوٹے ہوئے صوفے۔اس کمرے میں بیٹھ کر ہم نے لاتعداد کتابوں کے موضوع سوچے۔دنیا

کے مسائل حل کیے۔ یہ کمرہ اور یہ گروہ ساری دنیا میں موجود ہے۔ زندگی ابھی بہت غیر واضح تھی۔ بہت سے پردے اٹھتے تھے اور گرتے تھے۔ (کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھندلکے کا سایہ سامنے آجاتا۔ اس ذہنی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا)۔ کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھندلکے کا سایہ سامنے آجاتا۔ اس ذہنی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا۔ اب پسند ناپسند کے بجائے عجز ہمارا رویہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ رویہ احساس برتری نے پیدا نہیں کیا تھا۔ ہمیں یہ لگتا جیسے ساری انسانیت کے خون سے ہمارے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، ہمیں اس خون کو دھونا ہے اور دیکھو کیا ہوا!'' اس نے ہاتھ آگے پھیلائے۔ ''ایک روز صبح کو ہم اٹھے اور ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہاتھ واقعی خون سے رنگے ہوئے ہیں اور ہمارے وہ سارے کردار، جن کا ذکر تم نے چمپا باجی سے سنا ہوگا، ٹوئل کارڈ کے کریکٹرز کی مانند ذہین اور پرلطف گفتگو کرنے والے نوجوان، مارگ کا مطالعہ کرنے والی منی پوری ناچنے والی لڑکیاں، ہندوستان کی قدیم کلاسیکل تہذیب کا راگ الاپنے والے پوزیئر ______ ان سب کو ہم نے دیکھا کہ خون میں رنگے ہوئے ہیں، مگر ہم میں سے بہت سے ایسے تھے جو اس خون کا کفارہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور مذہب کی بلندی اور خدا کی بزرگی کا چرچا کرتے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ان کرداروں کے علاوہ اور لوگ بھی تھے ______ حقیقی، اصل انسان۔'' اس نے چمپا کو دیکھا۔

''قدیر ______ اور قمرن؟'' چمپا نے کہا۔

کمال نے خاموشی سے اجازت چاہی کہ ان کا ذکر کرے، وہ اسے بے حد

مقدس ہستیاں معلوم ہوئیں۔

''ہاں۔قدیر اور قمرن اور رام اوتار اور رام دیا اور ہمارے گاؤں کے کاشتکار اور ہمارے اکّے والے اور پنواڑی ـــــــ اور ہمارے زردوز جو چکن کاڑھتے کاڑھتے اندھے ہو جاتے تھے اور ہمارے باغوں کے کنجڑے اور پالکیوں کے کہار ـــــــ یہ سب ہمارا پس منظر ہے جسے تم کبھی نہ جانو گے۔'' اس نے بات ختم کی۔

چمپا ابھی واپس نہ آئی تھی۔اس نے کہنا شروع کیا: ''وہاں اور ہمارے دریا۔ دریا بھی ایک مستقل کردار تھا اور ان کے نام۔ ذرا ان کے نام سنو: سرجو۔شاردا۔درگاوتی۔مندکینی۔مدھومتی۔گومتی۔''

''گندھرو مالائیں جو ہماوت سے اتر کر بنوں میں بسنت رت منانے نکل آئی تھیں۔طغیان صاحب نے کہا۔

کمال نے چونک کر انہیں دیکھا۔اب تک وہ ان کے وجود سے بے خبر بیٹھا تھا۔وہ چند لمحے قبل آ کر چوتھی الٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گئے تھے۔''

''ٹھیک ہے یار۔'' کمال نے آزردگی سے کہا۔میں نے بھی ایک زمانے میں بڑی کویتا لکھی ہے۔یہ اسٹیج سب پر آتی ہے۔

''تو دریا میرے گھر کے نزدیک تھا۔گنگا میرے گھر کے پاس بہتی تھی۔ گومتی، ہری شنکر کے گھر کے نیچے بہتی تھی۔ ـــــــ گوتم نے بتایا ہو گا کہ ـــــــ ہم لوگ، ذرا سوچو، دریاؤں کے وجود سے کتنے بے نیاز رہتے ہیں۔ ارے پل دیکھو۔کشتیاں۔گھاٹ۔سنگھاڑے۔کنول کے پھول اور پھر ندی پر برستی

ہوئی بارش۔ یہ سب کتنی اہم چیزیں ہیں۔ مجھے سمندر سے وحشت ہوتی ہے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔ سمندر بیکراں ہے۔ ندی کو اپنا راستہ معلوم ہے۔''

اب دفعتاً چمپا کی آواز سے کمال بور ہونا شروع ہوا۔ لڑکیوں میں یہ کیا مصیبت ہے' اس نے سوچا' کہ ایک تو ہوتی ہی بکی ہیں' اگر ان پر یہ وحی آجائے کہ کلا کار بھی ہیں تو پڑا ہو گیا۔ چمپا باجی کلا کار نہیں تھیں لیکن ان کے شاعرانہ مزاج کا کون منکر ہوسکتا تھا!

وہ اس ندی کا ذکر کر رہی تھی اور کمال بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ندی کا کردار؟ مجھے سے زیادہ اور کون یہ بات جان سکتا ہے'' اس نے لرز کر سوچا۔ مجھے وہ مکان یاد ہیں' وہ ندی' وہ درخت ______ چمپا باجی تم خود ______

''اور باغ میں املتاس کے درخت تھے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''اور ایک بیل کا درخت بھی۔ بیل تم نے کھایا ہے کبھی؟'' اس نے اوجیت سے پوچھا۔ ''پورب کی خاص چیز ہے۔ کمال' گوتم سے پوچھنا' اسے وہ ٹپ ٹپ گرتے بیل یاد ہیں؟'' اس نے بے اختیار ہو کر پہلی بار گوتم کا نام لیا۔

کمال سوچتا رہا۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ گوتم ان کو تقریباً بھول چکا ہے' مگر بھولنا کیا معنی! ضرور یاد ہوں گی' جیسے اسے ندی یاد ہے اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور املتاس کا درخت۔ اب بھی وہ اکثر بڑے جذبات میں ڈوب کر ان چیزوں کا ذکر کرتا۔ کیا مصیبت ہے۔ اس نے جھنجھلا کر چمپا کو دیکھا۔ یہ لڑکیاں مری کیوں جاتی ہیں؟ اصل میں ______ اس نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سوچنا شروع کیا ______ ان کو ہزار ہا برس سے اس کمپلکس میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ ایک سنا

ہے وہ ستی تھیں، پھر سیتا، پھر گوپیوں کا فراڈ چلا ______ ان کو دنیا میں کوئی کام نہیں بس کسی بھلے مانس کو پکڑ کر دے اس کی پوجا۔ دے اس کی پوجاری نیک بختو، اللہ رسول سے دل لگاؤ، اگر محبت ہی کرنا ہے۔ رابعہ بصری سے سبق لو۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی پہنچی ہوئی بیبیاں گزری ہیں، لیکن یہ ساری سینٹ وینٹ خواتین بھی یہی سوچتی ہوں گی کہ اگر یسوع مسیح مل جائیں تو لے کر ان کے موزے رفو کر دیں۔ ''میں گوتم سے ضرور پوچھوں گا۔'' اس نے باواز بلند کہا۔ ''اور مجھے اپنے موزے بھی رفو کروانے ہیں۔'' اس نے اپنے پیروں پر نظر ڈال کر اسی رو میں کہا۔ کل یوتھ فیسٹیول کے لیے جرمنی جا رہا ہوں۔ راتوں رات لندن پہنچ جاؤں تو طلعت میرا سرا سامان سفر ٹھیک کر دے گی۔

''بہنوں کے ہونے کا یہ بڑا فائدہ ہے۔'' طغیان صاحب نے بات کی۔

''جی؟ جی ____'' کمال نے جواب دیا۔ ''اس لیے چمپا باجی اب اجازت دیجیے۔ خدا حافظ سرل۔ او جیت۔''

''چلو ہم تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔'' سرل نے اٹھتے ہوئے کہا، وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ کمال اسٹیشن چلا گیا۔ چمپا نے اپنے ہوسٹل کے کمرے میں آ کر دریچہ کھولا۔ نیچے سنسان سڑک لیمپ کی نیلگوں روشنی میں خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ سینٹ جان کے گھڑیال نے گیارہ بجائے۔ دور جیزس لین میں کوئی شخص ٹرمپٹ پر اپنا غمگین نغمہ چھیڑ رہا تھا۔

گھنٹی بجی تو طاعت نے دروازہ کھولا۔وہ مشرقی برلین کے ایک جدید وضع فلیٹ میں اپنی ایک سنگتراش دوست کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔باقی کے سب لوگ ابھی ادھر ادھر سڑکوں پر گاتے بجاتے پھر رہے تھے۔اس نے بالکنی پر سے جھانک کر دیکھا۔پھولوں کی بیل کے نیچے نیم تاریک پورٹیکو میں دو سائے کھڑے تھے۔ان میں سے ایک نے جلدی جلدی دوسرے سے کچھ کہا اور اسے اندر دھکیل دیا۔

نووارد اسٹوڈیو میں داخل ہوا تو طاعت نے اسے پہچانا یہ وہی نوجوان تھا جو چند روز قبل سینٹ جانز ووڈ میں روشن سے ملنے آیا تھا۔

''میں نے سنا تھا کہ مشہور سنگتراش فراؤلین کریمر یہاں رہتی ہیں۔''

''آپ نے بالکل صحیح سنا تھا' لیکن ان کے بجائے میں موجود ہوں فرمائیے آپ کی کیا خدمت کی جاسکتی ہے۔آپ کو سر چاہئے؟ تانبا یا پلاسٹر آف پیرس؟''طاعت نے بڑے پروفیشنل انداز میں جھاڑن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''جی۔میں سر نہیں چاہتا۔''اس نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔''میری ایک دوست ہیں' ان کو چاہئے۔''پھر دفعتاً اس نے چونک کر غور سے طاعت کو دیکھا۔جو اطمینان سے مجسمہ سازی کے لوازمات میں گھری کچھ کھڑ پڑ کر رہی تھی فیسٹول کی وجہ سے کامریڈ کریمر کا کام خوب چمک گیا تھا۔بھانت بھانت کے لڑکے اور لڑکیاں ہر قوم اور ہر ملک کے اس کے پاس آرہے تھے'وہ بے حد جذباتی ہو کر نیگرو اور ایشیائی لڑکوں اور لڑکیوں کے سر بناتی اور ان کو تحفتاً دے دیتی۔سخت مصروفیت کا زمانہ تھا۔اسٹوڈیو میں برابر رت جگا رہتا۔طاعت' جسے آرٹ میں بھی دخل تھا' اس

کی اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی۔

نووارد جب یہاں آرہا تھا تو دوستوں نے اس سے کہا تھا کہ فراؤلین کریمر بورژوا آرٹسٹ نہیں ہے۔اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا' وہ لیکچر پلائے گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے یا سارے مجسمے توڑ کر بھاگ کھڑی ہوگی اور تم کو دام بھرنے پڑیں گے۔

''اپنی دوست کو بلا لائیے ____ تا کہ میں ان کا مولڈ بنالوں۔ میں فراؤلین کریمر کی پارٹنر ہوں۔''طلعت نے جھک کر بڑے اخلاق سے کہا۔ اس نے ہنگرین لڑکیوں کا رنگ برنگی کڑھت والا قومی لباس پہن رکھا تھا جو اسے اسی روز تحفے میں ملا تھا۔اس نے محسوس کیا کہ اجنبی اس کو پہچاننے کی بے انتہا کوشش کر رہا ہے لیکن اب تک پہچان نہیں پایا۔اسے اس طرح ایکٹنگ کرنے میں بہت لطف آیا۔''اس الماری میں چاء کی پتی رکھی ہے۔ادھر اسٹوو ہے۔____ آپ کافی بنائیے میں ابھی آتی ہوں۔''اس نے ____ بوہیمین انداز کی بے تکلفی کی نقل کرتے ہوئے کہا اور پلاسٹیسن نکالنے کے لیے اسکرین کی دوسری طرف چلی گئی۔

دروازہ کھلا اور ساجدہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

''ملی؟''انہوں نے اجنبی سے پوچھا۔

''نہیں' یہاں بھی نہیں ہے'مگر آہستہ بولو'شاید یہ لڑکی اردو سمجھتی ہو۔''

''کون لڑکی۔''

''وہ اسکلپٹر اس وقت نہیں ہے۔اس کی اسسٹنٹ ہے۔ہنگیرین سی دکھلائی پڑتی ہے۔مگر مجھے تو کچھ گھپلا نظر آتا ہے۔____ اس میں بھی ____''

اسکرین کی دوسری طرف سے طاعت کے اسکرٹ کی جھلک دکھلائی دی تو اس نے ذرا گھبرا کر اونچی آواز میں کہا: ''اس بدتمیزی کو معاف کیجئے گا مادموزیل کہ ہم اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' طاعت نے اسکرین کے پیچھے سے جواب دیا۔ ''مجھے اس کی ساؤنڈ بہت اچھی لگتی ہے' جیسے مکھیاں بھنبھناتی ہوں۔''

''مکھیاں؟''

''جی ہاں۔ یہ میں نے تشبیہ استعمال کی۔ شہد کی مکھیاں۔ میں بہت عرصے ٹیونس میں رہی ہوں' وہاں عربی سنا کرتی تھی۔''

''ٹیونس میں؟''

''جی ہاں ______ حبیب بورغیبہ کے ساتھ۔''

''وہاں کیا کر رہی تھیں آپ؟''

''جاسوسی۔ طاعت نے اطمینان سے جواب دیا اور پلاسٹیسن کا گولہ بنانے میں مصروف رہی۔''

ساجدہ بیگم کا رنگ سفید پڑ گیا۔ میں نے کہا تھا کہ مشرقی برلین نہ آنا۔ جانے کس مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ اب دیکھوں کہاں پھنس گئے انہوں نے اب تک ہالی ووڈ کی فلموں میں جو کچھ سنٹرل یورپ کے بارے میں دیکھا تھا وہ سب پل کی پل میں تصور میں کوند گیا۔ آرٹسٹوں کے بھیس میں خطرناک جاسوس۔ بین الاقوامی سازشیں۔ اغوا اورینٹ ایکسپریس۔ وکی بام کا ''گرینڈ ہوٹل''۔ کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹو ڈیو میں آمد کا مطلب سمجھتی ہے۔ اس نے بے چینی سے کرسی پر پہلو

بدلا۔

طاعت اسکرین کے باہر آئی۔

''ارے یہ تو طاعت بہن ہیں۔'' ساجدہ بیگم چلائیں۔ ''تو بہ ہے۔تم نے یہ کیا روپ بھرا ہے۔اچھا بیوقوف بنایا۔''

''ہلو' ساجدہ آپا______ ''طاعت نے شگفتگی سے کہا۔ ''بیٹھیے۔ابھی آپ فرسٹ کلاس مولڈ بناتی ہوں۔آپ نے کافی تیاری کر لی؟'' اس نے ساجدہ بیگم کے ساتھی سے دریافت کیا۔

''معاف کیجیے گا میں نے بھی آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا اس لباس میں۔لندن میں بھی آپ سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔صرف آپ کا ذکر بہت سنا ہے۔''

''جی______ آپ کی یہاں تشریف آوری کیسے ہوئی؟ میں نے دیکھا تھا آج آپ پولش لڑکیوں سے بہت برادرانہ سلوک کر رہے تھے۔''

''وہ______ تو میں ذرا ان لوگوں کا جھوٹ سچ معلوم کرنے آیا ہوں۔ میں ایک انگریزی اور دو اردو اخباروں کے لیے لندن لیٹر لکھتا ہوں۔ یہاں سے جا کر ان لوگوں کی قلعی کھولوں گا۔''

''تم ان سے پہلے کبھی نہیں ملیں۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''بڑے مشہور جرنلسٹ ہیں۔''

''جی اور ساجدہ آپا آپ یہاں کیسے۔''

''میں____ میں ذرا ان لوگ کا____ ''

''____ جھوٹ سچ معلوم کرنے آئی تھیں!''

''بالکل انہوں نے جواب دیا۔''

''مگر ساجدہ آپا ____ اور آپ''

''خان۔''

''مسٹر خان ____ مجھے واقعی بڑا افسوس ہے کہ آپ روشن کا تعاقب کرتے یہاں تک آئے مگر وہ نہ ملی' وہ یہاں کبھی نہیں آئی' اگر آجاتی تو اس کے لیے اچھا ہی تھا۔ اتنی شدت سے الجھی ہوئی نہ رہتی' مگر وہ عین اس لمحے سالزبرگ میں موزارٹ کی موسیقی سن کر اپنی روح کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔''

''کیسا تعاقب بھئی۔ کیا اڑا رہی ہو۔'' ساجدہ نے خفگی سے کہا۔

''نہیں تو ع۔ اچھا ہے ساجدہ آپا یہاں ایک سے ایک تحفے آپ کو ملیں گے۔ پندرہ دن تک وہ وہ خاطر مدارات ہوگی جس کا ٹھکانہ نہیں۔ مفت کی تفریح۔ کیا حرج ہے۔ آپ لوگ نے ان ممالک کو نہ جانے کیوں ہوا بنا رکھا ہے۔'' وہ سرعت سے ان کی ناک بناتے ہوئے بولی۔

''یہ مشغلہ آپ نے کب شروع کر دیا۔'' مسٹر خان نے کہا۔ ''مجسمہ سازی۔''

''جی۔ مشغلوں مشغلوں کی بات ہے۔ بعضوں کا مشغلہ مخبری ہوتا ہے۔''

ساجدہ نے گھڑی دیکھی: ''اب چل دوں ____ جہاں ہم ٹھہرے ہیں وہاں کھانے پر انتظار ہو رہا ہوگا۔''

''بہت خوب دوسری سٹنگ کب دیجیے گا؟''

''میں فون کر دوں گی۔''

''بہت اچھا۔''

وہ بالکنی میں سے ان دونوں کا جاتے دیکھتی رہی۔ پھولوں کی بیل پھر جھک آئی جس کے سائے میں ''مسٹر خان'' ایک لمحے کے لیے گم سم کھڑا رہا' پھر ساجدہ بیگم کے پیچھے پیچھے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

واپسی پر وہ لوگ فرانس کی سرحد عبور کر رہے تھے جب ٹرین میں کسی نے بتایا کہ روشن پکڑی گئی۔

''کیا چنڈو خانے کی اڑاتے ہو۔'' طلعت نے آزردہ ہو کر کہا۔ ''وہ سیاسی کبھی نہیں تھی۔ آخر اس کے پکڑے جانے کی کیا تک ہے۔ یہ ایک یار لوگوں نے اس کے لیے افواہیں پھیلا رکھی ہیں خواہ مخواہ اور پکڑے جانے کا مطلب؟ وہ اسمگلنگ کرتی تھی؟ بم بناتے تھی؟ امریکہ کے اہم راز روس کو اور پاکستان کے اہم راز ہندوستان کو بتاتی تھی؟ آخر کیا کر رہی تھی بھجائی؟ اس غریب کو اپنے فلسفے ہی سے فرصت نہیں۔ اس کو یہ تک معلوم نہیں کہ فورتھ انٹرنیشنل ۔''

''اصل خیالات سے کیا ہوتا ہے۔ اصل خیالات کی تصویر تو نہیں لی جا سکتی۔'' گوتم نے اس کی بات کاٹی' وہ مغربی جرمنی کے سفارتخانے میں کسی کام سے آیا ہوا تھا اور راستے میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔ ''تم افواہوں کی نفسیات کو نہیں جانتیں اور اسٹیریو ٹائپ کی طاقت' اگر میں مستقل تمہارے لیے پروپیگنڈہ کروں کہ تم طلعت رضا نہیں ہو دراصل دلائی لامہ کی جانشین ہو تو واقعی تمہیں دلائی لامہ کی جانشین سمجھا جائے گا۔ ہماری زندگیوں کا جھوٹے مفروضوں اور غلط پروپیگنڈے پر انحصار ہے۔ روشن تو بہت غیر اہم ہستی ہے۔ پوری قوموں' سموچے

ملکوں کے خلاف اسٹیریوٹائپ کا حکم چلتا ہے۔ یہ آج کی دنیا ہے۔ طلعت آرا بیگم جس میں فن کاروں کے علاوہ طالب علموں کی تو سب سے بڑی قیمت مقرر ہے۔''

''اب میں نے دیکھا کہ پروپیگنڈہ کسے کہتے ہیں۔ کمال ہے بھئی۔ روشن غریب، جس کے کوئی سیاسی خیالات کسی قسم کے ایک سرے سے ہیں ہی نہیں، اس کو اتنی اہمیت دی جارہی ہے کہ دو بھلے آدمی اس کے پیچھے پیچھے برلین تک آئے گو وہ ان کو تب بھی نہ ملی۔''

''مگر اس بہانے ان دونوں نے تفریح تو کرلی۔''

''سنا ہے روشن کے والد بہت بیمار ہیں۔ مجھے بون میں کوئی بتا رہا تھا۔ ممکن ہے ان افواہوں سے اس کی اسکالرشپ پر بھی اثر پڑے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کراچی کی سیاست کا اس میں کافی دخل ہے۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' طلعت نے پوچھا۔

''سنا ہے کوئی مرکزی وزیر ہیں جو روشن کے والد کے خلاف ہیں۔ یا شاید روشن کے والد مرکزی وزیر کے خلاف تھے۔ ایسا کچھ سلسلہ ہے۔ بہر حال تو وہ سول سروس کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کو ویسے ہی کسی پچھلے وزیراعظم نے کوئی بہت بڑا عہدہ دے دیا تھا۔ اب ان وزیراعظم کے جانے کے بعد روشن کے والد کے خلاف بڑا محاذ قائم ہو رہا ہے۔ ممکن ہے روشن بے چاری کے خلاف جو مضحکہ خیز کارروائی کی جارہی ہے اس کا اس محاذ سے کچھ تعلق ہو۔''

''یا اللہ۔'' کمال نے گڑبڑا کر کہا۔ ''اس قسم کے حالات ہیں؟''

''ہیں تو سہی۔'' حمید نے جواب دیا، وہ سب کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے

سبزہ زاروں کو دیکھتے رہے۔

۷۸

شیو پرشاد بھٹ ناگر رنجو بارہ بنکوی ان لوگوں میں سے تھے جو لندن میں برسوں سے برس سے خود اختیاری جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ رنجور صاحب دوسری جنگ عظیم سے پہلے بارہ بنکی سے اوکسفرڈ آئے تھے۔ تعلیم ختم نہ کر پائے تھے کہ جنگ چھڑ گئی اور یہ یہیں رہ پڑے۔ ایک عدد لیٹوین یا لیتھونین لڑکی سے شادی کر لی۔ سخت موڈی اور کاہل آدمی تھے۔ بی بی بڑی نیک بخت ثابت ہوئی، وہ اب بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھی۔ جس ہندوستانی یا پاکستان کو کہیں ٹھکانہ نہ ملتا وہ سیدھا یہیں آجاتا۔ رنجور صاحب بہت ہی شریف آدمی تھے۔ سب کی بہت خاطرین کرتے۔ اکثر مہمان ان کا بل ادا کیے بغیر ہی بھاگ جاتے مگر رنجور صاحب ان کی شکایت نہ کرتے۔ اتر پردیش سے اگر کوئی چوہا بھی آنکلتا تو اس کے لیے بچھ بچھ جاتے۔

ہمراز فیض آبادی ان کے مکان کی اوپر کی منزل میں ان کے کرائے دار تھے۔ رنجور بارہ بنکوری ہندو تھے اور ہندوستانی ہمراز فیض آبادی مسلمان تھے اور بڑے کٹر پاکستانی۔ تھے دونوں شاعر۔ ایک دوسرے سے مستقل بحث کرتے۔ رنجور صاحب کہتے: تم لوگوں نے ہندو شعراء کی کبھی اتنی قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ تم علی گڑھ والوں نے فرقہ پرستی کا زہر پھیلایا وغیرہ یا رامائن فرحت لے کر

بیٹھ جاتے اور بیئر کے چند گلاسوں کے بعد روہانسے ہو کر کہتے تم ملیچھ مسلمسٹے ہو، تم نے بھارت ماتا کے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس پر ہمراز بھائی بھارت ماتا شان میں کچھ گوہر افشانی کرتے۔ شیو پرشاد روتے روتے کہتے: یہ شعر سنو۔ کل رات ہوا ہے۔ شعر سن کر ہمراز بھائی کہتے: ہاں یار، اچھا ہے مگر ذرا بوئے کچوری و ہینگ می آید۔ اس پر دوبارہ فساد شروع ہو جاتا۔ روز رات کو کھانے کے بعد یہ سلسلہ رہتا۔ ایک بات میں رنجور اور ہمراز دونوں اپنے سارے اختلاف چھوڑ کر متفق تھے، وہ تھی پنجابیوں کے لیے ان کی ناپسندیدگی۔ اس موضوع پر دونوں گھنٹوں باتیں کرتے نہ تھکتے۔ گو ہمراز بھائی بڑے شعلہ بداماں پاکستانی تھے مگر بہر حال آبائی وطن اتر پردیش تھا کہتے: ارے، یہ پنجابی گھڑ سوار، رسالدار اردو کیا جانیں! شیو پرشاد بڑے زور شور سے ہاں میں ہاں ملاتے۔ ان کی پہلی ہندو بیوی سے جولڑکی ہندوستان میں تھی اس نے کسی پنجابی سے شادی کر لی تھی اور چندی گڑھ میں رہتی تھی۔ جس روز اس کی شادی کی اطلاع آئی شیو پرشاد صاحب نے خاص طور پر آکر ہمراز بھائی کو اس سانحے کی اطلاع دی۔

''لو میاں ہمارے خاندان کی زبان بھی بگڑ گئی۔ آخر ہم پنجاب گردی سے کہاں تک بچے رہتے۔'' ہمراز بھائی اس صدمو میں ان کے دلی شریک رہے کیونکہ خدانخواستہ کل کو ان کی بہن کی شادی بھی کسی پنجابی سے ہوسکتی تھی۔ رنجور صاحب کی ان محفلوں میں ان کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے اتر پردیش والے ہندو مسلمان ہندوستانی اور پاکستانی بیٹھ کر اپنے وطن کی بزرگی بیان کرتے، اس عظیم کلچر پر روشنی ڈالتے اور شعر پڑھتے ایک روز کمال اس محفل میں گیا تو اس کو

بڑی حیرت ہوئی۔ ''کس قدر غیر منطقی ہیں آپ۔'' اس نے ہمراز بھائی سے کہا۔
''آپ کا وطن پاکستا ہے۔آپ کو اب یو۔پی سے مطلب؟''
''اجی وہ تو ٹھیک ہے ___ مگر _______ ''ہمراز بھائی نے گڑ بڑا کر کہنا شروع کیا۔

''ٹھیک کیا ہے؟'' کمال نے ان کی بات کاٹی۔''اسی لیے تو پاکستان میں یو۔پی والوں کی وفاداری پر شبہ کیا جاتا ہے۔دل انکا ہوا ہے فیض آباد میں' ملازمت کرتے ہیں کوئٹے میں اور پاسپورٹ بنوا کر اماں بیگم سے ملنے فیض آباد جاتے ہیں تو وہاں خفیہ پولیس پیچھے لگ جاتی ہے۔ادھر پاکستان میں کہا جاتا ہے کہ یہ مہاجر لوگ سارے کے سارے ملک سے فائدہ اٹھانے کے لیے آگئے ہیں ورنہ ان کا اصل وطن تو بھارت ہے۔قصہ مختصر یہ کہ بھائی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔کس قدر دیوانی قوم ہے مسلمانوں کی۔حد ہے واللہ!''

''میاں صاحبزادے' زیادہ بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔''ہمراز بھائی نے جواب دیا تھا۔''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔تم ہندوستانی مسلمان ہو' یاد رکھو' جب وہاں ملازمت نہیں ملے گی اور بھوکے مرنے لگو گے تو دھکے کھا کر پاکستان ہی کا رخ کرو گے۔''

غالباً ہمراز بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔اس نے لرزکر ان کی صورت دیکھی۔ اس وقت رنجور صاحب پان کی گلوریاں بنا بنا کر خاصدان میں رکھتے جا رہے تھے۔ پان ایک بڑی مقدس شے تھی جو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز ہر ہفتے ہمراز بھائی کے لیے لندن آتی تھی اور بطور تبرک رنجور صاحب کو صبح شام اس کے دو بیڑے

کھلائے جاتے تھے۔ پان بنانے کے مقدس فریضے کو بڑے اہتمام سے تکمیل تک پہنچانے کے بعد رنجور بارہ بنکوری کمال کی طرف مڑے اور ملول آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔

''مصیبت یہ ہے کمال میاں'' انہوں نے اپنے خوبصورت لہجے میں اداسی سے کہا' کہ تم شاعر ہو۔ ہر نوجوان شاعر ہوتا ہے۔ اصول پرست۔ راست باز۔ تصورات پر مر مٹنے والا' وہ حقیقت کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر بدقسمتی سے دنیا کا نظام شاعر نہیں سیاست دان چلا رہے ہیں جن کو تمہارے وژن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ تم حقیقت سے کس حد تک سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوتے ہو۔ تمہاری اصل بڑائی یا گھٹیا پن اس وقت ظاہر ہوگا کہ تم نے حقیقت سے' یعنی بے ایمانی سے' جھوٹ سے' زیا کاری اور اخلاقی جرم سے کس حد تک سمجھوتہ کیا۔''

طاعت اور کمال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراہتے تھے۔ اقبال ایوننگ میں جا کر انہوں نے اقبال کے فلسفے پر تقریر کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے حالانکہ رنجور صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کروا سکتے تھے۔ اس غربت کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ' جیسا کہ پہلے لکھا گیا' ان کے اکثر کرائے داران کو کرایہ دیے بغیر ہی غائب ہو جاتے اور یہ اپنے مہمانوں سے بے حد واجبی پیسے لے کر انتہائی بڑھیا کھانے انہیں کھلاتے۔ سویٹ کس قدر کریک ہیں رنجور صاحب۔ طاعت نے ایک روز کہا تھا۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں جگہ کہاں ہے؟ ان کی بی بی مایا (ان کا اصل نام یہی تھا اور رنجور صاحب نے اس نام کی بنا پر اپنے ایک مضمون میں' جو ۳۹ء میں زمانہ کا

نپور میں چھپا تھا' یہ ثابت کیا تھا کہ لیٹویں لوگ دراصل ہندو تھے۔ بعد میں جب
جدید تحقیقوں سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ غالباً آریوں کا اوریجنل وطن بالٹک کی
طرف تھا اور سنسکرت اپنی اصل حالت میں انہی علاقوں میں بولی گئی تھی تو رنجور
صاحب نے طے کرلیا۔ وہ خود بہت بڑے محقق ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب
وہ تاریخ پر ایک کتاب لکھنے والے ہیں۔ پچھلے پندرہ برس سے وہ اس کتاب کی
تصنیف میں مصروف تھے مگر وہ ابھی پہلے چند ابواب سے آگے نہ بڑھی تھی۔ اس
تحقیق کے لیے ان کو آئرلینڈ کا سفر درکار تھا جہاں اشومیدھ عہد عتیق میں منایا جاتا
تھا اور بالٹک کے ممالک کا جہاں اندر کی پوجا ہوتی تھی' مگر اس سفر کے لیے جو
روپیہ چاہیے وہ رنجور کبھی فراہم نہ کر پاتے لہٰذا وہ کتاب ابھی نامکمل تھی) بڑی
خاموش طبع اور گھریلو خاتون تھیں اور چند سال قبل بے حد خوبصورت رہی ہوں گی۔
(انجور صاحب خود کافی خوش شکل تھے) ان کا سارا وقت میاں اور بچوں کی خدمت
اور کھانا پکانے میں گزرتا۔ دن بھر وہ مشین کی طرح کام کرتیں۔ طلعت وغیرہ کے
گروہ کو ان سے بہت ہمدردی تھی۔ رنجور صاحب کو اپنی تاریخ کی کتابوں اور
شاعری ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی جو وہ مایا کی طرف توجہ کرتے' وہ ٹھیٹھ ہندوستانی پتی
ورتا عورتوں کی طرح چپ چاپ باورچی خانے میں گھسی رہتی یا کپڑے دھوتیں۔

زندگی یونہی گزرتی جارہی تھی کہ شیو پرشاد بھٹ ناگر رنجور بارہ بنکوی کے
بورڈنگ ہاؤس میں ایک نوجوان پارسی طالب علم آن کر ٹکا۔ لڑکیاں جرمنی سے
لوٹ کر آچکی تھیں اور اب قاضی نذرالاسلام کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع
ہورہی تھی۔ ان کے علاج کے لیے روپیہ فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک ورائٹی

پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا جس کی تیاری کئی مہینے قبل سے شعروع ہو چکی تھی۔ ہار لے اسٹریٹ کے ڈاکٹرں کی فیسیں بہت زیادہ تھیں، شاید ان کو وہی آنا بھی لے جایا جائے۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے طے کرلیا تھا کہ ان کا علاج پوری طرح سے کرا کر رہیں گے۔ ان کے ہمراہ کی بی بی کے علاوہ ایک طے کرلیا تھا کہ ان کا علاج پوری طرح کرا کر رہیں گے۔ ان کے ہمراہ ان کی بی بی کے علاوہ ایک بہت بڑی پارٹی تھی۔ ٹوٹینگ میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا جہاں وہ گم سم بیٹھے بچوں کی طرح حیرت زدہ سب کو دیکھتے رہے۔ ان کا دماغ ماؤف تھا۔ ان کی بی بی کے اعضاء مغلوج تھے، وہ نزدیک ایک پلنگ پر لیٹی رہتیں۔ ان کا گھر بنگالی طلباء کے لیے زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ ٹیگور کے لیے ہمارے دلوں میں بے پناہ ہوا تھا۔ ٹیگور کے لیے ہمارے دلوں میں بے پناہ عزت ہے اور نذرل کے لیے ٹرپ پر نکل کر لڑکے اور لڑکیاں مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ طاعت اور فیروز نے پہلے سوئس کاٹیج کا رخ کیا جہاں رنجور بارہ بنکوری رہتے تھے۔

مکان کے زینے پر ان کو ہمراز بھائی مل گئے۔ ''ہمراز بھائی! لائیے پیسے۔'' طلعت نے دست سوال دراز کیا۔

''یہ طالب علم کیوں نذرالاسلم کے لیے اتنے بے حال ہوئے جا رہے ہیں۔'' ہمراز بھائی نے کہا۔

''یا اللہ ______ ہمراز بھائی۔'' طلعت نے کہنا شروع کیا۔ ادھر یہ لوگ ہمراز بھائی سے بحث میں الجھ رہی تھیں عین اسی وقت علامہ رنجور بارہ بنکوی کی زندگی میں ایک قیامت بپا ہوگئی۔

دریچوں کے شیشے ڈوبتے سورج کی روشنی میں قرمزی نظر آ رہے تھے۔ رنجور صاحب فکر شعر میں مبتلا مکان کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ نیچے تہ خانے میں تیز روشنی ہو رہی تھی جہاں مایا عموماً اس وقت روزانہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف دکھلائی دیتی تھیں۔ ٹھیک اس سے رنجور صاحب کو جانے کیا نظر آیا کہ سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور وہ تیر کی طرح تہ خانے میں پہنچے۔

ہال کے زینے پر کھڑے ہو کر طاعت اور فیروز تہ خانے میں ایک زور دار دھماکے کی آواز سنائی دی' وہ دونوں دوڑی ہوئی نیچے گئیں۔ مایا خون میں لت پت فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی اور ان کی بڑی لڑکی قریب کھڑی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ رنجور صاحب دروازے میں صم بکم کھڑے تھے۔

''کیا ہوا؟'' طاعت نے دہل کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' انہوں نے سکون سے جواب دیا۔ ''زینے پر سے ان کا پاؤں رپٹ گیا۔ فکر مت رکو۔'' پھر وہ خاموشی سے اوپر چلے گئے۔

دوسرے لمحے اوپر کی منزل سے اتنے ہی زوردار دھماکے کی آواز آئی۔

لڑکیاں بوکھلاہٹ میں دوڑی ہوئی اوپر پہنچیں۔ جتنی دیر میں طاعت نے ۹۹۹ کو فون کر کے ایمبولینس منگائی اتنی دیر میں رجور صاحب ہوشنگ ماچس والا کی ٹھکائی بھی اچھی طرح کر کے فراغت پا چکے تھے۔ ہمراز بھائی اور دوسرے لوگ ہاں ہاں کرتے اپنے اپنے کمروں سے بیچ بچاؤ کے لیے دوڑے مگر رنجور صاحب نے ہڑ بڑاہٹ میں ایک ایک جھانپڑ ان سب کو بھی رسید کیا اور اسی سلسلے میں ہمراز

بھائی سے باقاعدہ ان کے دو دو ہاتھ ہو گئے۔ لینڈنگ پر، جہاں یہ ہنگامہ ہو رہا تھا، اندھیرا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمراز بھائی اور رنجور صاحب دونوں ایک دوسرے کو ہوشنگ ماچس والا سمجھے۔

اب رنجور صاحب سے کہا گیا کہ وہ قریب کے پب سے اپنی بے چاری بی بی کے لیے تھوڑی سی برانڈی لے آئیں۔ یہاں برانڈی کا انتظار ہوتا رہا لیکن معلوم ہوا کہ وہ خود ہی پب میں شغل کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ طلعت مایا دیوی کو ہسپتال لے گئی۔ فیروز کے بچوں کو پچکارنے میں مصروف ہوئی۔ ہوشنگ ماچس والا نے اسباب باندھ کر ٹیکسی منگوائی اور وہاں سے کان دبا کر بھاگا۔

اس ہڑبونگ میں نسیم بانو سے ملنے کا وقت نکل گیا۔ مایا بھٹ ناگر کی مرہم پٹی کروانے کے بعد طلعت اور فیروز نائیٹس برج کے ایک بہت بڑھیا فلیٹ میں پہنچیں جہاں نسیم بانو کی والدہ سیٹ تک شادی کیوں نہیں کی؟ کب تک پڑھتی رہو گی؟ اب شادی کر ڈالو اور نسیم بانو نے پکوڑے تل کر کھلائے مگر چندے کے نام کا ایک پیسہ بھی نہ دیا۔

دونوں غصے میں بڑبڑاتی نیچے اتریں۔ اب کون سے فلم اسٹار کے پاس جائیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر انہوں نے سوچا۔

یہ فلم والوں کا سلسلہ طلعت کو ہمیشہ بور کرتا تھا کیونکہ جب سے انڈین فلم انڈسٹری کی ترقی ہوئی تھی آئے دن کوئی نہ کوئی بڑا فلم اسٹار لندن آ پہنچتا۔ ایشین فلم سوسائٹی میں اسے بلایا جاتا۔ ان کی پبلسٹی سے ہندوستان کی پبلسٹی ہوتی تھی۔ "اس پبلسٹی کے ریکٹ نے دماغ چکرا دیا ہے" طلعت کہتی۔

''چلو چل کر مایا دیوی کی خیریت معلوم کر لیں۔'' وہ الٹے پاؤں سوئس کاٹج گئیں۔ فیروز پر اس وقت ڈیپریشن کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

''حد ہے یار۔'' اس نے کہا۔

''ہاں یار حد ہے۔'' طاعت نے جواب دیا۔

ہمراز بھائی کے فلیٹ میں بہت چہل پہل تھی۔ ساری عمارت کے مکین، یعنی رنجور صاحب کے مہمان، ہاں جمع زور شور سے اس غیر متوقع اور عجیب و غریب واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کمال بھی موجود تھا، وہ طاعت کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلا تھا۔

''ہیڈ کوارٹر میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ تم لوگ کہاں رہ گئی تھیں بھئی۔'' اس نے کہا۔

''مسز بھٹ ناگر اب کیسی ہیں بھابھی؟'' طاعت نے ہمراز بھائی کی بی بی سے پوچھا۔

''مگر صاحب ــــــ رنجور جیسا مرنجا مرنج اور بھگت آدمی، جو کبھی اونچی آواز میں بول کر نہ دے، اور کیا پہلوانی داؤ دکھائے ہیں میرے شیر نے۔ مجھے تو ایسا جھانپڑ دیا ہے کہ اب تک دماغ جھنا رہا ہے واللہ!'' ہمراز بھائی نے خوش ہو کر داد دی۔

''مگر یہ ہوا کیا؟'' ایسی پتی ورتا عورت..... ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''اور وہ خود کیسا تھا۔ مر گلا بالکل۔ پیلی چھپکلی ایسا۔ لاحول ولا ــــــ وہی ماچس والا ــــــ'' ان ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے کہا۔

''مطلب یہ کہ انسان کے اندر جو طوفان چھپے ہیں ان کا اندازہ کیسے ہو سکتا

ہے۔'' کمال نے آہستہ سے کہا۔ ''رنجور صاحب کا طوفان۔ مایا دیوی کا طوفان۔ ہم سب کتنے بڑے جوالا مکھی پہاڑ پر زندہ رہتے ہیں۔حد ہے بھئی۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور رنجور صاحب دہلیز میں کھڑے نظر آئے۔

''آیئے آیئے۔'' ہر ایک نے کہا' مگر سب اپنی اپنی جگہ بہت نادم محسوس کر رہے تھے۔

انہوں نے اندر جھانک کر چاروں برف دیکھا۔ ''نہیں۔ میں آپ لوگوں کے تبادلہ خیالات میں مخل نہیں ہونا چاہتا ۔ ایسے ہی ادھر آ نکلا تھا۔ خدا حافظ۔'' دوسرے لمحے وہ غائب ہو گئے۔

شیو پرشاد بھٹ ناگر کئی دن تک گھر نہ لوٹے ان کی بی بی اسی طرح سر پر پٹی باندھے خاموشی سے کپڑے دھونے اور کھانا بنانے میں مصروف ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

چند روز بعد شیو پرشاد بھٹ ناگر رنجور بارہ بنکوی ٹیمز کے کنارے سردی میں ٹھٹھرے ہوئے پائے گئے۔

۶۹

بلبل چودھری بھی پہنچ چکے تھے اور ندالاسلام کے پروگرام میں تعاون کر رہے تھے۔ان کا ٹور بری طرح فیل ہوا تھا' پھر وہ بیمار پڑے۔ان کو بے حد خراب پریس ملا۔ ہر نقاد نے 'پاکستانی' اور 'ہندوستانی' رقص کا موازنہ کر کے سوال اٹھایا کہ ان

میں کیا فرق ہے حالانکہ فنون لطیفہ اور جمالیات کے سرکاری ماہرین ان کے متعلق اپنے عجیب وغریب نظریوں سے پریس کی تواضع کرتے رہے تھے۔

کئی مہینے ڈرامے اور میلے کی تیاری میں گزر چکے تھے۔نذرالاسلام کے لیے اتنا پیسہ اب تک اکٹھا نہ ہوسکا تھا کہ ان کا باقاعدہ علاج کروایا جاتا۔ ''نذرل ایڈ کمیٹی'' میں سرپھرے طالب علموں نے کھیر اور اصفہانی کو اکٹھا کر دیا۔(کم ازکم ان کے نام سرپرستوں کی حیثیت سے پروگرام کی کتاب پر برابر برابر چھپ گئے) کمیٹی کے صدر ہندوستان ٹائمز کی شریمتی ایلا سین تھیں۔ نائب صدر وی۔ کے۔کرشنا مینن۔ان کے علاوہ اس کمیٹی میں امرت بازار پتریکا کے سندر کباڑی بھی تھے اور ڈان کے نسیم احمد بھی۔(یہ اجتماع ضدین ______ نذرل دادا تمہارا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔کمال نے کہا)۔اس مرتبہ پی ایس ایف اور لندن مجلس نے مل جل کر کام کیا۔پچھلے سال دونوں جماعتوں نے مل کر بڑی دھوم دھام سے ایشین اسٹوڈنٹس کانفرنس منعقد کی تھی جس میں عرب اور اسرائیل طلباءکو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا گیا تھا۔(عالمگیر امن اور بھائی چارہ سب فراڈ ہے۔ان لوگوں کے بھرے میں مت آنا۔عامر رضا نے ایک کاک ٹیل پارٹی کے دوران روشن سے کہا تھا)۔

اب ان لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک خیال تھا۔ہم نذرل دادا کو اس بے کسی کے عالم میں مرنے نہ دیں گے۔

پروگرام میں پدما کے سیلاب کی داستان موسیقی اور تمثیل میں پیش کی جا رہی تھی۔گھنٹوں رقص، گیتوں اور مکالموں کی ریہرسل کی جاتی۔ایک ایک نکتے پر

بحث ہوتی۔ کاسٹ بے انتہا لمبی چوڑی تھی ۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیاں۔ بھٹیالی گانے والے ملاح ۔ سیلاب کی زد میں خزاں کے پتوں کی طرح بہتے اور ڈوبتے ہوئے کسان۔ سرکاری لنگر خانے کے سامنے کھڑے ہوئے بھوکے پناہ گزینوں کی قطاریں۔

''افوہ۔ کس قدر خوفناک........'' رومیں ٹک بل نے نیم تاریک آڈیٹوریم میں ایک کرسی پر نیم دراز ہو کر سامنے روشن اسٹیج پر ریہرسل دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ ٹریجڈی سے محفوظ ہوتے ہو۔''

''موت سے تو ہماری بڑی دوستی ہے بل کریگ۔'' طاعت نے اسکرپٹ کے کاغذات ایک طرف ڈال کر فرش پر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہماری پوری نسل تو صریحاً عاشق ہے موت پر۔ تم باہر کے دشمنوں سے لڑتے تھے پر ابھی چند سال ہمارے گھر کے آنگن میں ایک خونریز جنگ ہوئی تھی اور وہ جنگ بہت سارے محاذوں پر اب تک جاری ہے اور روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔ یہ سامنے والی ٹریجڈی ہمارے لیے گویا روزمرہ کے معمولی واقعات میں شامل ہے۔ بہت سوں کو تو اس ٹریجڈی کا احساس تک نہیں۔'' طاعت نے ترشی سے بات جاری رکھی۔ ''اور بہت ممکن ہے ابھی، جس وقت میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں، یہ سیلاب کا منظر مشرقی بنگال میں سچ مچ لوگوں کو نظر آ رہا ہو۔''

چھن چھن کرتے بلبل کے ٹروپ کے افراد ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

''سیلاب کے منظر میں سریلزم چلاؤ تھوڑی سی۔'' اسٹیج کی پروپس کے انبار میں سے سر نکال کر زرینہ چلائی۔

سریلزم چلائی گئی۔ ڈراما پروڈکشن کی جدید ترین تکنیک نہایت زوروں میں ہر طرف استعمال کی جا رہی تھی۔ پیچھے گیلری میں فریدہ لڑکیوں کو دھان پھٹکنے والے ایک گیت کی مشق کرا رہی تھیں:

''____ بیلا نائی رے جولدی جولدی ____ بیلا نائی ____''

بالآخر فرسٹ نائٹ' آن پہنچی گرین روم کی گہما گہمی۔ آخری منٹ کی گھبراہٹ۔ کاسٹ کے افراد کی طرف سے فکر۔ جانے کون کہاں پر کوئی ہاؤلر دے۔ ویسٹ انڈ کی پروفیشنل اسٹیج کے اہم افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ پریس والے سامنے کی قطاروں میں بڑی انہماک سے بیٹھے اسٹیج کو دیکھ رہے تھے۔ ڈرامہ کرنے والے اس شہر کے پریس اور تماشائیوں کے ردعمل کے عادی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کل صبح مانچسٹر گارجین اور ڈیلی اسکیچ میں کس طرح نوٹس نکلیں گے۔

انٹرول کے دوران میں بہت سے لوگ گرین روم میں آ گئے۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیوں کا گروہ بالوں میں پھول اڑسے' سنتھال طرز کے جوڑے بنائے سامنے سے گزرا۔

''یہ سب بنگالی لڑکیاں ہیں؟'' ایک لبرل اخبار کے نمائندے نے کیمرہ سنبھالتے طلعت سے دریافت کیا۔

''یہ ___؟ نہیں ___ وہ سنتھال لڑکی فیروز جبیں ہے۔ اتر پردیش کی رہنے والی۔ یہ دوسری خوبصورت کسان لڑکی عذرا وحید ہیں۔ یہ ادھر والی پنجابی خاتون ہیں۔''

''ہاؤ فے سی نٹنگ ____'' نمائندے نے بڑے صدق دل سے کہا اور اپنی

نوٹ بک پر جھک گیا۔ ''دیکھو! ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔'' اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم ہو تو ان ہی لوگوں میں سے پر آج کل میری برادری سے تعلق رکھتی ہو لہٰذا مجھے کسی اینگل سے کوئی اسٹوری نہ دینا۔ میں میں تم لوگوں کو اس برح یکجا دیکھ کر بے حد پریشان ہوں۔ صبح سے شام تک میری ساری زندگی تمہارے آپس کے سیاسی جھگڑوں اور تنازعوں اور خونریزیوں کی خبریں چھاپتے گزری جا رہی ہے اور اب یہ کیا سلسلہ ہے۔ تم ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہی ہو۔ تم ایک سا لباس پہنے' ایک موسیقی کی آہنگ پر' ایک سے گیت گا رہے ہو۔ یہ کون سا نیا اسٹنٹ ہے۔ ایں؟''

''رابرٹ صاحب'' طاعت نے منہ لٹکا کر کہا'' اسے تو بس اسٹنٹ ہی سمجھو۔''

''اچھا اب تم باہر جاؤ۔ دیکھو اگلا ایکٹ شروع ہونے والا ہے۔''

''پتا نہیں اگلا ایکٹ کیسا ہوتا ہے؟'' اس نے غیر یقینی لہجے کے ساتھ رنجیدہ آواز میں کہا۔

''مجھے تو خود پتا نہیں۔'' طاعت نے گرین روم کے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے اگلے ایکٹ کے متعلق ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے۔''

دروازے میں پہنچ کر اخبار نویس پھر ٹھٹکا: ''ایک بات اور ____ سرف ایک آخری سوال۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' طاعت نے جھنجھلا کر جواب دیا۔'' _ _ خدا را ____ '' طاعت نے گرین روم کا دروازہ بند کیا اور ونگ میں جا کر اپنے کیو کے انتظار میں مصروف ہو گئی۔

دھان کے پھٹکنے اور ساون کی بارش کی صداؤں کے ساتھ ساتھ فریدہ کی حسین بنگالی آواز رفتہ رفتہ اونچی ہوتی گئی:

بیلا نائی رے جولدی جولدی ________

(وقت نہیں ہے جلدی کرو)

او بیلا شونا رکونزا او نچل دھوئی را ________

(سنہری کنیا کا آنچل پکڑ کر دن ڈوب رہا ہے)

جادور کاٹھی ہاتھ لوئی یا آئی لورایت بوجھی

بلا نائی رے جولدی جلدی ________

بیلا نائی ________

۸۰

وقت نہیں ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی کرو ________

وقت نہیں ہے ________

لوگوں کو دیکھو ان کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔ یہ کتنے بدصورت ہیں۔ ان سے بھاگو ___ بھاگو ______ اب میں کس اور جاؤں۔ میرے دشمن میرے دوست۔ میں نے انہیں راستے کے کس موڑ پر چھوڑ دیا۔

جھیل کے پار ندی کے پار سمندر کے پار وہاں کیا ہے۔ ہم نے ٹکٹ تو جنوبی ممالک کا لیا تھا پر کیا تمہیں یقین ہے کہ جہاز والوں نے گائیڈز نے جو بتایا وہی

ٹھیک ہے' یہ میں ہوں ۔ یہ تم ہو ۔ باقی سب میراپروجیکشن ہے ۔ یہ مستقل ''میں ۔
''سامنے دسرخ چھت کا چلپل ہے اوراس میں گھنٹیاں بج رہی ہیں یہاں کس کی شادی ہے؟ بہار آ گئی ہے ۔ پگڈنڈیوں پر پھول جھک آئے ہیں ۔ ابھی وہ دونوں نہیں پہنچے جن کا بیاہ ہوگا ۔

چلتے چلتے میرے پاؤں بھی جل گئے ۔ اس نے رنج سے اپنے پیروں کو دیکھا ۔ ایک سوتر اہوا چاند برغنس گاؤن کے اوپر ڈول رہا تھا' وہ سرحد عبور کرکے ہنستے ہوئے سالزرگ میں داخل ہوئے ۔ یونہی خوشی سے ادھر ادھر گھومتے ہوئے ایک چھوٹے سے سینما ہاؤس میں پہنچے جہاں ایک بیس سال پرانا فلم چل رہا تھا ۔ بیس سال پرانا فلم دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے ۔ باہر آ کر وہ ایک اور سرائے میں جا بیٹھے، وہ اپنی ٹانگیں کرسی پر رکھ کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی ۔ ایپرن سے ہاتھ پونچھتا ہوا خوش مزاج دھندلی آنکھوں والا بوڑھا ان کے سامنے آیا ۔

''یہ شاہان اودھ کا خاندان ہے ۔'' وہ خوب ہنسا ۔ ''تم جانتے ہو شاہان اودھ کون تھے؟'' انہوں نے کاغذ کے نیپکن پر اپنے نام اکٹھے لکھے ۔

وقت نہیں ہے ـــــــ وقت نہیں ہے ـــــــ

''ہلو بھائی جان ـــــ '' دروازہ کھلا اور زرد تنگ موری والی پتلون پہنے ایک بے حد حسین لڑکی ان کی میز کی سمت بڑھی ۔ ''بھائی جان آپ کا تار مجھے آج ملا ۔''

''آپ کون ہیں؟'' روشن نے پوچھا ۔

''یہ میری کزن ہیں ـــــــ شارخ سلطان پیرس میں ریڈیالوجی پڑھتی ہیں ۔''

''بھائی جان یہ کون تھیں؟'' روشن کے باہر جانے کے بعد نووا رولڑکی نے دریافت کیا۔

''یہ ____ ان کو بھی میری کزن ہی سمجھو''

''ہائے اللہ ____ آپ کتنے مزاحیہ ہیں ____ پر یہ کافی مغرور سی معلوم ہوتی ہیں ____ ایک دم اٹھ کر باہر کیوں چلی گئیں؟''

''مغرور تو نہیں ہائی برو ضرورت سے زیادہ ہیں۔ گرٹن کالج انٹرنیشنل سٹ سے ملاقات وغیرہ جانتی ہو تم یہ ٹائپ؟''

''ہائے اللہ' کس قدر دلچسپ۔'' شارہ خ سلطان نے مسرت سے کہا۔

اس نے ایک گہری، تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ یہ سالز برگ ہے اور مئی کا مہینہ۔ میں تمہیں ایک روز اپنی کہانی سناؤں گا۔

وقت نکلا جا رہا ہے ____ جلدی کرو۔

بھاگو۔ بھاگو۔ بھاگو۔

باہر ایک امریکن مشنری آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ درختوں کے نیچے کرسیاں پڑی تھیں ارگلی کی محراب کے نیچے کوئی اکارڈین بجا رہا تھا۔ سڑک کی دیوار پر بیٹھے بیٹھے اس نے بڑے اخلاق سے مشنری کی طرف ہاتھ بڑھایا: ''ہاؤ ڈو یو ڈو۔'' اس نے کہا۔

''کیا تمہیں اپنی روح بچانی ہے؟'' مشنری نے بے اندازہ اہمیت اور رازداری کے لہجے میں کہا۔ گویا اگر آپ کو مضبوط جوتے بنوانے ہوں تو ہماری فرم میں تشریف لائیے۔

''امریکن؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں مجھے پیٹر کہتے ہیں۔''

''بیٹھ جاؤ پیٹر۔ کہو اچھے تو ہو۔''

''جی تھینکس ـــــــ میں یہاں سے چھتیس گڑھ جا رہا ہوں۔ ہم نے وہاں ایک نیا مشن قائم کیا ہے۔'' پیٹر نے آسانی خوشی سے بے حال ہو کر بتایا۔ ''میں پرنسٹن میں پڑھتا تھا۔''

''ہاؤنڈ رنگل۔''

''میں پروفیشنل بیس بال کا کھلاڑی بننے کی ٹریننگ لے رہا تھا جب میں نے دفعتاً کال سن لی۔''

''کیا سن لی؟''

''کال۔''

''تمہیں ایک بات بتاؤں پیٹر ـــــــ میں نے بھی کال سن لی ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ تو خداوند خدا کی بڑی مہربانی ہے۔ کب سنی؟'' پیٹر نے دلی مسرت سے پوچھا۔

''ابھی ابھی۔ چند لمحے پہلے تقریباً نو بج کر پندرہ منٹ پر۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''یا شاید نو بج کر بارہ منٹ تھے۔'' اس نے سڑک کی دوسری طرف سرائے کے جگمگاتے دریچے کی اور نظر اٹھائی' پھر اس نے ہنس کر مشنری کو دیکھا' وہ بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے اسے تکتا رہا۔

۸۱

سوتا ہوا چاند تیرتا تیرتا دریچے کے عین سامنے آ کر ٹھہر گیا اور اس کی روشنی سے خاموش کمرہ دفعتاً جگمگا اٹھا۔ برابر کے اسٹوڈیو میں رنگا ناتھن مردنگم بجا رہے تھے۔ براؤن بالوں، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والے ڈچ انڈونیزین لڑکے، جو سریکھا کے ٹروپ میں شامل تھے، ناچنے کے بعد لکڑی کے فرش پر کاہلی سے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ طاعت دریچے میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوہے کو سیسہ پلا دیا ہو۔

ہاؤ اللہ آپ کتنا عمدہ گاتے ہیں۔

ہائے اللہ اسکینگ کا لباس آپ پر کتنا سجتا ہے۔

ہائے اللہ ــــــــــــــــ

فیروز دوسرے دریچے میں پہنچی جانے کاہے کی نقل کر رہی تھی۔ طاعت نے انیچیوں کی طرح ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔

برج باسیوں میں شیام

برج باسیوں میں شیام بنسری بجائے جا ــــ بجائے جا ــــــــ

طاعت نے یکلخت الاپنا شروع کیا۔

''پھر بے وقت کی راگنی۔'' گیروز نے غصے سے طاعت کو دیکھا۔

''روشن آ گئی۔'' نرگیش نے دریچے میں سے جھانک کر اطلاع دی۔

''ہوا میں پھولوں کی مہک اڑ رہی ہے اور یہ مئی کا مہینہ ہے۔ ہم اس

اندھیرے کمرے میں حسب معمول الوؤں کی طرح بیٹھے بول رہے ہیں ــــــــــ ٹووٹ ـــــ ٹوہو ـــــــ آؤ بہن روشن، تم بھی آؤ ـــــ "طلعت نے اسے صدق دل سے خوش آمدید کہا۔

"تم لوگ۔" اس نے شک وشبے کی نظروں سے لڑکیوں کو دیکھا۔ "تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ میں سرحد کے پار تنہا رہ گئی ہوں۔ سرحد کے ادھر لوگوں کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔ یہ کتنے بدصورت ہیں۔ میں چاروں اور گھومتی ہوں۔ سرحد کے ادھر لوگوں کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔ یہ کتنے بدصورت ہیں۔ میں چاروں اور گھومتی ہوں۔ کہیں جگہ تلاش کرسکوں جہاں بیٹھ کر روؤں۔"

وہ لکڑی کے فرش پر بکھرے ہوئے سازوں کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم ابھی کون سا گانا گارہی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"یونہی ـــــ بکواس تھی ـــــــ لکھنو ریڈیو کا ایک پرانا گیت۔" طلعت نے جواب دیا۔

"مجھے وہ گیت سناؤ۔"

"میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو؟" طلعت نے فرش پر چاروں طرف ناچتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"تم لوگ اتنے مغرور کیوں ہو؟" وہ زور سے چیخی۔

گلی کے نیم تاریک محراب میں سے نکل کر کملا دریچے کے پاس آگئی۔

"ٹھہرو روشن، میں تم کو ایک گیت سناؤں گی، گندھروید کا سام گیت۔ رنگا نا تھن" طلعت نے ناچتے ناچتے رک کر آواز دی "مردنگم اور زور زور سے کیوں

نہیں بجاتے؟''

''تم روتی کیوں نہیں؟'' کملا نے روشن کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا ایسا نہیں ہوتا کہ جب لوگ انہیں چھوڑ کر آگے چلے جاتے ہیں تو لڑکیاں روتی ہیں۔'' اس نے اداسی سے سوال کیا۔

''دیکھو'' روشن نے کملا کو مخاطب کیا'' اتنے برسوں تک میں ایک گھر بنانے میں جٹی رہی لیکن ٹھیک نو بج کر پندرہ منٹ پر وہ گھر ٹوٹ کر زمین پر آ گیا۔''

''کاہے؟ کیسے؟'' طلعت نے پوچھا۔

''میں نے اسے خود توڑ دیا۔ میں نے بڑے زور سے اسے ایک ٹھوکر لگائی اور اڑا اڑا دھم' وہ ایک دم نیچے آن گرا۔ اب میں بڑی بےفکر ہوں۔ اب میں آرام سے سویا کروں گی اور کوئی گھر تعمیر نہ کروں گی۔ اللہ حافظ۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ''اب میں تمہارے بدصورت' اداس اجاڑ مکانوں میں رہا کروں گی۔''

ڈچ انڈونیزین لڑکے ایک جمائی لے کر دریچے میں جا کھڑے ہوئے۔

''میں نے اس گھر کے ٹیلی فون کے تار بھی کاٹ دیے ہیں۔'' چلتے چلتے اس نے دروازے میں سے سر نکال کر کہا اور زینے کی اور مڑ گئی۔

طلعت بھی دریچے میں آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ باہر بےپایاں اندھیرا ہے اور اندھیر مہربان ہے اور اندھیرا ہمارے ہر دکھ' ہر غم' ہر شکست کو اپنے میں سمیٹ لیتا ہے کیونکہ آخر میں ہم خود اس بےپایاں اندھیرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

گو ہمیں کبھی اس طرح نہ مرنا چاہیے۔

''ہلو ـــــــ'' اچانک فیروز نے گلی میں آکر دریچے میں سے اندر جھانکا۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

''میں دھوبن کے یہاں گئی تھی۔''

''بہت اچھا کیا تھا۔''طاعت نے بے دلی سے کہا۔

''اب ان کا۔ تمہارے بھیا صاحب کا کیا کیا جائے؟''اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ڈارلنگ ـــــــ کافی میں تم نے پھر کتھا گھول دیا۔''اسٹور کے پاس سے کملا چلائی۔

''تم سے کس نے کہا ہے کہ بکری کی طرح ہر وقت پان چبایا کرو۔''طاعت نے گرج کر جواب دیا۔''سارے میں مار پان کے لوازمات بکھرے ہوئے ہیں۔''

''ڈارلنگ۔''سریکھا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خبر سنائی۔''ساجدہ آپا۔''

''ـــــــ نیچے گیلری میں کھڑی پوچھ رہی ہیں کہ اپنا افسانہ کب تک لکھ کر لائیں۔ یہ کون سا نیا رکٹ تم نے چلایا ہے ـــــــ''کملا نے غصے سے مطالبہ کیا۔

''دراصل ـــــــ دراصل کملا ـــــــ برلین کے واقعے کے بعد سے میں ساجدہ آپا کی رائے گوپال بنی ہوئی ہوں۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ وہ اپنے مختلف تجربات اور تاثرات پر ایک افسانہ لکھنے جارہی ہیں تو میں نے

______میں نے ___ ان سے کہا کہ میں اسے کسی اردو رسالے میں چھپنے کے لیے بھجوا دوں گی۔''طاعت نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔''از برائے خدا ان سے کہہ دو کہ مجھ پر اپنڈی سائیٹس کا حملہ ہوا ہے اور مجھ ہسپتال لے گئے ہیں۔''

''ادھر آؤ تم سب۔''نرگیش نے گیلری میں سے آواز دی۔

ریرسل روم میں ساجدہ بہن ایک سیٹ پر بیٹھی تھیں۔

''السلام علیکم____ پیاری بہن''انہوں نے گرم جوشی سے کہا۔

''وعلیکم السلام پیاری بہن______ بیٹا قیس کس حال میں ہے۔اور شیر لو ہے کے جال میں ہے____''طاعت نے نعرہ لگایا۔

''ہائے بس تم ہر وقت مذاخ کرتی ہو۔''انہوں نے کہا۔

''اب اپنا افسانہ پڑھ کر بھی سناؤ گی' ساجدہ بہن؟''طاعت نے لرز کر سوال کیا۔

''آہ____ یہ کچھ یادیں ہیں میرے انگلستان کے زمانہ قیام کی۔''انہوں نے بیگ میں سے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔''تم تو مجھے سمجھتی ہو نا۔''

''لا ساجدہ بہن____ کافی پیو____''فیروز نے مہمان نوازی شروع کی۔

''ہرگز نہ پیجیے گا۔اس میں کتھا گھلا ہے۔''کملا نے آگاہ کیا۔

''اجی کتھا ہو یا نہ ہو' کیا فرق پڑتا ہے' دنیا کی ہر چیز فیراڈ ہے فیراڈ۔''فیروز نے سخت فلسفیانہ انداز سے کہا۔

طاعت کو غصہ آ گیا' وہ آتش دان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ہوا میں ہاتھ ہلا

کراس نے کہنا شروع کیا:

میز ہل جائے گی اور کافی چھلک جائے گی، مجھے معلوم ہے دوست

میز میں پیر لگا۔ میز کو جھٹکا سا محسوس ہوا۔

ہل گئی میز تو کافی چھلکی، کافی چھلکی تو مگر گر نہ سکی

میز کا فعل عبث

دونوں میں کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں

گھور کر دیکھ نہ یوں دوست مجھے

بدتمیزی سے بہت دور رہا کرتا ہوں

اتفاقات کے یہ گہرے نکات

میز تو میز ہے گردوں کو ہلا دیتے ہیں

اور سیارے چھلک جاتے ہیں

ایسے ہی جیسے کہ کافی چھلکے

ساجدہ بہت خوش ہوئیں۔ ''اس کا عنوان کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''فیراڈ ____ ہی سمجھ لو ____ تال جسن کی تازہ ترین تصنیف ہے۔''

''اچھا، سریکھا دیوی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ انہوں نے فون پر مجھے اسی وقت کا اپوائنٹ منٹ دیا تھا۔''

سریکھا دوسرے کمرے میں ڈچ اینڈ ونیزین رقاصوں کو ریہرسل کرا رہی تھی۔

''تم اپنے حواس میں ہو۔'' طلعت نے اس کے پاس جا کر غصے سے کہا۔ ''یہ تم لوگوں کو ملاقات کا وقت کب سے دینے لگیں؟''

''روشن کو تم نے کہاں غائب کر دیا؟'' وہ گرجی۔

''مجھے کیا معلوم۔ میں ہر سے اس کے پیچھے پیچھے تو نہیں پھر سکتی۔''طلعت نے جواب دیا۔

''ہائے کس قدر دلچسپ۔'' ساجدہ بہن نے دروازے میں پہنچتے ہوئے کہا۔'' میری ہمیشہ تمنا تھی کہ بیک اسٹیج زندگی دیکھوں۔''

''کیا ذلیل تمنا تھی۔''طلعت نے غصے سے دانت پیستے ہوئے دل میں کہا۔

''نمستے جی۔''سریکھا نے بے حد سنجیدگی سے ساجدہ آپا کے قریب آ کر کہا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔''اس نے فوراً انٹرویو لینے والا انداز اختیار کیا۔

''تمہاری رائے نے سب کا پٹرا کر دیا۔''ساجدہ آپا کے جانے کے بعد کملا نے طلعت سے کہا۔

''ایں؟''

''ہاں۔مثلاً اگر تم نے ساجدہ بہن کو رائے نہ دی ہوتی کہ وہ فری ورلڈ کی لیڈری چھوڑ کر افسانہ نگاری پر اتر آئیں تو کیا ہوتا؟''

''تو وہ فری ورلڈ کی سب سے بڑی لیڈر رہوتیں۔''طلعت نے اطمینان سے جواب دیا۔

''لیکن اب وہ انسپریشن کی تلاش میں رومینٹک جنگلوں میں گھومتی ہیں۔''فیروز نے کہا۔

''جنگلوں میں؟'' کملا نے پوچھا۔

''ہاں جنگل یعنی ووڈلینڈ۔''

''سینٹ جانز ووڈلینڈ؟''طلعت نے سوال کیا۔

''کمینے پن پر مت اترو۔''فیروز نے کہا۔

''دراصل سینٹ جانز ووڈ کے اسٹوڈیو فلیٹس میں تبدیل شدہ اصطبلوں اوران میں رہنے والے کلاکاروں کی صحبت نے ان کی نفسیات پر بہت پریشان کن اثر ڈالا ہے اور دوسری بات یہ____'' کملا نے خفگی سے کہا'' کہ اگر تم نے روشن کو کوئی سیدھا راستہ دکھایا ہوتا تو وہ کب گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کر لیتی۔''

''وہ لامحالہ گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کر لے گی، وہ فلسفی ضرور ہے مگر یہ نہ بھولنا کہ بورژوا فلسفی ہے۔''طلعت نے کہا۔''ارے جب میاں بجرے باگوں میں آئے____مالی بھئے اگوانی_____''اس نے ڈھول اٹھا کر الاپنا شروع کر دیا۔

''اور میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سارا اسرار ہے کیا آخر؟''سریکھا نے اندر آتے ہوئے سوال کیا۔

''اتفاقات کے یہ گہرے نکات۔''سریکھا نے سیٹی بجائی۔

''میں دھوبن کے یہاں جا رہی ہوں۔''فیروز نے دریچے میں سے باہر گلی میں کودتے ہوئے کہا۔

جاڑے آئے اور برف سے سارے راستے سفید ہو گئے۔ اسٹیٹ گارڈٹ' ترویز' ویزرن۔ ساری جگہوں کو برف نے ڈھانپ کیا۔ کرسمس کے پنٹو مائم شروع ہوئے۔ لوگوں نے جنوب کی طرف روانہ ہونا شروع کیا۔ اسٹرن برگ میں چار خانے دار موزے پہنے غریب جرمن لڑکیاں کرسمس کی خریداری کر رہی تھیں اور امریکن سپاہی انہیں اسگریٹ کے ڈبے تحفے میں دے رہے تھے۔ نوتر دام کی راہبات سین کے کنارے کنارے اپنی بھگیاں ہانک رہی تھیں۔ ونٹر سپورٹس کا زمانہ آیا۔ برف کے خطرناک حصوں کو جالیاں لگا کر علیحدہ کر دیا گیا۔ وکی بام نے شاید کوئی نیا ناول لکھ لیا تھا اور برف بڑی مہربان تھی۔

پھر برف پگھلی۔ درختوں میں نئی کونپلیں نکلیں۔ ساری کائنات پر شدید' خالص رنگ بکھر گئے۔

خزاں آئی۔ جنگلوں میں سرخ آگ ایسی لگ گئی۔ تیز سرخ پتوں کے انباروں نے پگڈنڈیوں اور سڑکوں کو اپنے میں چھپالیا۔ ہوا کی نیلاہٹ میں زردی شامل ہو گئی۔

چلتے چلتے تھک کر روشن راستے میں ایک جگہ ٹھہر گئی۔ سامنے ایک پرانا چرچ تھا' وہ غیر ارادی طور پر قبروں کے کتبے پڑھنے لگی' پھر وہ اندر گئی۔ چپل خالی پڑا تھا۔ گھسے ہوئے اوک کی بنچیں۔ پستمہ دینے کا سر دحوض۔ دیواروں پر ان کرنلوں اور کپتانوں کی تاریخ وفات کی پیتل کی تختیاں لگی تھیں جو اس قصبے میں پیدا ہوئے اور سلطنت کی حفاظت کرتے ہوئے جھانسی اور کانپور اور رزمک میں کھیت رہے۔ اس نے بے دھیانی سے ادھر ادھر گھومتے ہوئے چند سکے فنڈ کے ڈبے میں ڈال

دیئے۔

''ہلو۔میری بچی ـــــ''بہت بوڑھے پادری نے محبت سے کہا' وہ پیچھے درختوں سے نکل کر آیا تھا اور لنگڑا تھا۔

''ہلو ـــــ گڈ ایوننگ ـــــ''اسے بے حد ڈر لگا۔اس نے مسکرا کر چند اور سکے بکس میں ڈالے اور باہر آ گئی۔کیا فضول بات ہے۔چرچ بنا رکھے ہیں۔ اس نے جھنجھلا کر کہا' پھر اس کا جی چاہا کہ واپس جائے اور ایک اوک کی بنچ پر سر رکھ کر پڑ سوتی رہے۔

اس کے ساتھ وہ گھنے جنگلوں اور ہرے جزیروں میں سے گزری تھی۔طویل مرمریں گیلریوں میں چلی تھی۔اونچی سفید سیڑھیوں پر چڑھی تھی جن کے اختتام پر رومن ستونوں میں سے تیرتا ہوا چاند یکلخت سامنے آ جاتا تھا اور چاروں اور سائپرس کے درخت تھے۔آسٹریا۔یونان۔اٹلی۔اب وہ پھر مانوس پرانے انگلستان میں موجود تھی۔

لندن میں وہ سریکھا کے مکان کی بالکنی پر جھکی رہی۔

''وہ سب ایکٹنگ تھی۔''اس نے بڑے باوثوق طریقے سے عامر رضا سے کہا۔

''پتا ہے۔''عامر رضا نے اطمینان سے جواب دیا۔ان کو ہمیشہ سے ہر بات کا پتا تھا۔خود ان کو نروان ملنے والا تھا نروان کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔

''مجھ میں بہت کمال کا اسٹیج سنس ہے۔''

''معلوم ہے ـــــ تم نے بھی کالج میں ایلوکیشن سیکھا ہے اور اسکالا تھیٹر

میں تم ــــــــ''

''ہاں ــــــ'' اس نے خوشی کے لہجے میں بات کاٹی ــــــ ''اور اسی لیے اب میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے مسرت ہے کہ تم نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ تم بہت سمجھ دار ہو ــــــــ دراصل غلطی سراسر میری ہی تھی۔ میں صدق دل سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔''

''میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔'' اس نے بہت فراخ دلی سے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں بالکنی پر جھکے سیٹی بجاتے رہے۔

۸۳

سوتا ہوا چاند کاہلی سے چاروں اور تیرا کیا۔ بالکنی کے نیچے سریکھا بیٹھی تھی۔ وہ اور زرینہ نئے اسٹیج ڈیزائن بنانے میں مصروف تھیں۔

''وہ دیکھو۔ چاند مر رہا ہے۔'' اس نے اچانک انگلی اٹھا کر روشن کو مخاطب کیا۔

''ہاں۔'' روشن نے پہلی بار دیکھا۔ چاند مر چکا تھا اور اس کی زرد لاش رات کی ہوا کے رحم و کرم پر ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔

''تم نے دیکھا۔'' سریکھا نے آہستہ آہستہ کہا ــــــــ ''یہ سب اسٹیج کی سینری تھی۔ ڈیزائن۔ ڈیکور۔ کینوس کے رنگین پردے۔ پردیس۔''

گیلری میں لفٹ آن کر رکا۔ طلعت اور نرگیش اندر آئیں۔ وہ نرملا کو دیکھنے ڈہرسٹ گئی تھیں اور واپسی میں انہوں نے دیکھا کہ ہیزل میئر کا جنگل وہاں نہیں

تھا۔تب طاعت کو معلوم ہوا کہ موسموں کے ساتھ ساتھ اس جنگل کی جائے وقوع بدلتی رہتی ہے۔ہیزل میر کا جنگل کبھی ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتا۔

کمرے میں وہ سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔کملا نے روشن کو غور سے دیکھا' گویا اسے پہچاننے کی کوشش کرتی ہو' پھر وہ اپنی اور سریکھا کی بھرت ناٹیم کی ملبوسات کو الٹنے پلٹنے لگی۔

''کملا______ ''طاعت نے دفعتاً کہا۔''لوئی مک نیس کی وہ نظم سناؤ۔''

''کون نظم؟''

''وہی____ جو'خزاں نامے' میں شامل ہے۔''

کملا آتش دان کے مصنوعی انگاروں کو دیکھتی رہی' پھر اس نے آہستہ آہستہ کہا:

"I loved my, with a platform Ticket"

A handbag, a pair of stockings of paris and

I love her long

I loved her between the lines and against the clock,

Not until death

But life did us part

I loved her with paacocks eyes

and the wares of carthage.

With blasphemy, camaraderie,

and bravado and lots of other stuff.

I loved her with my office hours, with

flowers and

Sirens,

With my budget, my latchkey

and my daily bread;

And so to London and down the

ever-moving Stairs."

سب خاموش بیٹھے رہے۔

"کملا ______ "طلعت چلائی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ قریب آ کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں یاد ہے۔" کملا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جولائی یا اگست کی ایک شام' جب بارش ہو کر تھمی تھی' گل فشاں بالکل سنسان تھی۔ سب لوگ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں اور نرملا اور تم اکیلے برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور شام کی نیلی روشنی سارے میں پھیل گئی تھی اور اس سمے دو سنیاسنیں منتر پڑھتی پھاٹک کے اندر آ گئی تھیں اور مصر تھیں اور مصر تھیں کہ ان کو دکھشنا دی جائے اور بچوں کی طرح ہمیں ایکا ایکی یہ خیال آیا تھا کہ یہ چڑیلیں ہیں' ہم اتنے بڑے گھر میں تنہا ہیں' ابھی یہ ہمیں شراپ دیں گی' ابھی کچھ ہو گا' اس سناٹے میں کوئی خوفناک انجانی بات ہو گی۔"

''پھر وہ جاپ کرتی اور راجستھانی میں بڑبڑاتی واپس چلی گئی تھیں۔ ہم نے خوفزدہ ہو کر انہیں زور سے ڈانٹا تھا۔'' طاعت نے آہستہ آہستہ کہا۔ ''اور پھر ہمیں مہوے کے سائے سے بھی ڈر لگا تھا۔ ہم سہمے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے آیتہ الکرسی پڑھی تھی اور تم نے اپنا وہ اکلوتا اشلوک دہرانا چاہا تھا جو تمہیں کبھی یاد نہ ہو سکا۔''

''وہ بڑی سنسان شام تھی۔'' کملا نے یاد کیا۔ ''تم نے کبھی سوچا ہے' ساری شامیں بہت سنسان ہوتی ہیں۔ ان میں ایسی بے پایاں اداسی ہوتی ہے۔ شام جب دونوں وقت ملتے ہیں۔ جب ہم جگمگاتے کمروں میں ہنستے ہیں۔ اس وقت بھی دفعتاً بڑے رنج' بڑی پشیمانی کا احساس ہوتا ہے۔''

''پھر ہم تینوں خاموش سڑک پر سے گزر کر سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے تھے اور وہاں لاج کے ساتھ مل کر اپنے اس طرح خوفزدہ ہو جانے پر بہت ہنسے تھے۔'' طاعت بولی۔

''وہ سنیاسنیں ہمیں ہر جگہ' ہر موڑ پر ملتی ہیں' وہ ہمیں بددعائیں دیتی مہوے کے سائے میں غائب ہو جاتی ہیں۔ اندھیری راتوں میں میں نے ان سنیاسنوں کو چلا چلا کر روتے سنا ہے۔'' کملا نے کہا۔

دوسرے کمرے میں زور زور سے مردنگم بجنا شروع ہو گیا۔ آج رات سریکھا اور کملا کا ناچ ہے۔ سارا عالم دیکھنے کے لیے آئے گا۔ طاعت کو خیال آیا۔

روشن اس کے قریب آئی۔ ''میں واپس جا رہی ہوں۔ تم لوگ مجھے کبھی کبھی خط لکھا کرو گے؟'' طاعت کو ایسا لگا جیسے اس کی آواز میں التجا تھی۔

''ہاں۔ہم تمہیں ہر سال عید اور سال نو کے کارڈ بھیجیں گے۔''طاعت نے کہا۔(کیا انجام بس اتنا ہے۔کچھ عرصے تک ان سب کے کرسمس کارڈ روشسن کے پاس جائیں گے مگر وہ بھی بند ہو جائیں گے۔راہ میں جب مختلف خرابوں کے وسیع ویرانے اور سیاسی حد بندیاں حائل ہوں تو کہاں تک ان خوشگوار تعلقات کو گھسیٹا جاسکتا ہے۔ہاں۔ہم تمہیں کبھی بھولیں گے نہیں روشن ڈیئر۔اس نے دہرایا۔''ہم سب ایک شراپ کے زیر اثر ہیں۔''

مردنگ کی آواز تیز ہوگئی۔نادر دام تاندی رے نا ____ سریکھا چھن سے اسٹیج پر آئی۔اب حسب معمول میں ناچوں گی۔اس نے سوچا۔کملا ناچے گی۔سب ناچیں گے۔ای ریوجتی سورم۔شبدم۔شو جاری رہے۔ایسی کیا خاص بات ہے۔سوال یہ ہے کہ کیوں جاری رہے۔کڑ تک تام تت تام۔کڑ تک تئ تت تئ۔کل مجھے ٹیلی ویژن پر ناچنا ہے۔پرسوں ہالینڈ جا کر ملکہ جولیانہ کے لیے رقص کرنا ہے۔دریا بہے جارہا ہے۔ڈلن ٹامس مر گئے۔بلبل چودھری مر گئے۔روشن ____ افسوس کہ وہ بھی شاید مر گئی۔

اور اب ہال خالی پڑا ہے۔صرف رادا کی چند لڑکیاں اور لڑکے ادھر ادھر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔اخباروں کے نمائندے کاغذ پنسل ہاتھ میں لیے سریکھا دیوی کے قیمتی الفاظ سننے کے لیے کان لگائے کھڑے تھے۔کارڈ بورڈ کے سیٹ افراتفری کے عالم میں بکھرے ہوئے تھے۔

''رقص میں میری زندگی ہے۔''سریکھا نے رامیشورم کے مندر کی سیڑھی پر پیر

ٹکاتے ہوئے انٹرویووالی شائستہ اور متوازن آواز میں کہنا شروع کیا۔

"خداوندا ______ سریکھا۔" طاعت نے بے انتہا بور ہو کر جمائی لی۔

"ہش ______ میں پریس کو بیان دے رہی ہوں۔"

اخبار کے رپورٹر مسحور ہو کر اسے دیکھتے رہے۔

طاعت نیم تاریک آڈیٹوریم کی ایک نشست پر بیٹھ کر اونگھنے لگی۔ یہ ننھا سور مارکیٹ گیا تھا۔ یہ ننھا سور مارکیٹ گیا۔ یہ ننھا سور گھر پر رہا۔ اس ننھے سور نے بھنا گوشت کھایا۔ یہ ننھا سور سارے راستے روتا ہوا گھر واپس آیا۔ وی وی وی وی وی۔

۸۴

وی وی وی وی ______ شور اب آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ چمپا نے دریچہ بند کر دیا اور ہوسٹل سے باہر نکل آئی۔ سارے میں سہ پہر کا سناٹا طاری تھا کل کالج بند ہو جائے گا۔ اب میں کہاں جاؤں گی؟ کیا کروں گی؟ (زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے۔) یہ تجربہ بھی غالباً ناکام رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دور دور تک پھیلے ہوئے باغوں کو دیکھا۔ کیمبرج کی ہرایالی پر نیلی گھٹائیں چھائی تھیں، وہ بیکس پر سے گزرتی لائبریری کی طرف جانے والی پلیا پر آ گئی۔ "شولوم علیخم۔" ایک یہودی طالب علم دوسرے یہودی طالب علم کو، جو پلیا پر بیٹھا تھا، سلام کرتا ہوا سائیکل پر گزر گیا۔ "تم پر خدا کی رحمت ہو۔"

''تم سب پر خدا کی ______ رحمت ہو۔'' چمپا نے دل میں دہرایا۔

- - - - - - - - - - - - - -

زندگی میں بذات خود اتنی شدت ہے۔ اس کے لیے فلسفے کی فروعات کی کیا ضرورت ہے اور مسرت کی تلاش کے سلسلے میں ہم کس قدر کمینے بن جاتے ہیں۔ یہودی طالب علم، جو پلیا سے درخواست کی۔ ''میں تمہارا اسکیچ بناؤں گا۔'' وہ بیٹھ گئی تا کہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ ''آج آخری دن ہے۔ کل تم جانے کہاں چلی جاؤ گی۔ تمہارا اسکیچ میں اپنے پاس رکھوں گا۔'' اس نے تندی سے پنسل چلاتے ہوئے کہا۔

چمپا نے جھانک کر دیکھا۔ اسکیچ بڑا خراب تھا، مگر وہ بڑے صبر اور اخلاق سے چپکی بیٹھی رہی۔ شاید میری اصل شکل ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ ''یہ ناکام مصور ہی شاید میری شبیہہ اتارنے میں دراصل کامیاب رہا ہے۔''

''پسند آئی تم کو تصویر۔'' یہودی لڑکے نے خوشی سے پوچھا۔ ''میں تم کو مسرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تم کو کس طریقے سے خوش کروں؟'' وہ بڑا پر خلوص نظر آیا۔

''تم مجھے خوش نہیں کر سکتے۔'' چمپا نے دفعتاً بڑی کرختگی سے کہا۔ (ہم سب کمینے ہیں۔ مسرت کی تلاش میں ہماری چار سو بیس تو دیکھو۔ اس نے دل میں س وچا۔

''وہ کون ہے؟'' لڑکے نے یکلخت بے حد رنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ''وہ کون ہے جو تم کو مسرت بخشے گا؟''

''یہ بڑا بے رحم اور کمینے پن کا سوال ہے۔''

''معاف کرنا۔'' اس نے اداسی سے کہا۔

''اچھا خدا حافظ شولوم علیخم۔'' چمپا نے مسکرا کر کہا۔

''شولوم علیخم۔'' لڑکے نے جواب دیا اور اسے ندی کی سمت جاتے ہوئے دیکھتا رہا جدھر مائیکل اور ڈینس کھڑے تھے۔

''سرل اب تک نہیں ملا؟'' ڈینس نے سراسیمگی کے عالم میں چلا کر پوچھا۔

''نہیں''

''کہاں غائب ہو گیا سرل'' ڈینس نے کہا۔ ان دونوں نے غصے سے چمپا کو دیکھا۔

''میں سرل کی ذمہ دار نہیں ہوں ڈینس۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا۔

''اوہ چمپا' مجھے معاف کر دینا۔ کیا میں تم پر برس پڑا تھا؟'' مائیکل نے عجز سے کہا۔

''نہیں مائیکل۔ ٹھیک ہے۔''

''آج آخری دن ہے چمپا۔''

''ہاں۔''

''چلو چل کر آخری مرتبہ کو یہ نور میں کھانا کھا لیں۔''

''آج آخری۔'' سب یہی دہرا رہے تھے' وہ اس جذباتیت سے بچنا چاہتی تھی مگر یہ ناممکن تھا۔ یہ واقعہ تھا آج کیمبرج میں طالب علمی کی زندگی کا آخری دن تھا۔

ریسٹوران میں بیٹھ کر انہوں نے سرل کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے تو روشن تک کا ذکر نہیں کیا۔ لوگ اتنے مہربان کیوں ہوتے ہیں؟ ایک دوسرے سے اتنی

ہمدردی کیوں کرتے ہیں؟ یہ لوگ میرے بھی بہت سخت بہی خواہ ہیں۔اب میں پھر کمینے پن پر اتر آئی ہوں۔

چند روز قبل اس نے برسبیل تذکرہ روزماری کی خیریت دریافت کی تھی۔

''اچھی ہے۔''سرل نے جواب دیا تھا۔''وہ غریب تو بیماری کی حالت میں بھی نوکری کرتی ہے تا کہ میں کیمبرج میں تعلیم مکمل کرسکوں۔''

''اور ____ دوسری لڑکیوں سے عشق لڑا سکو۔''چمپا نے بے دھیانی سے کہا تھا۔ یہ سن سرل چھلانگ لگا کر کھڑکی سے باہر کود گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس روز سے سرل غائب تھا۔ کالج کے کوادرینگل میں' گلیوں میں'ندی کے کنارے'قہوہ خانوں اور کتابوں کی دکانوں میں کہیں سرل کا پتا نہ تھا۔

دفعتاً وہ باہر بارش میں بھیگتا دکھائی دے گیا۔ ڈینس لیک کراس کی طرف دوڑا' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا' پھر مائیکل اس کو بلانے کے لیے گیا' مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ طالب علم برساتیاں اوڑھے خراماں خراماں چل رہے تھے۔

''اندر چلو۔ یہ کیا بچپنا ہے۔''چمپا اٹھ کر باہر گئی اور ڈانٹ کر اس سے کہا۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''بکومت۔''

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کیسے آؤں اندر۔''اس نے آہستہ سے ڈینس سے کہا۔

چمپا کے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی۔ ایک ہفتہ قبل اسی جگہ پر اس نے سرل سے کہا

تھا: تمہاری بی بی اس لیے ملازمت کرتی ہے کہ تم دوسری لڑکیوں سے عشق لڑاؤ۔

پھر وہ چمپا کی طرف مڑا: ''تم کو غالباً یہ معلوم کر کے دلچسپی ہو گی کہ روز ماری نے مجھے اس ہفتے چیک نہیں بھیجا کیونکہ میں نے اسے اطلاع دی تھی کہ میں نے اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تمہارا ____ تمہارا دماغ یعنی کہ ____ بالکل چل گیا ہے ____'' چمپا نے ہڑبڑا کر کہا۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ مائیکل اور ڈینس اسے انتہائی نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ نفرت جو اس نے تہمینہ نرملا اور شانتا کریگ کی نگاہوں میں دیکھی تھی۔

''ہاں۔'' سرل نے اطمینان سے جواب دیا اور برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

ڈینس اور مائیکل خاموشی سے ریستوران میں واپس چلے گئے۔

بارش چمپا اور سرل پر برستی رہی۔

''چلو یہاں سے چلیں۔ پانی میں بھیگنے کی کون سی تک ہے۔''

''ایسد ے تو کس بات کی کون تک ہے۔'' سرل نے اسی انداز میں کہا' پھر وہ ہنس پڑا۔ ''دیکھو تو سہی۔ بالآخر مجھ پر بھی تمہارے اپنشدوں کا اثر ہو ہی گیا۔''

''تمہارا دماغ چل گیا ہے سرل۔'' چمپا نے دوبارہ کہا۔

''ہر واقعہ منفرد ہے۔ دہرایا نہیں جائے گا۔ یہ مت سمجھنا چمپا کہ لمحے دہرائے جا سکیں گے۔ تمہاری زندگی۔ میں یہ ساری چیزیں۔ وقت کے المیے پر تم ہنس نہیں سکتیں۔''

''چلو ___ میں تمہاری طرف چلتی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ فٹ پاتھ پر اس طرح چلنے لگے گویا قبرستان کی طرف جاتے ہوں۔ جب شناسا لڑکے اور لڑکیاں راستے میں ملتے تو وہ بڑے الم سے ان کو ہلو ہلو کہتا جاتا۔

''تم کیا واقعی ___ میری وجہ سے ___ یعنی کہ ___ '' اتنی خوفناک بات اس کی زبان پر نہ آسکی۔ ''یعنی کہ'' اس نے مری ہوئی آواز میں کہنا چاہا'' کہ تم نے آخر اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا۔'' فیصلہ۔ اور اس کی وجہ۔ دو چیزیں جو اس کی سمجھ میں آج تک نہ آسکی تھیں۔

''جی نہیں ___ مجھ کو بقول تمہارے باؤلے کتے نے کاٹا تھا۔'' سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''مجھ پر دراصل کبھی کبھی خلل دماغ کے دورے پڑتے ہیں' اسی کے زیر اثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہوں۔''

چمپا چورا ہے پر آ کر دفعتاً اپنے ہوسٹل کی سمت مڑ گئی۔

''تم تو اپنے زریں مشوروں سے مجھ مستفید کرنے میرے ہوسٹل آ رہی تھیں!''

''میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی سرل۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

''یہ تمہارا آخری' قطعی جواب ہے؟'' سرل نے زرد پڑتے ہوئے کہا۔

''آخری' قطعی' بالکل۔ تمہیں اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔''

''تم گوتم نیلمبر کا تعاقب کہاں تک کرو گی؟''

''میری توہین مت کرو سرل۔'' چمپا کے تن و بدن میں آگ لگ گئی۔

''اچھا۔اچھا۔''سرل نے سانس روک کر کہا۔''سڑک پر چلاؤ مت چھپا۔میں معافی چاہتا ہوں۔غلطی میری ہی تھی۔خدا حافظ۔''بارش کا ایک زوردار ریلا آیا جس سے مکانوں کے پردے لہرا گئے۔ہوا میں خنک گلابوں کی مہک تھی۔

شام کو وہ چند کاغذات لینے کے لیے سرل کے کالج گئی۔رات کی ٹرین سے بہت سے ساتھی اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ رہے تھے۔سینور کارلوس برازیل جارہا تھا۔اس سے اس کی کتنی تکرار رومن کیتھولک فسلفے پر ہوتی تھی۔لڑکیاں اورلڑکے بارش سے بچنے کے لیے پھاٹک کے اندر کھڑے تھے۔پھاٹک کا بھاری' پندرہویں صدی کا چوبی دروازہ اب آخری بار کھل کر بند ہوگا۔

اس کے بعد جب کبھی وہ یہاں آئیں گے تو سب کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا۔

بارش اور زور سے ہونے لگی۔پورٹر ٹیکسیاں لے لے کر آرہے تھے۔لڑکوں نے برساتیوں کے کالر کان تک اٹھا لیے تھے۔لڑکیاں چھتریاں کھول رہی تھیں۔سب خاموش تھے۔اب یہ بات کرنا کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔مثلاً ڈورس سے یہ کہنا کہ جب میں اسٹیٹس آئی تو تم سے ملنے نارتھ ڈیکوٹا ضرور آؤں گی۔یا جینیٹ یہ کہہ سکتی تھی کہ تم جب نیوزی لینڈ آؤ تو میرے ہاں ہی آکر ٹھہرنا۔یہ سب کس قدر مسخرے پن کی بات تھی' اگر یہ آخر وقت خدا حافظ کہنے کا سلسلہ نہ ہوا کرے تو انسان کس قدر زبردست کوفت سے بچ جائے گا مگر نہیں۔کھڑے ہیں۔بے ربط' بے تکے جملے ادا کیے جارہے ہیں۔نظریں بچا بچا کر آنسو پیے جارہے ہیں۔لاحول ولاقوۃ۔ٹیکسیاں آئیں اور سب ایک ایک کر کے اس میں بیٹھ گئے۔پھاٹک بند ہوگیا۔ایک بار اس نے گھوم پھر کر سنسان کواڈرینگل کا چکر لگایا۔چیپل

میں گئی۔ سنگ مرمر کی تختیوں پر ان لڑکوں کے ناموں کو آخری بار پھر سے پڑھ ڈالا جو دوسری جنگ عظیم میں کام آئے۔ مالیوں سے بات کی۔ ایک خانساماں ڈائننگ ہال کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ اس کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا گویا وہ خود میدان جنگ پر جا رہی ہے اور دنیا کا انجام ہونے والا ہے' پھر وہ صحن کی دیوار کے دروازے کی طرف جانے لگی جو جیزس لین کی طرف کھلتا تھا۔ راستے میں اسے کیٹ مل گئی۔ ''میں تم کو ڈھونڈ رہی تھی۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ''میں کل کینیڈا جا رہی ہوں۔ اب کب ملیں گے؟''

''پتا نہیں کیٹ'' چمپا نے اس لایعنی سوال سے بچنے کی کوشش کی۔ ''سرل کو دیکھا ہے؟ میں اس کو بھی خدا حافظ کہہ لوں۔ اس نے بڑی بے تعلقی کا انداز پیدا کر کے کیٹ سے پوچھا۔''

''ہاں وہ تو سینئر کومن روم میں بیٹھا ہے۔'' کیٹ نے جواب دیا۔ ''اس کے مزے ہیں۔ کہیں بھی نہیں جا رہا۔ مزے سے اپنے وطن میں رہے گا' ڈاکٹریٹ ختم کرے گا اور تم کو معلوم ہے' مجھ کتنی خوفناک جگہ جا کر رہنا ہے ________ نیوگنی اچھا ڈارلنگ۔ خدا حافظ۔''

چمپا کچھ دور تک اس کے سات چلی اور اس کو پھاٹک تک پہنچا کر سینئر کومن روم کی طرف مڑ گئی۔

سارے کالج پر مکمل سناٹا طاری تھا جسے صرف برستی بارش کی آواز مخل کر رہی تھی چتوں کی سرسراہٹ سرل ایشلے کومن ور میں' دریچے کے پاس' چمڑے کے صوفے پر بیٹھا وہ معمہ دیکھ رہا تھا جو لنگز لے مارٹن ہر ہفتے اپنی انتہائی ا ٹللکچول ریڈ سنگ

پبلک سے حل کرواتے ہیں چمپا کمرے میں آ گئی تب بھی وہ معمہ حل کرتا رہا پھر جب چمپا ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے سر اٹھا کر ایک حل کے متعلق اس کی رائے پوچھی، چمپا نے غور کر کے اس کا جواب بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم غلطی پر نہ ہو۔'' اس نے خالص برطانوی انداز میں کہا۔

وہ چونکی۔ اس نے دفعتاً دیکھا دیکھا کہ اس کے سامنے صوفے پر سنہرے بالوں والا ایک برطانوی لارڈ کرلڑ کا تھا: قدامت پسند 'مغرور خاموش طبع' باوقار۔ اس لڑکے کے ساتھ اس نے چند سال اس یونیورسٹی میں بتائے تھے اور ہم جماعت ہونے کے ناطے اب اسے خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ یہ لڑکا وہ نہیں تھا جس نے صبح بارش میں بھیگتے ہوئے دیوانوں کی طرح اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ یہ لڑکا تو لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا سرل ڈیرک ایڈن نہیں۔ کون سی ٹرین سے جارہی ہو؟''

''ساڑھے چھ کی ٹرین سے۔'' چما نے گھڑی دیکھ کر جواب دیہا۔ ''تم کب لندن آؤ گے؟''

''جب بھی آؤں' لیکن جہاں تک میرا خیال ہے' تم سے مالقات نہ ہو سکے گی۔ میں تم سے عمر بھر نہیں ملنا چاہتا۔''

وہ خاموش رہی۔ پانی کی شفاف پھوار دریچے پر ٹکرایا کی۔ ہوا کا بھینا بھیناپن کمرے میں رچ گیا۔

یکلخت چمپا نے نہایت بشاشت سے باتیں شروع کر دیں۔ یونیورسٹی

چھوڑنے کے بعد جو پروگرام گروہ کے افراد نے بنائے تھے۔ان کا ذکر کیا۔ ''میں تو ابھی قانون پڑھوں گی۔''

''مبارک ہو۔اس کے بعد کیا کرو گی۔''

''علم نجوم تو مجھے آتا نہیں کہ بتا دوں کہ ۶۲ء میں کیا کروں گی اور ۶۵ء میں میرا کیا ارادہ ہے۔''اس نے خورشدلی کا لہجہ برقرار رکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔''وہ رسالے پر جھکا رہا۔

''تم البتہ ڈاکٹریٹ لینے کے بعد یہاں کے استاد بن جاؤ گے۔تنقید پر موٹی موٹی کتابیں لکھو گے۔ٹی وی کے برین ٹرسٹ کی پینل پر بیٹھو گے۔دنیا عش عش کرے گی۔''

''ہو سکتا ہے۔''

''یا تم ڈاکٹریٹ سے بور ہو کر بنک آف انگلینڈ میں نوکری کر لو۔''

''یہ بھی ممکن ہے۔''

''اچھا اب چلنا چاہیے۔''چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اگر میں تمہاری جگہ پر ہوں تو مجھے زیادہ تاخیر نہ کرنی چاہے۔ٹرین کا وقت قریب ہے۔ ایسی سرل نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔گویا 'اب تشریف لے جائیے بیگم صاحبہ۔

چمپا نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کمرے پر آخری مرتبہ ایسی جذباتی حرکتیں کرتے ہوئے وہ خود کو پکڑ لیتی تو بعد میں بہت نادم ہوتی تھی۔دروازے تک آ کر اس نے سرل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔دروازہ بہت نیچا تھا۔کئی سو

سال سے اس پر عشق پیچاں کی گھنی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ کئی سو سال سے ان گنت طالب علم اسی طرح دروازے سے خدا حافظ کہہ کر نکلے تھے اور باہر کی دنیا میں دھکیل دیے گئے تھے۔

سرل نے جھک کر اس کو جانے کا راستہ دیا اور ہاتھ بڑھا رکھا۔ ''اتنے عرصے۔'' اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ، صاف اور گہری آواز میں ادا کیا۔ ''تم کو جان کر اور تم سے واقفیت حاصل کر کے مجھ بے حد مسرت ہوئی۔ خدا حافظ۔''

وہ عشق پیچاں کی بیل کے نیچے سے جھک کر باہر نکل آئی۔

''تم مجھے پھاٹک تک نہیں چھوڑنے آؤ گے؟'' اس نے یکلخت اپنی اٹل، ازلی اور ابدی تنہائی کو محسوس کرتے ہوئے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

''نہیں۔'' سرل نے جواب دیا۔ ''مجھے معمہ حل کرنا ہے اور خدا کرے میری تم سے دوبارہ ملاقات کبھی نہ ہو۔''

وہ واپس اندر چلا گیا۔

چمپا کواڈرینگل کے موڑ پر پہنچ کر ٹھٹکی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ دریچے کے اندر رسالے پر جھکا معمے میں مصروف تھا۔ چمپا نے پھاٹک کھولا اور سنسان سڑک پر آ گئی۔

سرل نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اس روز کے بعد چمپا احمد کی سرل ایشلے سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

بس مڈ ہرسٹ کی طرف جانے والی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ ہیزل میئر کے جنگل شام کا اندھیرا اچھا گیا تھا۔ سڑک کے لیمپ لطیف سے دھند لکے میں ٹمٹما رہے تھے۔ چاروں اور اونچے درخت کھڑے تھے' انسانوں کی قسمتوں کے پاسبانوں کی مانند' خاموش اور سب کچھ دیکھتے ہوئے۔

پھر کئی گھنٹے کا سفر طے کر کے بس مڈ ہرسٹ کی طرف مڑی۔ چڑھائی پر دور سے سینی ٹوریم کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں جیسے اندھیرے میں روشنی کا مینار ہو یا کسی ان دیکھے اسکاؤٹ نے کسی خطرناک پہاڑ پر سگنل کے لیے الاؤ روشن کر دیا ہو۔ دور سے تاریکی میں روشنیاں اس طرح جھلملا رہی تھیں جیسے زندگی روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے' روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے۔

گوتم نیلمبر بس سے اتر کر سینی ٹوریم کی طویل سڑک پر چڑھنے لگا۔ اندھیرے کے جنگل میں سے گزرتا ہوا جگمگاتی ہوئی عمارت کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ شفاف گیلریاں عبور کرتا نرملا کے کمرے میں داخل ہوا۔

نرملا اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی اور جانے کیا سوچ رہی تھی۔

''بی بی۔'' گوتم کی آواز یکایک اس کے حلق میں رندھ گئی۔ باہر کی شور مچاتی' خود غرض' دکھی دنیا سے علیحدہ وہ اتنے سکون سے کاہے کے انتظار میں مصروف تھی۔

اس کے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی انگلیوں سے اس نے بال درست کیے اور دل میں سخت جھنجھلائی کہ کوئی آئینہ قریب نہیں جس میں وہ جلدی سے اپنا چہرہ دیکھ لیتی۔

''افوہ۔تم تو بے حد صحت مند نظر آ رہی ہو۔ بالکل سرخا سرخ فرخ آبادی ۔''عیادت کرنے والوں کی طرح یہ بشاش انداز اختیار کرتے ہوئے گوتم نے دل میں خود کو گالیاں دیں۔''کیوں گپ مارتے ہو۔ ذرا مراٹمپریچر چارٹ دیکھو تو پتا چلے گا بچہ جی کو۔ آج بھی میرا بخار ایک سو ایک تھا۔اب تو مہینوں سے چلا آ رہا ہے۔''اس نے گویا بڑے فخر سے کہا۔

گوتم ڈوبتے دل سے اس کے قریب بیٹھ گیا مگر وہ خود بہت خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ اس سے حسب معمول لندن کے تازہ ترین اسکنڈلز سنانے کی فرمائش کرے گی۔ دوستوں کے جم غفیر کی فرداً فرداً خیریت دریافت کرے گی۔بات بات میں جرح کرے گی۔

نرملا تو' جس کا میں نے کبھی نوٹس نہ لیا تھا' اب تو میری روح میں شامل ہے۔

مگر وہ دو لڑکیوں کو بیک وقت کس طرح چاہ سکتا ہے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا چمپا ـــــــ اور یہ لڑکی ـــــــ جس میں چمپا والی کوئی خطرناک خصوصیات موجود نہ تھیں' سیدھی سادی' خوش خلق' معصوم لڑکی۔

''چمپا جو''وومن آف دی ورلڈ بن چکی تھی' ہمیشہ سے مردوں کو اپنی خطرناک کشش سے رجھاتی آئی تھی۔تجربہ کار تھی اور زمانے کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے مگر اس کے باوجود بے بس تھی یہ اور اس کی توجہ کی منتظر۔نرملا تھی' جو بستر مرگ پر پڑی تھی' گھریلو' ناتجربہ کار' اس کی توجہ کی منتظر' وہ چمپا کو یکسر بھول جائے گا۔کس قدر کوشش کے بعد پچھلے پانچ برسوں میں اس نے چمپا کو اپنے خیالوں سے دیس نکالا دے دیا تھا۔ایک ہی ملک اور دوستوں کے ایک حلقے میں رہنے کے باوجود اس نے

بڑی کامیابی سے چمپا سے ملنے سے احتراز کیا تھا' مگر اب چمپا کی پکار سے مقابلہ کرنا اس کے بدس میں نہیں تھا۔ یہ پکار میڈ رڈ اور روم اور وی آنا بجتے ہوئے آرکیسٹراز میں سنائی دیتی' بارش کی پھوار میں' بازاروں اور طعام خانوں کی چہل میں اطلانتک کی لہروں میں نیویارک کے شوروشغف میں' ______ ہر جگہ یہ پکار اس کا پیچھا کرتی آرہی تھی۔آوازوں کے تلاطم سے وہ عاجز آ گیا تھا۔شاید سناٹا اس کے مقدر میں نہ تھا۔ چمپا آواز تھی' نرملا سناٹا۔ چمپا نے اس سے طرح طرح کی باتیں کی تھیں:لکھنو کے بادشاہ باغ کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے' کوسی نگر کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے' گل فشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور پروفیسر بنرجی کے گھر اور کیلاش ہوسٹل کے ڈرائنگ رومز میں بیٹھے ہوئے' پلنگوں میں اودھم مچاتے ہوئے۔اسے وہ سب باتیں یاد تھیں' وہ سب شامیں' دوپہریں' لمحات۔ یہ سب سر فضا میں موجود رہتا ہے۔نرملا خاموش تھی۔ گومتی خاموش تھی۔ برسات کی دوپہر کا سکون' جب بارش ہو کر کھلی ہو۔کہر آلود سرسوں کے کھیتوں کا سناٹا۔نرملا نے اس سے کبھی شخصی باتیں نہ کی تھیں' چمپا کے ہر لفظ ہر انداز کے ذریعے دوسرے انسان سے ایک غیر مرئی (mystic) رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔

اسے یاد آیا: مدتیں گزریں جب وہ پہلی بار لکھنو گیا تھا۔اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ کر اپنی اس وقت کی محبوبہ شانتا نیلمبر کو خط میں لکھا تھا کہ گو مجھے آفیشل طور پر بر دکھوے کے لیے یہاں بلایا گیا ہے مگر میری ہونے والی منگیتر نرمل رانی کو اپنی الٹی سیدھی بحثوں ہی سے فرصت نہیں جو وہ میری طرف توجہ کریں۔ہاں نرملا میں بڑی شان اور تمکنت تھی۔اس میں خودسپردگی کا انداز کبھی نہ

آیا' وہ علیحدہ رہی تھی۔ غیر شخصی اور خاموش ______ دیبی کی طرح بلند اور راتم۔ دیبی کی طرح سکون بخشنے والی۔ اب مجھے تھوڑا سا سکون بخش دے ______ اس نے نرملا پر جھک کر دل میں کہا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''گوتم!''

''ہاں بی بی''

''سریکھا کا نیا فلیٹ کیسا ہے؟''

اس نے تفصیل سے سریکھا کے مکان کا جغرافیہ سمجھایا۔ ''اب اچھی ہو جاؤ تو آ کر خود ہی دیکھ لینا۔''

''ہاں۔ بالکل۔'' نرملا نے بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔

''آج کل ایک نئے بزرگ آئے ہوئے ہیں' طغیان بھاگل پوری۔''

''ہائے کتنے مزے کا نام ہے۔ کریک ہیں؟''

''بہت سخت۔''

''چندرا بھی ہے؟''

''ہاں ہاں۔''

''تمہارے نئے نئے دوستوں کا ذکر سن کر اس قدر دل چاہتا ہے کہ ان سے ملوں' خصوصاً رمیش سنگوی سے۔''

''ہاں۔ رمیش سنگوی بالکل آفت کا پرکالہ ہے۔'' گوتم نے مزید بے معنی انداز میں کہا۔

''اب رات زیادہ آ گئی ہے گوتم ماسٹر۔'' نرملا نے حسب عادت کمال اور ہری

شنکر کے لہجے میں اس سے کہا۔

''ہاں۔'' وہ کرسی پر سے اٹھا۔

''ارے رے رے ایک بات تو سنو۔'' دفعتاً نرملا نے بشاشت سے کہا۔

''اتنی زبردست خبر پوچھنا تو بھول ہی گئی۔''

''کیا گوتم نے آہستہ سے پوچھا۔''

کل طاعت بتا رہی تھی کہ چمپا باجی اپنا فائنل امتحان دینے کے بعد کیمبرج سے لندن آ گئی ہیں۔تم کو معلوم ہے؟

''نہیں۔گوتم نے کہا اور اپنے آپ کو دل میں پھر کئی گالیاں دیں۔''

''اچھا۔'' نرملا نے سادگی سے جواب دیا۔''میرا خیال تھا شاید طاعت نے بتایا ہو۔تم ان سے مل لو ضرور۔بے چاری ہے۔'' اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

مجھے آج کل اتنی فرصت کہاں ہے نرمل کہ میں لوگوں سے سوشل ملاقاتیں کرتا پھروں۔ایچ۔سی (ائی کمشنر) رات کے دس دس بجے تک کام کرواتے ہیں۔اس نے نظریں بچاتے ہوئے جلدی سے کہا۔''اچھا بی بی'خدا حافظ!'' وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا' گویا نرملا کے سامنے سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا ہو۔

نرملا' جس کا چھٹا حس بیدار ہو چکا تھا' سمجھ گئی کہ گوتم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔اس کو چمپا باجی کی آمد کی اطلاع ہے اور اس کے چہرے کی بدلتی رنگت کو دیکھ کر نرملا کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ چمپا باجی سے ضرور ملے گا۔

نرملا نے آہستہ سے بیڈ سوئچ دبا کر روشنی بجھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ کر

کے لیٹ گئی۔

۸۶

گوتم نے نرملا سے جھوٹ بولا تھا۔ اس روز نڈ ہرسٹ آنے سے کچھ دیر قبل اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسے بڑی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی کار کوئی دوست لے گیا تھا اور وکٹوریہ اسٹیشن جا کر وہاں سے مڈرسٹ کے لیے گرین لائن کی بس پکڑنا تھی۔ خواہ مخواہ کی دیر ہوئے جا رہی تھی اور اب یہ فون آ گیا تھا۔

اس نے ریسیور اٹھایا۔

آواز ______ اس کے کانوں میں پہنچی

''گوتم _____ ہلو ________ ارے بھئی گوتم''

وہ خاموش رہا۔

''گوتم نیلمبر۔'' دوسرے سرے پر چمپا نے زور سے کہا۔ ''کیا بات ہے؟ میری آواز سن رہے ہو۔''

''سن رہا ہوں۔''

''فون خراب ہے کیا؟''

''نہیں تو۔''

''شرم کرو۔'' چمپا بڑی نارمل آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''ڈوب مرو جی ______ حد ہے۔ میں اتنے برسوں سے یہاں ہوں اور تم کو ایک روز بھی توفیق

نہ ہوئی کہ مجھ سے مل لیتے کیا میں کھا جاتی تم کو؟'' پھر وہ ہنسی وہ چہکا رہا۔

اتنا بڑا ڈپلومیٹ اور حاضر جواب' بذلہ سنج آدمی اور اس سے مطلق کوئی جواب نہ بن پڑا اور چمپا نے کہا تھا: ''میں کیمبرج سے آ گئی ہوں اور جون کارٹر کے یہاں ٹھہری ہوں۔ آؤ کسی روز ملنے تعلیم کا زمانہ بالآخر ختم ہو چکا۔ اب مجھ فرصت ہی فرصت ہے۔''

''ہاں چمپا' میں ضرور آؤں گا۔'' گوتم نے ہڑ بڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''دراصل _____ وہ تم جانتی ہو لندن کی زندگی کس قدر ہنگامہ خیز ہے اور پھر فارن سروس کی مصروفیات' یہ کوئی لکھنؤ یونیورسٹی کا زمانہ تھوڑا ہی ہے کہ گھنٹوں بیٹھے گپ کر رہے ہیں۔ اور پھر میرا کام بھی ایسا ہے کہ مستقل دورے پر رہتا ہوں۔ آج ہائی کمشنر کے ساتھ یہاں جا رہا ہوں' کل وہاں جا رہا ہوں۔ جب کبھی کشمیر کیس یو۔این۔ میں جاتا ہے تو کرشنا مینن کے ساتھ پندرہ چکر نیو یارک کے لگانے پڑتے ہیں _____ ویسے میں تمہاری خیریت دوستوں سے برابر دریافت کرتا رہا۔''

اس نے کامیابی سے بات ختم کی اور بے انتہا نروس ہو کر سگریٹ جلایا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ چمپا دوسرے سرے پر اس کی آواز سن کر اس قدر مسرور ہے جیسے اسے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہو' جیسے اسے راج سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا ہو۔

ڈ ہیر سٹ س واپسی میں رات کے بارہ بج گئے۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اس نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا اور جون کارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہلو۔کون ہے؟'' ادھر سے نیل کی سوتی سوتی آواز آئی۔

''مس احمد ہیں؟''

''نہیں۔''

''کہاں چلی گئیں؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''آپ کون صاحب ہیں۔''

''نیلمبر۔''

''ہلو ہو____ہلو مسٹر نیلمبر ______ مس احمد نے شام کو کئی بار آپ کو فون کیا تھا مگر آپ شاید باہر چلے گئے تھے اس وقت تو وہ جون کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں۔''

''اوہ۔''

''آپ نے گینگ کے باقی افراد کے یہاں فون کر لیا؟ کوئی ضرورت ہے؟'' گوتم کی آواز کی سراسیمگی محسوس کر کے نیل نے کہا۔ ''فیروز سریکھا' زرینا' کملا' طاعت۔ان سب کے یہاں فون کر دیکھیے۔شاید مل جائیں۔

''بہت بہت شکریہ نیل۔میرے خیال میں اب رات بہت آ گیہ ہے' کل دیکھا جائے گا۔کوئی خاص بات نہیں تھی۔گڈ نائٹ۔'' اس کو اپنی حماقت کا احساس ہوا' اس نے ریسیور رکھ دیا اور سگریٹ جلا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

اس رات ٹیمز کی ایک لانچ پر بہت سی لڑکیوں اور لڑکوں نے ایک پارٹی کی تھی۔ جون کے ساتھ چمپا وہاں گئی اور رات گئے تک وہ لوگ عرشے پر ناچتے رہے۔ کشتی میں چمپا کو بہت سے اجنبی چہرے نظر آئے: کالے، گورے، انگریز، فرانسیسی۔ لندن مجلس کے چند لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ریلنگ پر جھکے وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔

ارے یہ پروگریسو ہو گئیں! جون کارٹر کے ساتھ گھومتی ہیں، سنا ہے پہلے تو بڑی سخت لگیر تھیں انڈیا میں۔ کسی نے چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔

''ممکن ہے پاکستان کی جاسوسی کرتی ہوں۔ کیا بھروسہ۔''

''یہ بھی ٹھیک ہیاور پھر ہندوستانی مسلمان! ان سے زیادہ دوغلا اور خطرناک کون ہوگا؟'' ایک مراٹھی ڈاکٹر نے کہا۔

''اور سنا ہے'' پہلے نہ کہا'' ''رضا جو کمال اور طلعت کا کزن ہے، اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اس نے گھاس نہیں ڈالی، وہ آج کل کیمبرج والی روشن کے چکر میں ہے کیونکہ روشن کا باپ کسی منسٹری کا سکریٹری ہے۔''

''روشن کو بھی رضا نے گھاس نہیں ڈالی کیونکہ اس بے چاری کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''باپ کا انتقال اصل وجہ نہیں، دراصل اس کا جی بھر گیا۔ بور ہو گیا بچارہ۔''

''میں یہ نقطہ نظر خوب سمجھ سکتا ہوں۔ لڑکیوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت ہے کہ جہاں ذرا سی دلچسپی ان میں لی اور وہ فوراً شادی پر تیار۔ میں رضا کے نقطہ نظر کو خوب سمجھتا ہوں بھائیو۔ کیونکہ کل میں ایلین سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔''

فوراً ہلڑ شروع ہو گیا: ''یہ آندرے کی آزادی کی آخری رات ہے' اس رات کو اچھی طرح منالو بھائیو۔'' کمال نے اسٹول پر چڑھ کر رقت انگیز آواز میں کہا۔

وہ سب بوٹ سے اتر کر شور مچاتے قریب کے ایک پب کی طرف روانہ ہو گئے۔

عرشے پر صرف لڑکیاں رہ گئیں اور وہ نوجوان جس نے سب سے پہلے یہ تذکرہ چھیڑا تھا' سیڑھیاں اترتے ہوئے کمال سے بولا:

''عامر رضا بڑا سمجھ دار آدمی ہے۔ ہم کو چاہیے اس سے ٹریننگ لیں۔ آخر یہ لڑکیوں سے شادی کرنے سے صاف کیسے بچ جاتا ہے۔''

''مگر دیکھ لینا آخر میں کرکری کھائے گا۔''

''اجی بعد کی بات دیکھی جائے گی' فی الحال تو عیش کر رہا ہے۔''

''ہاں بھائی۔''

''اور یار یہ کزن شاہ رخ سلطانہ کون ہیں' تمہاری رشتے دار ہیں؟''

''آج تک تو میں نے ان کا نام سنا نہیں تھا' شاید پاکستان میں بھیا صاحب کی کوئی عزیز پیدا ہو گئی ہوں۔''

''جرمن سنتے ہوتے آئے تھے' یہ پاکستان کزن کی قسم آج ہی معلوم ہوئی۔''

''دراصل یہ نوجوان خاتون کسی وزیر کی بھتیجی ہیں۔''

''اوہ آئی سی''

''آوازیں ڈوبتی چلی گئیں۔ کشتی آگے بڑھ گئی۔ چمپا اتر کر کنارے پر واپس آ گئی اور قلوپطرہ کی سوئی کے نیچے آن کر بیٹھ گئی۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ چند روز قبل عامر رضا رات بھر یہیں اسی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔اس رات بھی پورنماشی کا چاند دریا کی لہروں پر بہہ رہا تھا اور عامر رضا کو بے حد ڈر لگا تھا: اپنے آپ سے' دنیا کے حس سے' مستقبل سے۔ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے' کوئی مسائل ــــــ صرف ان کے ذاتی غرور کا مسئلہ تھا مگر اس کا تعلق پتھالوجی سے تھا اقتصادیات سے نہیں۔قلوپطرہ کی سوئی کے سائے میں بیٹھے بیٹھے ان کو ان لڑکوں کا خیال آیا تھا جو تلاش معاش میں سرگرداں تھے اور لڑکیوں کا جن کو عامر رضا نے چھوڑ دیا۔روپیہ اصل چیز ہے۔روپیہ اور عزت اور ایک کوٹھی' اپنی ذاتی۔ساٹھ ہزار کی مالیت کی۔ہاؤسنگ سوسائٹی' ڈرگ روڈ' کراچی میں۔ایک امریکن کار۔فریجڈیر ریڈیوگرامی زندگی کی اصل حقیقت' اتم حقیقت صرف یہ چیزیں ہیں۔زندہ باد زندگی۔مجھے سے کوئی شکایت نہیں۔صبح ہوتے سیڑھیوں سے اٹھ کر وہ کار کی طرف چلے گئے۔دوسرے روز وہ چھٹی لے کر شادی کرنے لکھنو جا رہے تھے۔''

۸۸

''میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں جس کا نام ہوگا' پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ ایز اے ڈون ژوان'' کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

''کیوں' کیا ہوا؟'' طلعت نے ہمدردی سے پوچھا۔

''بس یونہی ــــــ اب جیمز جوائس اور ڈلن طامس کے بعد۔''

''کل ڈلن طامس نے بل کے یہاں بڑے مزے کی باتیں کیں۔ترنگ میں تھے مولانا۔''شنکر نے مڑ کر کہا۔

''اجی وہ تو تھے۔آپ کس ترنگ میں ہیں آج کل؟''گلشن آہوجہ نے کمال سے پوچھا۔''یہ کیا پڑھ رہے ہو۔''

''کچھ نہیں۔یار خط آیا ہے گھر سے۔یعنی لکھنو سے۔''

''کیا خبریں ہیں؟''طلعت نے پوچھا۔

وہ سب سریکھا کے وسیع ڈرائنگ روم میں فرش پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے جس کا بڑا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔بہار کا روشن دن تھا۔سریکھا دہلیز کے پاس بیٹھی مشین پر لہنگے کی آڑھی گوٹ سی رہی تھی۔طلعت اور فیروزہ باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ہری شنکر بھی ان دنوں ہو ہیں موجود تھا جو واشنگٹن سے آیا ہوا تھا اور قاہرہ جا رہا تھا۔''یہ ہری شنکر اور گوتم کے مزے ہیں۔بالکل ابن بطوطہ بنے ہوئے ہیں۔آج کل،صبح صبح گوتم کا فون آیا تھا پھر ماسکو جا رہا ہے۔''گلشن نے اظہار خیال کیا۔

''گوتم تو ہیون سانگ بھی ہے۔کمال نے کہا۔''اکثر چین سے آیا کرتا ہے۔''

باغ میں چندرا ماتھر نے ایک اور گیت شروع کر دیا۔ان سب کی پرانی دوست چندرا،جو نیو یارک سے دلی جاتے ہوئے زرینہ کے یہاں لندن میں ٹھہر گئی تھی،بہت اچھا گاتی تھی۔ڈرائنگ روم کے دوسرے سرے پر طغیان صاحب سریکھا کے شوہر گلشن آہوجہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

بڑا خوشگوار اور پرسکون اتوار کا دن تھا۔باغوں میں پھولوں کا سیلاب آیا ہوا

تھا۔صبح صبح جب چمپا جون کارٹر کے گھر سے سیکھا کے یہاں آنے کے لیے بس میں سوار ہوئی تھی تو بس کا بوڑھا کنڈکٹرا اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا تھا اور اس نے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا تھا: ''مائی ڈیر' تم بے حد خوبصورت لگ رہی ہو۔ تمہارے بوائے فرینڈ تمہیں دیکھ کر بہت مسرور ہوگا۔خوب خوشی سے اتوار مناؤ۔ دنیا بڑی مہربان تھی اور خوشگوار کون کہتا ہے کہ دنیا غم خانہ ہے اور رلانا ہے اور ڈھمکانا ہے۔دنیا تو بے حد آرام دہ حسین جگہ ہے۔

وہ بے حد خوش تھی کل اس نے گوتم سے فون پر باتیں کی تھیں۔اتنے برسوں بعد آج اس کی آواز سنی تھی۔

وہ سریکھا کے یہاں پہنچی' یہاں محفل جمی تھی' وہ بے حد مسرت کے ساتھ سب سے باتیں کرتی رہی۔

''رات کی پارٹی میں بوٹ پر بڑا چنڈو خانہ رہا۔'' کمال نے اس سے کہا۔

'' آپ کے بجے تک گھر پہنچ گئی تھیں؟

''ہم جب پہنچے تو ٹرینیں بند ہو چکی تھیں۔اسٹرینڈ سے گھر تک پیدل آئے۔''

''کیا خبریں ہیں بھئی۔کس کا خط ہے؟''طلعت نے باورچی خانے سے سر نکال کر دوبارہ پوچھا۔

''اپی کا۔'' کمال نے جواب دیا۔

''میاں ہری شنکر۔اے بھائی ہری شنکر ہوت'طلعت نے باورچی خانے میں آواز دی ہری شنکر'جو باغ کے دروازے میں کھڑا تھا'پلٹ کر اندر آیا۔''لو یہ گرم گرم پوریاں۔چمپا باجی کدھر ہیں۔یہ پلیٹ ان کو دے آؤ۔''

وہی گلفشاں کا گھریلو ماحول یہاں بھی موجود تھا۔ گھر۔ جو اسے کبھی میسر نہیں ہوگا۔ چمپا کو ایک دریچے کی نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک پھریری سی آئی۔

ہری شنکر نے پلیٹ ہاتھ میں لے کر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چمپا دوسرے سرے پر دریچے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ سب یاد آتا تھا۔ نگار خانوں کی زندگی۔ فرن کے پتے۔ دریچے میں جھانکتا ہوا پیرس کا مدھم سورج 'بوہیمیا' برآمدے میں رکھی ہوئی جدید وضع کی آرام کرسیاں 'دھاری دار سن شیڈ' ایک کاہل الوجود ذہنی زندگی جس میں فلسفے تھے اور نیا فرانسیسی ادب' بڑے سائز کے سمفنی کے ریکارڈ' سالزبرگ یک موسیقی کے تہوار' کیمبرج کے کواڈ رینگل اور جانے کیا کیا۔ اسی قسم کی چیزیں جن کی ایک علیحدہ دنیا نیویارک کے گرینچ ویلیج 'پیرس کے بائیں ساحل اور یہاں لندن کے چیلسی اور سینٹ جانز وڈ میں آباد تھی۔ اس دنیا کے باسیوں کے یہاں بڑے گہرے جذباتی تجربے تھے اور ادراک اور ماورائی قسم کی گفتگو۔ چمپا باجی تم تو بہت جلد ایک دوسرے سرے پر پہنچ گئیں۔ پتا نہیں اب تم کھل کر ہنستی بھی ہو یا نہیں۔ اندرونی توازن تم نے قائم رکھا یا نہیں' جس کی تم کو ہمیشہ بڑی تلاش تھی۔ اب سریکھا' طلعت وغیرہ ان لڑکیوں ہی کو دیکھ لو۔ کیسی سمجھ دار ہیں۔ ایک سے ایک۔ لڑکیوں کا معاملہ دراصل بڑا بے ڈھب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں نیا پار لگ گئی تو لگ گئی ورنہ پڑا ہوا۔ ہم تو صاحب یہ جانتے ہیں ______ ''چمپا باجی' لو پوریاں کھاؤ'' اس نے باآواز بلند کہا۔

چمپا کے قریب جا کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا' جس طرح سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر وہ اس کی کرسی کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔

''ان سب کو کیا ہوگیا۔ سب چپ ہو گئے ایک دم۔''طغیان صاحب نے باتیں کرتے رکتے رک کر گلشن سے سرگوشی میں پوچھا۔

''ان سب پر خیالات سوار ہیں۔''گلشن نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''بڑا پرسکون سمے ہے۔''طغیان صاحب نے کہا۔''سریکھا دیوی کپڑے سینا بھی جانتی ہیں۔ مجھے گیان نہ تھا۔ کمال جی پوریاں کھا رہے ہیں۔ چندرا دیوی پھلواری میں مرغیاں چراتی ہیں۔ طلعت جی پھلکیاں تل رہی ہیں' یہ تو بالکل گرو دیو ٹیگور کے ناولوں جیسا ماحول ہے۔ پرسکون۔ شاعرانہ مدھر۔''

''اجی دیکھے تھے ٹیگور کے ناول۔''گلشن نے چڑ کر کہا۔''طلعت تم نے ساری پوریاں جلا دیں اٹھا کر۔ چائے بھجواؤ۔''

طغیان صاحب پھر مراقبے میں چلے گئے۔

''ہلو۔ ہری شنکر۔''چمپا نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر کہا۔''کیا بات ہے۔''

اب پوچھتی ہیں کیا بات ہے۔ قسم خدا کی ان کی دھاندلی کی حد نہیں۔''کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی۔ چائے پئیں گی۔''

''بنا دو۔''

اس نے پیالی اٹھائی۔ چمچہ نیچے گر گیا۔

ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں گھسے زندہ ہیں اور مستقل ایک دوسرے کو مارتے جلاتے رہتے ہیں۔''چمپا باجی۔''ہری شنکر نے کہا۔''تم ہم سب میں گریٹ ہو۔ کیونکہ تم میں محبت کی اتھاہ بے پناہ اہلیت موجود ہے۔''اس نے دفعتاً

آہستہ سے کہا۔ ''سنو ____ یو ____ این۔ میں ایک بڑی اچھی جگہ نکلی ہے' انڈیا کے کونے میں۔ اس کے لیے کروں کوشش تمہارے لیے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا ____ میں عمر بھر اسی طرح ماری ماری پھروں گی؟''

''اس کے علاوہ اور کرنا بھی کیا ہے تمہیں۔'' ہری شنکر نے کہا۔ پھر معاً اسے اپنی اس فاش غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے کسی چھوٹے موٹی اینٹ کے بجائے پورا پہاڑ لڑھکا دیا تھا' مگر یہ تو بڑی بہادر' فرخ دل آدمی ہیں۔ اس کا کیا برا مانیں گی۔ ''میرا مطلب ہے ____ ''اس نے ہڑبڑا کر بات بنائی۔'' کہ تم میں اتنی خود اعتمادی ہے۔ تم اوروں کی طرح تھوڑا ہی ہو کہ کہیں چولہا ہنڈیا لے کر بیٹھ جاؤ۔ ''اس نے باورچی خانے میں گھسی لڑکیوں کی طرح دیکھ کر کہا۔ اجی میں تو کہتا ہوں' تم تو ایورسٹ تک مزے سے چڑھ جاؤ گی دندناتی ہوئی۔ تم بڑی گریٹ ہو چمپا باجی ____ ''اب اس کی آواز میں رقت آ گئی ____ اسے چمپا پر یکلخت بے حد ترس آ رہا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی باغ کو دیکھا کی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر اب باتیں پھر زور سے شروع ہو چکی تھیں۔

چمپا کو یکلخت ایسا لگا جیسے خاتمہ اب بالآخر آن پہنچا۔ کمرہ بڑے زور سے ناچنے لگا۔ باغ میں گھومتی چندرا اسے قندیل کی طرح چکر کاٹتی نظر آئی۔ کمرے میں بیٹھے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ طغیان صاحب اسے ایک بہت عظیم اُلّو نظر آئے جو نیچے سروں میں تائیں تائیں کر رہی

تھی۔ میں دوانی ہو جاؤں گی۔اس نے آہستہ سے کہااور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہری شنکر نے اس کی آنکھوں میں آنسو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

''چمپا باجی۔''اس نے کہا۔''محبت کو خدا را جذباتیت میں تبدیل نہ کرو۔۔۔تو ازن 'ضبط' تناسب' کلاسیک گریک آئیڈیلز اصل چیز ہیں____یعنی کہ____''

''کیا معماروں کی سی باتیں کرتے ہو____''چمپا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔''میں محبت کر رہی ہوں یا کوئی عمارت کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہوں۔''

''چمپا باجی____''ہری شنکر نے اسی طرح احتجاجاً کہا۔''تمہارے خیالات تھک ہیں۔ہمیشہ تھے۔تمہارے جذبات میں واگز کابوجھ ہے۔پہلے بھی تھا اب زیادہ ہو گیا ہے۔قصہ مختصر یہ کہ تم اپنی روح کی پیورٹی کو تباہ کیے ڈال رہی ہو____دس سال گزر گئے مگر تم بالکل نہ بدلیں۔''

جون اور اوجیت پارٹی کی تاریخ لے کر اندر آئے اور کمال کی طرف چلے گئے۔

''ہری شنکر____''چمپا نے جھک کر کہا۔''مجھ پر ترس نہ کھاؤ مجھے شکست کا احساس آج تک نہیں ہوا'میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ شکست کیسی ہوتی ہے۔''

ڈائننگ ٹیبل پر سے طغیان صاحب کی آواز بلند ہوئی۔''ہم سب سائے ہیں

سائے۔'' وہ گلشن سے کہہ رہے تھے۔

''جی ہاں درست ہے۔'' گلشن نے بور ہو کر سگریٹ جلایا اور چمپا کی طرف بے دھیانی سے دیکھنے لگا۔

''کمیونسٹوں نے مارکسزم کو تباہ کر دیا۔'' طغیان صاحب نے جون کارٹر پر نظر ڈال کر دوسرا موضوع شروع کر دیا۔

موصوف بڑے زبردست سوشلسٹ تھے۔ صوفی ازم ان کی سائیڈ لائن تھی۔ انہوں نے ہندی میں بہت سے ناول لکھ ڈالے تھے۔ اب انگریزی میں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کا پورا نام رائے ہربنس رائے طغیان بھا گلپوری تھا۔ بہار کے رہنے والے تھے۔

''میرے حضرت نے مجھ سے کہا'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔

ان کے ایک مسلمان گرو ہیں جو سرینگر میں رہتے ہیں۔'' ہری شنکر نے چپکے سے چمپا کو بتلایا۔

''میرے حضرت نے مجھ سے کہا: بچہ تو روس جا۔''

''اور ان ملعون ملحدوں کو سچی سوشلزم کی مشعل ہدایت دکھلا کر راہ راست پر لا۔

''طلعت نے باورچی خانے میں سے لقمہ دیا۔

''انہوں نے تو بھئی اپنے حضرت کو بھیا چھا سدھایا۔'' چندرا نے باغ کے دروازے میں آ کر کہا۔

طغیان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ کون مہیلا ہیں؟'' انہوں نے سریکھا سے دریافت کیا۔

''یہ مہیلا بھی بڑے پروگریسو وچاروں کی مالک ہیں' لیکن ڈاکٹر رما نے کی اویش سے نیویارک کی آکاش وانی سے ہندی میں سماچار سنایا کرتی ہیں' ان کا ومان ابھی ہی یہاں پہنچا ہے۔'' کمال نے جواب دیا۔

''آپ بہار کے رہنے والے ہیں؟'' چندرا نے شگفتگی سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' طغیان صاحب نے خفا ہو کر کہا۔ ''ہوں تو سہی' پھر''

''ارے۔ میرا مطلب تھا۔ تب تو آپ شاید گوتم نیلمبر کو جاتے ہوں۔ اس نے پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھا ہے۔''

''جانتا ہوں______ بیوقوف چھوکرا ہے۔'' طغیان صاحب نے مختصرا کہا ۔''ہاں تو میں کہہ راہ تھا کہ ہم سب سائے ہیں۔ میں بھی' گوتم نیلمبر بھی تمہارا____ میرے حضرت نے کہا تھا۔''

''کمال____ طاعت پتیلیاں چولہے سے اتار کر جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی باہر آئی۔ ''اپی نے کیا لکھا ہے خط میں۔''

''ارے ہاں____ '' کمال نے اوجیت سے باتیں کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔ ''کچھ نہیں۔ بھیا صاحب کی شادی ہوگئی۔''

''ہائیں____ وہ کب؟'' کورس ہوا۔ ہر ایک اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

''اتنی بڑی بات ہوگئی اور تم گپ چپ کالڈو بنے بیٹھے ہو۔'' طاعت نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ایسی کون بڑی بات ہوگئی بھئی۔ ہم سب سائے ہیں۔'' کمال نے اطمینان سے کہا۔ ''ابھی تم نے سنا ہے طغیان صاحب کے حضرات کیا کہتے ہیں۔''

''تم بکواس مت کرو۔'' ہری شنکر نے چھلانگ کر کمرے کے وسط میں آتے ہوئے کہا۔ ''تفصیل سے واقعہ بتاؤ۔ کیا لکھا ہے اپی نے۔''

''یار۔ ہوا یہ کہ۔''

''شروع سے شروع کرو۔'' طاعت نے حکم دیا۔

''خوب نمک مرچ لگا کر سناؤ ورنہ لڑکیوں کو چین نہیں آئے گا۔'' گلشن نے حسب معمول اپنے سوتے سوتے انداز میں کہا۔ سب کمال کے چاروں اور آن بیٹھے اور کان کھڑے کر کے قصہ سننے لگے۔ کمال نے ماہر فن داستان گو کی طرح سگریٹ مٹھی میں لے کر لمبا کش لگایا۔ چمپا دریچے میں بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی۔

''بھائیو اور بہنو ____ تم کو معلوم ہی ہے۔ کہ بھیا صاحب بے چارے بڑے زبردست سوشل کلائمبر۔''

''یہ کیسے۔ لکھنو میں تو نہیں تھے۔'' فیروز نے اعتراض کیا۔

''تم اپنا لکھنو لیے پھرتی ہو بات بے بات۔ بھیا صاحب اور ان کے وہاں کی ویلیوز ____''

''پھر سیاست شروع ہوئی۔'' گلشن نے کہا۔ ''یہ تم تو اپنے بھیا جی کا قصہ سنانے لگے تھے۔''

''سنانے لگے تھے نہیں یار سنانے والے تھے۔ تم پنجابی ادبدا کر غلط اردو بولتے ہو۔'' ہری شنکر نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

''ارے جا۔ یو۔ پی کے بنئے۔'' گلشن نے جواب دیا۔

''لاؤ بھئی۔ اپی کا خط دو۔ ہم باہر جا کر خود پڑھ لیں۔'' فیروز نے تنگ آ کر

کہا۔ ''تم لوگوں کو لونڈیاں ہار پارٹی کبھی سنجیدہ ہونا جاتی ہی نہیں ہو نہہ۔''

''ہاں تو ہوا یہ کہ بھیا صاحب ایک سوشل کلائمبر ______ جب روشن کراچی واپس گئی یہ اس سے بہت پہلے ہی ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ بے چاری کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اب شاہ رخ سلطانہ منظر پر آ گئیں مگر کراچی میں حکومت تبدیل ہو گئی۔''

''_____ ایں _____ اس کا کیا مطلب جو بات کی بے تکی۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''ارے۔ اس کا مطلب یہ کہ کزن شاہ رخ کے ابا منسٹر نہیں رہے۔''

''اوہ''

''اب لکھنو سے ہماری والدہ یعنی بھیا صاحب کی چچی کے خط پہ خط آنے شروع ہوئے کہ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ میاں تم گھر بسالو۔ ایک ایک کر کے گلفشاں سے پنچھی اڑ گئے، کم از کم تم یہاں آ کر بہو کا دولا ہی لے جاؤ۔ طاعت ذرا چاءبنانا۔''

- -

- -

''اور بل چھوڑنے والا ہے اسے۔''

''زیادہ تر انٹلکچول لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں.......... اگر چہ وہ خود بھی انٹلکچول ہوتی ہیں۔'' کمال نے لاپروائی سے کہا۔ ''تم لوگ تو یار لندن کی ایک

انسائیکلوپیڈیا اسکنڈلیکا مرتب کر ڈالو۔ ریفرنس کے لیے آسانی رہے گی۔"

"روشن کی بھی سنا ہے شادی ہوگئی کسی بڑے افسر سے۔" طلعت نے کہا۔

"مبارک ہو..........." کمال نے جواب دیا۔

"بے چاری چلی گئی واپس اپنے خول میں..." فیروز بولی۔ "بیکار اس نے یہ سارا جھنجھٹ کیا۔"

"یہ لڑکیاں عشق کیوں اور کیسے کرتی ہیں آج تک میرے پلے نہ پڑا۔" طلعت نے کہا۔

"ارے یار خدا کے لیے آہستہ بولو..." "وہ ٹہل رہی ہیں سامنے باغ میں۔ کمال نے کہا۔

"ہماری نگریا میں آئے بسو بنواری۔" طلعت نے لوفروں کی طرح گانا شروع کیا۔ لڑکیاں اٹھ کر ایک کونے میں چلی گئیں۔

"آج کل ان کا کیا سلسلہ ہے۔" سریکھا نے چپکے سے پوچھا۔

"میاں۔ میاؤں۔" کمال نے دور سے چڑایا۔

"یار وہ سرل ایشلے تو کل میں نے دیکھا شنیلا مکرجی کے یہاں ڈٹا ہوا تھا۔ کیا وہ بھی سکونِ دل کی خاطر..." طلعت نے پوچھا۔

"واہ عین مین معلوم ہو رہا ہے مسلم اسکول لکھنؤ کی سیکنڈ ائیر میں پڑھنے والی لڑکیاں گفتگو کر رہی ہیں۔" کمال نے کہا۔ سریکھا اور طلعت اور نرگیش سنی ان سنی کر کے کھس پھس کرتی رہیں۔

"یہ لوگ کتنی ہی افلاطون کیوں نہ بن جائیں رہیں گی وہی کشمیری محلّہ گرلز

اسکول لکھنؤ۔'' کمال نے دوبارہ کہا۔

''سوال یہ ہے۔'' فیروز نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔'' کہ مڈل کلاس لڑکیاں اتنی رومان پرست کیوں ہوتی تھیں۔''

''ہوتی تھیں کیا معنی۔ اب بھی ہیں۔ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو گویا یہ پوسٹ ریوولیوشن پیریڈ ہے اور ماضی پر خالص مورخانہ انداز سے بحث کررہے ہیں ہم'' طلعت نے کہا۔

''مگر صاحب۔ روشن میں ممکنات تھیں، وہ برلین والا قصہ یاد ہے، وہ تو جب ہم لوگ بخارسٹ جارہے تھے تو پیچھی ہمارے ساتھ ساتھ آسٹریا کی سرحد تک پہنچ گئی، وہ نکل چلتی ہمارے ساتھ مگر۔'' فیروز بولی۔

''مگر کیا یار۔ ڈرپوک تھی۔ پچانوے فیصدی بورژوا لڑکیوں کی طرح۔ بس رومانس دماغ میں ٹھنسا تھا۔ وے رومانس۔ وے بورژوا فلسفہ۔ لاحول ولا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یعنی عشق بھی کیا تو کس سے..... بھیا صاحب جیسے بوگس انسان سے۔'' طلعت نے کہا۔

''اب وہ اس بڑے آدمی، کی بیوی بن کر جم خانہ کی پارٹیوں میں زندگی گزارے گی، کیا ڈاؤن فال ہوا ہے۔'' سریکھا نے کہا۔

''تمہارا تخیل اس وقت زوروں پر ہے۔'' طلعت نے کہا۔

''میرے تخیل نے ہم سب کو عجیب عجیب حالتوں میں دیکھا ہے۔'' سریکھا نے اداسی سے کہا۔'' میں نے دیکھا ہے کہ چمپا بیگم ایک تھکی ہاری پروفیسرنی کی طرح ہندوستان کے کسی کالج میں لڑکیوں کو ہسٹری پڑھا رہی ہیں۔ بہت جلد وہ

وقت بھی آنے والا ہے جب میری شہرت ختم ہو جائے گی۔ رقص کے متعلق کتابوں میں ایک آدھ پیراگراف میرے سارے وجود کا ماحصل رہ جائے گا۔ شریمتی سریکھا دیوی جو دس سال قبل بہت عظیم رقاصہ تھیں۔ طلعت کو لوگ بھول جائیں گے۔ کملا گمنام ہو جائے گی۔ اس وقت ہم میں اور روشن میں کیا فرق رہے گا؟''

''ایسی ڈے کیڈنٹ باتیں مت کرو۔'' طلعت نے ڈانٹا۔

''میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔'' سریکھا نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا۔

''میں یہی سوچ رہا تھا۔'' کمرے کے دوسرے سرے پر ہی ہری شنکر نے کمال سے کہا۔ ''لڑکیوں کا معاملہ بڑا بے ڈھب ہے۔ ذرا ان کو دیکھو تو۔ کیسی مگن ہیں اس سے۔ ایک نے نیا بلاؤز سی لیا ہے تو خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ دوسری ادھر ادھر کی بے ضرر گپیں ہانک کر ہی مسرور ہے، مگر دراصل انہیں کتنے عظیم دکھ اٹھانے پڑتے ہیں، یہ ایک بچے کی تخلیق کے ذریعے ساری کائنات کی ذمے داری سنبھالتی ہیں۔ بے چاریاں اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ان کا دل رکھنا کتنی آسان بات ہے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتی ہیں یہ لوگ۔ ان کو تو دیوی بنا کر رکھنا چاہیے۔ ان کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔''

''طلعت، ہری شنکر کی طرف آئی۔ ہری شنکر پھر مبالغے سے کام لے رہا تھا، یہی مبالغہ طلعت کو ہر طرف نظر آتا تھا۔ گوتم نیلمبر کے کردار میں چمپا میں، اپنی میں، یہ لوگ گویا انسانوں کی انلارجڈ تصاویر تھیں۔ اسی مارے فوکس سے کبھی کبھی باہر ہو جاتی تھیں۔''

''میاں، کیا بے تکی ہانک رہے ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بھرے کسی

اور کو دینا۔ کہاں کی دیوی اور کیسے دیوتا۔ یہ شاعری رکھو چھپڑ پر۔ معاشی آزادی اصل چیز ہے۔''

''یہی بات تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ معاشی آزادی اصل چیز ہوتی تو چمپا بیگم اس سے باغ میں چکر نہ کاٹ رہی ہوتیں۔'' شنکر نے جواب دیا۔

''اوہ۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔'' طلعت نے کہا۔

''اے لیجئے۔ اتنی قابل لڑکی۔ کیمبرج میں سب پر دھاک بٹھا کر آ رہی ہے، جس سے ملتی ہے وہی فلور ہو جاتا ہے۔ آپ ان کا دماغ خراب بتائے دے رہی ہیں۔''

''کیوں بھئی کمیونسٹ لوگ عشق نہیں کرتے؟'' طغیان صاحب نے نہایت بھونڈے پن سے گلشن سے سوال کیا۔

''لاحول والاقوۃ۔'' طلعت جل کر واپس چلی گئی۔

''بی بی۔'' ہری شنکر نے اس سے بڑے پیار سے کہا، وہ نرملا کی قائم مقام تھی۔ ''ابھی تم اور پڑھو۔ اب تم لگے ہاتھو پی۔ ایچ۔ ڈی کر ہی ڈالو۔ کون مردود کہتا ہے کہ معاشی آزادی ضروری نہیں۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔'' وہ یک لخت گھبرا گیا کہ اس نے طلعت کو خفا کر دیا ہے۔

''پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے بڑے لڈو مل جائیں گے۔ تین سو کی ملازمت، صرف تین سو کی۔'' اس نے عین ہری شنکر کی ناک کے آگے تین انگلیاں لہرائیں، وہ بالکل سننے کی موڈ میں نہیں تھی۔ دراصل بھیا صاحب کی شادی کی خبر نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اسے اس وقت پہلی بار احساس ہوا تھا کہ شادی کی کتنی

زبردست مارکیٹ ہے جس میں لڑکیاں، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں خواہ جاہل چیٹ برائے فروخت دکان پر رکھی جاتی ہیں۔

''ارے تو روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ نیا ہندوستان ہے۔ ہم سب کو اس کے لیے کام کرنا ہے کملا کو دیکھو، صولت کو، کیسی ٹھاٹھ دار کیریر ویمن ہیں۔''

چمپا نے ٹہلتے ہوئے ایک مرتبہ کمرے میں جھانکا اور ان سب باتوں میں مصروف پا کر باغ میں سے گزرتی باہر سڑک پر آ گئی۔

۸۹

برفباری شدید ہوگئی۔ شنیلا دیبی نے کھڑکیاں بند کر دیں۔

سوامی دیویکا نند نے گیتا کا صفحہ الٹ کر مجمع کو دیکھا، یہ وہی کمال اور ہری شنکر کے انگریز پروفیسر تھے جو تیرہ چودہ سال قبل ایک روز لامارٹیز کالج لکھنؤ سے اچانک غائب ہو گئے تھے اور کمال اور ہری شنکر ان کے تعاقب میں ہردوار کی گھاٹیوں میں مارے مارے پھرے تھے۔ اب یہ زعفرانی کپڑے پہنے، داڑھی بڑھائے، یورپ اور امریکہ میں لیکچر دیتے پھرتے تھے۔ گوتم نے شنیلا مکر جی کے فلیٹ میں پہنچ کر کھڑکی میں سے جھانکا تو اسے یہ منظر نظر آیا کہ سوامی جی مشرق پسند انگریز لڑکیوں میں گھرے بیٹھے ہیں، ایک طرف کیرتن ہو رہا ہے۔ شنیلا مکر جی سب کو کافی پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

گوتم اسی صبح کئی ماہ بعد ماسکو سے لوٹا تھا۔ کمال نے اس کے توسط سے ہندوستان میں مختلف ملازمتوں کے لیے جو درخواستیں دے رکھی تھیں ان کے جواب میں انڈیا ہاؤس میں گوتم کی میز پر بہت سے لفافے آئے رکھے تھے۔ وہ ان کھولے بغیر خوشی سے ہڑبڑا کر کمال کو سارے میں ڈھونڈتا پھرا۔ سریکھا کے یہاں معلوم ہوا کہ کمال اور ہری شنکر اپنے پرانے پروفیسر سے ملنے شنیلا مکرجی کے یہاں گئے ہوئے ہیں مگر وہ لوگ یہاں بھی نہیں تھے۔ گوتم اندر آ کر ایک کونے میں مائیکل کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہلو کامریڈ۔ ہوسکو واسے کب لوٹے۔'' مائیکل نے چپکے سے پوچھا۔

''آج صبح۔''

''بھئی یہ تمہارے سوامی جی تو بالکل فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔'' مائیکل نے کہا۔

''ہوں گے۔ مجھے ان میں دلچسپی نہیں ہے۔ تم نے کمال کو دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ ان کو روپیہ دے رہا ہے کہ مذہب کا پرچار کریں اور کانگریس آف کلچرل فریڈم کی طرف سے دورے پر نکلے ہیں۔''

''تم اب تک سرائیل نہیں گئے۔'' گوتم نے دریافت کیا۔

''بس اب جانے ہی والا ہوں۔''

''سب جا رہے ہیں۔'' شنیلا دیبی مائیکل کی بات سن کر ان کی طرف آ ئیں۔

''نومشکار مسٹر نیلو مبر۔'' انہوں نے کہا۔

''نمسکار شنیلا دیوی۔''

بہت سے پھول اٹھائے نرگیش کمرے میں داخل ہوئی۔ ''روشنی میں آ کر دیکھا تو یہ سب سرخ نکلے۔میرا خیال تھا زرد ہوں گے۔'' اس نے سوامی جی کے سامنے پھول رکھ کر کہا۔

''نرگیش.....'' گوتم نے آزردگی سے نیچی آواز میں کہا۔ ''یہ کیا سوانگ رچا رہی ہو؟''

''گوتم............کلچر کی خاطر............یہ سب کلچر کی خاطر ہے۔'' اس نے پہنچے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''کمال کہاں ہے۔''

''سریکھا کے یہاں دیکھ لیا؟ شاید وہ لوگ مڈ ہرسٹ سے نہ لوٹے ہوں۔''

''مڈ ہرسٹ..........'' گوتم کے ذہن پر ایک موگری سی پڑی۔ ''مگر آج تو اتوار نہیں ہے۔''

''ہاں، لیکن نرملا کے دوسرے پھیپھڑے کا آپریشن ہوا ہے۔تم کو معلوم نہیں؟ ارے ہاں، تم آج ہی تو باہر سے لوٹے ہو۔''

''سب جا رہے ہیں۔ سب اپنے اپنے اسرائیل کی طرف جا رہے ہیں۔'' شنیلا مکر جی نے آنکھیں نیم وا کر کے گوتم سے کہا۔ ''تم لوگوں کی پوری پارٹی ہندوستان واپس جانے والی ہے۔نرگیش نے آج بتایا مائیکل بھی جا رہا ہے۔ ڈینس کو نیروبی کی یونیورسٹی میں پروفیسری مل گئی ہے۔''

''شنیلا دیوی یہ تو دنیا کا قاعدہ ہی ہے۔'' گوتم نے سخت اکتا کر کہا۔ ''لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، بلکہ چلے جاتے ہیں، آتے کبھی نہیں۔'' اب وہ بھی پھر گرودیوٹیگور کا حوالہ دینے والی تھیں۔ گوتم جلدی سے اٹھا۔ ''نرگیس'' اس نے مڑ کر کہا۔

''مجھے کمال کی بڑی سخت تلاش ہے، اس کے نام چند بے حد ضروری خط آئے ہیں۔''

''بی بی سی کینٹین میں دیکھ لو۔ یا شاید چوزے کی سرائے میں ہوں وہ سب۔ سوامی جی سے تو ملتے جاؤ۔''

''ارے ہاں۔'' وہ آگے بڑھ کر سوامی جی کے سامنے جھکا اور ان کے پیر چھوئے۔ سوامی۔ دیویکا نند جی سابق ڈاکٹر رچرڈ ہیملٹن۔ نے اسے اشیرواد دی اور اوکسفرڈ کے لہجے میں اس سے اس کی روح کی خیریت دریافت کی۔

''مجھے تمہارا ہی انتظار تھا کہ تم آجاؤ تو ایک روز اسٹیون اسپنڈر وغیرہ کو اپنے یہاں بلوا کر ایک محفل منعقد کریں۔'' شنیلا دیوی نے کہا۔ ''سوامی جی سے میں نے تمہارا بہت ذکر کر رکھا ہے۔''

گوتم دوبارہ جھکا اور سب کو نمسکار کرتا ہوا باہر نکلا۔

وہ اوورکوٹ میں منہ چھپا کر تیز تیز قدم رکھتا کار کی طرف چل دیا۔ شنیلا مکرجی کے فلیٹ میں سے کیرتن کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

چوزے کی سرائے اس وقت غیر معمولی طور پر سنسان پڑی تھی صرف ایک لڑکی دروازے کی طرف پشت کیے اونچے اسٹول پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ گوتم ویٹرس سے پوچھنے کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھا کہ بی بی سی والے تو ابھی ادھر نہیں آئے تھے۔ اسٹول والی لڑکی نے مڑ کر اسے دیکھا، وہ چمپا احمد تھی۔

''ہلو...... تم یہاں موجود ہو۔'' گوتم نے بے ساختہ کیا۔

وہ اپنی جگہ سے اتر کر برابر کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ''تم ہی نے تو کہا تھا کہ دنیا بہت مختصر ہے، ہم کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے دوبارہ۔''

''اب ایسی مختصر بھی نہیں ہے۔'' گوتم نے ذرا برا مان کر کہا۔ ''یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کولٹرل سمجھ لیا جائے۔''

''لٹرل تو تم مانتے ہو باتوں کو۔''

''وہ کیسے؟'' گوتم نے پھر کمال کی تلاش میں چاروں اور نظریں دوڑا کر پوچھا۔

''میں نے تم سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ بڑی مابعد الطبیعیات بات تھی۔ تم اس کو مجازی طرف لے گئے، یہ سب تمہارا قصور ہے۔'' اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

''مابعد الطبیعیات کا ذکر مت کرو۔'' گوتم بے انتہا چڑ کر بولا۔ ''میں ابھی شنیلا دیوی کے یہاں سوامی دیویکانند سے مل کر آ رہا ہوں۔ تم نے کمال کو تو نہیں دیکھا۔''

''نہیں۔'' چمپا نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا، یہ آدمی پل پل میں کیسے

رنگ بدلتا تھا۔ ابھی تک میں مردوں کو سمجھ نہیں پائی۔ ''تم نے مجھے فون کیا تھا اس روز............جون کارٹر کے یہاں۔ یورپ جانے سے پہلے۔''

''ہاں۔ کیا تو تھا۔'' گوتم کو اپنا اس طرح پکڑا جانا بالکل پسند نہ آیا۔ ''کیونکہ تم نے مجھے رنگ کیا تھا کیمبرج سے لوٹ کر............''

''گوتم، یہ تم کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو، بات بے بات۔ تم پہلے تو ایسے نہ تھے، میں تقریباً سات سال بعد تم سے ملی ہوں۔ ذرا تمیز سے پیش آؤ۔''

''چمپا۔'' گوتم نے کہا۔ ''میں اس وقت بے حد پریشان ہوں۔ کمال کے کئی ضروری خط ہیں، ممکن ہے اسے دو تین دن کے اندر انٹرویو کے لیے دلی پہنچنا ہو۔ نرملا کا دوسرا آپریشن ہوا ہے۔ تم چوبیس گھنٹے خوابوں میں کھوئی رہتی ہو، باقی کی دنیا ہر سے تمہارے خوابوں کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔''

''ارے۔'' وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔ ''چلو کمال کو ڈھونڈتے ہیں، مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔'' گوتم نے اسے دیکھا، یہ کسی عجیب دلکش عورت تھی۔

وہ سرائے سے باہر نکلے اور سریکھا کے یہاں فون کیا۔ گلشن نے دوسرے سرے سے جواب دیا۔

''کمال کا پتا نہیں۔ شاید سر روجر کے یہاں نرملا کی رپورٹ لینے گیا ہے۔ سریکھا ابھی راڈا سے نہیں لوٹی۔ کمال نے کہا تھا کہ وہ سر روجر کے یہاں سے ہمارے گھر ہی آئے گا۔ تم آجاؤ، میں کالج جا رہا ہوں۔ کنجی ہمسایوں کو دیے جاتا ہوں......''

''کوئی ٹڈہرسٹ گیا؟'' گوتم نے پوچھا۔

''طلعت اور ہری شنکر گئے ہیں اگر تم بھی جا رہے ہو تو میرے یہاں سے ایک پارسل لیتے جانا۔ نرملا کو بھجوانے کے لئے سریکھا نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ طلعت لے جانا بھول گئی۔''

''اچھا۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

گوتم کار کی طرف لوٹا اور وہ سینٹ جانز ووڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آشا کے یہاں سے کنجی لے کر وہ سریکھا کے مکان میں داخل ہوئے۔ گیلری میں دو بڑے بڑے مجسمے رکھے تھے۔

''اوہو.......... ہماری طلعت نے بڑے زوروں سے سنگتراشی شروع کر رکھی ہے۔''

''یہ آشا کے بنائے ہوئے ہیں۔'' چمپا نے فوراً کہا۔

گوتم ٹھٹھکا۔ چمپا، طلعت اور ان سب کو کس قدر ناپسند کرتی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا، وہ گارڈن۔روم میں گئے اور باغ کی طرف بڑا شیشوں والا دروازہ کھولا۔ اب برف پھر مدھم سی دھوپ میں روشن تھی۔ ''کتنا آرام دہ گھر ہے سریکھا اور گلشن کا۔'' گوتم نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ باغ کی دیوار کے پرے سے موسیقی بلند ہو رہی تھی۔ فضا میں خوش گوار خنکی تھی۔ چمپا نے آتش دان روشن کیا۔ گوتم کمرے کے ساز و سامان پر کاہل اور مطمئن انداز سے نظریں دوڑاتا رہا۔ اب چمپا کی موجودگی کی وجہ سے برسوں بعد ایسا معلوم ہوا گویا وہ بہرائچ میں اپنے گھر پہنچ گیا ہے، یہ بڑا غیر منطقی اور عجیب سا احساس تھا۔

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات، علامہ

اقبال، فیض، کرشن چندر، پھر سریکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی، بیلے، کریوگرافی۔ سارے میں نفیس آرٹسٹک چیزیں سجی تھیں جو سریکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یورپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا بیلا لیکا، چین کے نوادر، ہنگری کی گڑیاں، اٹلی اور فرانس کی پینٹنگز۔

صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک آرٹسٹ اور رقاصہ کا کمرہ ہے۔ پیانو پر مارگو فونٹین اور رابرٹ ہیلپ مین کی دستخط شدہ تصاویر رکھی تھیں۔ جگہ جگہ بالی اور جنوبی ہند اور سیام کے رقاصوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے سجے تھے۔ کونے میں سینے کی مشین دھری تھی اور مردنگم اور ترکاری کی ٹوکری، گوتم مسکرایا، یہ آرٹسٹ کا کمرہ تھا مگر اس میں آرام اور بے تکلفی سے رہا بھی جاتا تھا۔ زندگی کی اسی سادگی اور بے تکلفی کا وہ ہر جگہ متلاشی تھا۔

"میں نے یہاں بڑے اچھے لمحے گزارے ہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ہیں نا۔" وہ کہتا رہا۔ "کمروں سے مکینوں کی شخصیت کس قدر عیاں ہوتی ہے.......... ذرا سوچو تو۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ "چیلسی میں کملا کا الٹرا موڈرن فلیٹ دیکھا ہے؟ اس کی آرائش سے معلوم ہوتا ہے کہ مکین شدید انٹلکچول، شدید خوش ذوق اور انتہا کی مزاجی حس کی مالک ہے اور ڈائریکٹ۔ اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ اوسٹرلی میں زرینہ کا مکان بھی ایک آرٹسٹ کا مکان ہے لیکن ستھرا، خوبصورت اور گھریلو۔ سینٹ جانز ووڈ میں طاعت اور کمال کا گھر عین میں گلفشاں کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے، وہی ہنگامہ، وہی افراتفری، ہماہمی، مہمانداری۔ حد ہے محرم میں مجلسیں تک تو یہ دونوں کرتے ہیں

یہاں۔

میں نے واشنگٹن میں ہری شنکر کا فلیٹ دیکھا ہے جو بالکل سنگھاڑے والی کوٹھی کا ایکسٹنشن معلوم ہوتا ہے۔ پھر شنیلا دیبی کا کمرہ نشست جہاں ہر چیز شروع سے آخر تک پوز ہی پوز ہے۔''

''تم پوز اور غیر پوز میں فرق کیسے معلوم کر لیتے ہو۔'' چمپا نے اس کی بات کاٹی۔

''نہیں چمپا'' ہم خود کو اپنے پس منظر سے، کبھی اپنے ظاہر کو اصلیت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ پھر وہ رکا۔ ''مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک تمہارا اصل پس منظر نہیں دیکھا۔ چوزے کی سرا کی اسٹول پر بیٹھی تم بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بنارس سے آئی ہو۔ عجیب بات ہے نا۔''

''اچھی بات ہے یا بری؟''

''پتا نہیں، مگر ہمیں اپنے پس منظر سے وفادار رہنا چاہیے جو شاید تم نہیں رہیں۔''

''یہ غلط ہے۔'' چھپا نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں بنارس واپس جانا چاہتی ہوں مگر مجھے کوئی لے جانے والا نہیں ملتا۔''

وہ خاموش ہو گیا۔

''تم کو معلوم ہے'' گوتم نے کہا ''پچھلے سال میں نے تم کو امریکہ سے خط لکھا تھا، میں ایک بے حد خوبصورت علاقے میں گیا ہوا تھا، وہاں ایک دیودار کے جنگل میں بیٹھ کر میں نے تم کو خط لکھا۔ ان دنوں میں جانے کیوں بے حد خوش تھا۔ مجھے

یہ وقتاً فوقتاً اپنے خوش ہوتے رہنے کی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آئی ۔ بہر حال میں نے تم کو لکھا تھا خط ایک عدد............مگر شاید وہ تم کو ملا ہی نہیں ۔''

''مجھے آج تک کوئی خط نہیں ملا۔''

''اب تم پھر رومانٹک ہو گئیں!''

برابر کے مکان میں آشا کے یہاں کسی نے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

''گوتم............کمینے پن پر مت اترو............'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

''تمہارے بنارس واپس جانے کے راستے میں کون چیز حائل ہے ۔ اور تم روتی کیوں ہو بھائی ۔ زندگی میں آنسوؤں کی کمی تو نہیں کہ تم یونہی رونا شروع کر دو بیٹھے بٹھائے ۔ ہنسا کرو ۔ مثال کے طور پر بھیا صاحب کو لو ۔ آج میں نے ان کو سلفرجز سے نکلتے دیکھا اپنی بیگم کے ساتھ ۔ اس قدر خوش تھے کہ کیا بتاؤں ۔ کھلے جا رہے تھے ۔ بڑے تپاک سے انہوں نے میرا تعارف اپنی بی بی سے کروایا ۔ میں نے بھی بہت بشاشت محسوس کیا ۔ دماغی طور پر صحت مند لوگ ایسے ہوتے ہیں جیسے بھیا صاحب ہیں ۔''

''بکواس مت کرو ۔'' چمپا نے کہا اور آتش دان کے کوئلے ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گئی ۔

گانے کی آوازیں اب قریب تر ہو گئیں ۔ اوجیت اور ترونا کی آواز سب میں اونچی تھی ۔ چمپا دریچے کے قریب جا کر سنتی رہی ، پھر واپس آ گئی ۔

''دریچہ بند کر دو ۔'' گوتم نے معاً کہا۔

''ہاں۔'' چمپا نے جواب دیا۔ ''یہ تو رات گئے تک بلڑ مچتا رہے گا۔ لندن مجلس والوں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام معلوم نہیں ہوتا۔''

''ارے رے.........'' گوتم نے چونک کر کہا۔ ''وہاں شاید کمال بھی پہنچ گیا ہو، یہ لوگ رت جگا کیوں کرنے والے ہیں؟''

''صبح یہ سب بوڈا لسپٹ جا رہے ہیں اس لئے۔''

''بوڈا پسٹ؟''

''ہاں، وہیں۔ بالکل وہیں۔ نیلی ڈینیوب کے کنارے۔''

گوتم نے کان لگا کر آواز پہچاننے کی کوشش کی۔

''وہی سارے پرانے کورس ہیں اور اپنا کے گیت۔'' چمپا نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ابھی تمہارا جی ان گانوں سے نہیں بھرا۔''

''ان گانوں سے میرا جی کس طرح بھر سکتا ہے چمپا بیگم؟''

''اوہ۔ میں بھول گئی تھی کامریڈ گوتم.........مگر تم ہی نے کہا تھا کہ دریچہ بند کر دو۔''

اب وہ ''بو جھا ٹھالو ہیا ہیا۔'' گا رہے تھے۔ گوتم نے باہر جا کر باغ کی دیوار پر سے جھانکا۔

بہت سے لوگوں کو ہاتھ ہلا کر ویو کیا اور واپس آ گیا۔ ''نہیں کمال وہاں نہیں ہے۔''

''گوتم ماشٹر۔''

''ہاں بھائی۔''

"کیا میں بہت ہی بیوقوف ہوں؟"

"نہیں تو، لیکن کچھ ایسی زندگی عقلمند بھی نہیں۔"

"بس.......... میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا تم نے بتلا دیا، اب مجھے اطمینان رہے گا۔"

"گرو گوتم کو بلاؤ۔ گرو گوتم کہاں ہے۔" آشا کے گھر میں سے صدائیں بلند ہوئیں۔

"گرو گوتم سریکھا کے یہاں بیٹھا ہے۔" کسی نے جواب دیا۔

وہ باہر جا کر دوستوں سے باتوں میں مصروف ہوگیا۔ "نہیں میں آ نہیں سکتا۔ ایک بے حد ضروری فون کا انتظار کر رہا ہوں۔"

مگر دوسرے لمحے وہ دیوار کود کر گانے والوں کی منڈلی میں جا شامل ہوا۔ چمپا پھر اکیلی رہ گئی۔

اس کی دنیا کی کشش اس کے لئے زیادہ طاقتور ہے، یہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔

بہت دیر بعد وہ سریکھا کے ڈرائنگ رم میں داخل ہوا۔ کمال کا فون تو نہیں آیا تھا؟ اس نے سوال کیا۔ چمپا آتشدان کے سامنے قالین پر لیٹی پڑھ رہی تھی۔ "نہیں" اس نے جواب دیا۔ گوتم نے اس طرح اسے تنہا چھوڑ کر آشا کے یہاں چلے جانے کی معذرت نہیں کی، وہیں بیٹھ کر وہ بھی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ "یار چاء بنائی جائے۔" کچھ دیر بعد اس نے تجویز کیا۔

"تم آشا کے یہاں پی کر نہیں آئے۔"

''ہاں، مگر تم نے جو نہیں پی ہو گی۔ آ شا تم جو اتنی دیر تک آوازیں دیتی رہی۔ تم وہاں آئیں کیوں نہیں۔ اب تم بنا لو چاء اپنے لئے۔''

بہت جلد تم کو میرا خیال آیا۔ چمپا نے کہنا چاہا مگر وہ جھگڑ نا نہیں چاہتی تھی، یہ اس قدر واہیات نسوانیت ہوتی، وہ چپ چاپ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

''آتا بھی ہے چولھا سلگانا۔'' گوتم نے پیچھے سے مذاقاً آواز لگائی۔

''بنارس میں میری اماں خود کھانا بناتی ہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''مگر تم تو کیمبرج پلٹ ہو!''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''چمپا رانی ....'' گوتم آ کر باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ ''آخر اس قدر افسردہ کیوں نظر آ رہی ہو؟''

''اور کیا کروں ناچوں؟''

''یہ تو کوئی جوب نہ ہوا۔ تم تو ایک زمانے میں بڑی سخت بذلہ سنج تھیں۔''

''وہ دیکھو توس جلا دیا تم نے ....''

''افسوس طلعت یہاں موجود نہیں جو تم کو پکوان بنا کر کھلاتی۔''

''چمپا، ایسی واہیات باتیں مت کرو۔''

''گوتم ....'' چمپا نے کیتلی اٹھاتے ہوئے رسان سے کہا۔ ''اگر تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور آئندہ تم سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کروں گی۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اتنے برسوں تم سے دوبارہ ملنے کی آس لگائے رکھی۔''

''چمپا رانی.........'' گوتم باورچی خانے میں آ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا، اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ ''چمپا رانی۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔ ''اصلیت جاننا چاہتی ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تم سے کیا بات کروں۔ تم مجھ کو کیا بتانا چاہتی ہو اور میں تمہیں کیا سنانے کا متمنی ہوں۔ اتنا طویل وقفہ گزر چکا ہے اور ظاہری طور پر ہمارے پاس باتیں کرنے کے لئے کوئی مشترکہ موضوع نہیں ہے سوائے ان خرافات کے جو ہم پچھلے دو گھنٹے سے دھرا رہے ہیں۔'' اس نے سر اٹھا کر چمپا کو دیکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ چولھے کے پاس کھڑی اور زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے چمپا کو آج تک اتنے گھریلو اور پرسکون ماحول میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ چاہ بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

''ادھر آ جاؤ۔'' اس نے ذرا درشتی سے کہا۔ گوتم اس کی آواز کی درشتی سے ڈر سا گیا، وہ پھر آتشدان کے سامنے آن بیٹھے۔

محض کوئی بات کرنے کی خاطر گوتم نے دارجلنگ کے ایک بیگ کو چھوا جو کرسی پر رکھا تھا۔ ''کتنا خوبصورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس میں میں اپنے کاغذات رکھ دوں؟''

''رکھ دو۔''

اس نے لفافے بڑی احتیاط سے بیگ میں ٹھونس دیے۔

اب پھر باتیں ختم ہو گئیں۔

''اس بیگ میں۔'' اس نے گلا صاف کر کے پھر کہنا شروع کیا۔ ''تمہارا

سامان ہے نا چلتے وقت مجھے یہ کاغذات نکال دینا۔ ورنہ سب گڑبڑ ہو جائے گا۔‘‘

’’زیر بحث بیگ‘‘ چمپا نے تلخی سے کہا، ’’میرا نہیں سریکھا کا ہے۔ اس میں تم اپنا سامان رکھ سکتے ہو۔ اسے اپنے گھر لے جا سکتے ہو۔ میری اور تمہاری کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ نہ یہ بیگ، نہ کاغذات، نہ یہ مکان، چیزیں حتیٰ کہ یادیں۔ کچھ بھی نہیں۔ جس میں تمہارے ساتھ حصہ لگا سکوں۔ صرف دکھ مشترک ہے، لیکن تم اپنے دکھ بھی اپنے لئے ہی محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔‘‘

گوتم خاموش رہا۔

’’کیا تم کو معلوم ہے گوتم نیلمبر کہ گو پچھلے سات سال سے میں نے تم کو نہیں دیکھا مگر مجھے پتا ہے کہ تم ہر سمے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اپنے خلاف گواہی دیتے رہے ہو؟‘‘

’’ٹھیک ہے میں جس سے بات کرتا ہوں مجھے لگتا ہے میرا مخاطب میرا کنفیس ہے۔ میرا سارا وجود میرا اعتراف ہے۔ میں نے کتنے قتل کیے ہیں۔ تم کو مارا ہے۔ اپنے آپ کو ختم کیا ہے۔ میرا جرم تمہارے جرم سے مختلف ہے۔ تمہارے اندر معصومیت کا جرم چھپا ہوا ہے۔ ایک بات بتاؤ............‘‘ اس نے رک کر کہا............ ’’تصور گناہ تمہارے نزدیک کیا ہے۔‘‘

’’کسی کا دل دکھانا۔‘‘ چمپا نے سوچ کر جواب دیا۔

’’اور؟‘‘

’’ریا کاری۔‘‘

’’اور؟‘‘

''اور.........اور کمینہ پن۔'' اس نے دماغ پر اور زیادہ زور ڈال کر جواب دیا۔

''سنڈے اسکول کے سبق۔''

''ایں؟'' چمپا نے اس کی بات اچھی طرح نہیں سمجھی۔

''میں نے دل دکھایا ہے، تمہارے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے؟''

''بہت بڑا۔''

''لیکن تم کو جلد یہ معلوم ہو جائے گا چمپا رانی کہ راستے میں بعض ایسے موڑ آتے ہیں جب کسی دوسرے کا دل دکھانا بالکل ناگزیر اور لازمی ہو جاتا ہے۔''

''قاتل بھی قتل کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ یہ قتل بالکل ناگزیر اور لازمی ہے، ورنہ وہ قاتل ہی کیوں بنتا؟''

گوتم پھر خاموش ہو گیا۔

''سر اونچے نیچے ہوتے جا رہے ہیں۔'' کچھ دیر بعد انہوں نے باہر کی آوازوں پر کان لگاتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہارمنی کی طرف بڑھتے ہوئے دفعتاً رک گئے ہیں۔'' اس نے پیانو کے نزدیک جا کر پردوں پر انگلیاں پھیریں۔

''اس کا ایک سر کہیں سے ٹوٹ گیا ہے۔'' چمپا نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ پیانو میں اکثر چوہے اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ میرے پیانو میں، بہرائچ میں، اکثر آدھی رات کو ایک پیارا موٹا سا چوہا اندر تاروں پر دوڑ دوڑ کر سمفنی بجایا کرتا تھا۔''

''تم نے مجھ سے بہرائچ کا ذکر کبھی نہیں کیا۔''

''بڑی پیاری جگہ ہے۔ کیونکہ میرا وطن ہے۔''

''ہم سب ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ ہیں ایک دوسرے کے ساتھ وقت میں مقید ہیں یہ بڑی کوفت کی بات ہے۔'' اس نے چند لمحوں بعد الجھ کر کہا۔

حالانکہ یہ وقت بڑا غیر حقیقی تھا جس میں کمرے کی ہر چیز بے حد روشن اور واضح نظر آ رہی تھی۔ باغ کے پھولوں پر سے برف پگھلنا شروع ہو گئی۔

''یہ جوتا دیکھو۔'' معاً گوتم نے ٹانگیں آگے بڑھا کر سنجیدگی سے کہا۔ ''زندگی اس کی طرح فٹ نہیں بیٹھتی۔'' پھر اس نے ایک توس کا ٹکڑا اٹھا کر بلی کو پھینکا جو دریچے میں آن بیٹھی تھی۔ اس نے توس سونگھ کر چھوڑ دیا۔

''یہ بھی بوہیملین بلی ہے، توس نہیں کھاتی۔ اس کے لئے لوبسٹر اور شیمپین لاؤ۔''

پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا: ''چمپا تم نے اتنے دنوں بیکار میرا انتظار کیا۔ میں بالکل بوگس ہوں۔'' وہ آتش دان کے پاس بیٹھی اسے خود بے حد غیر ضروری نظر آئی۔ غیر ضروری اور سخت بیوقوف اب بھلا اس کی کیا تک ہے کہ اتنی گنوان ہونے کے باوجود مجھ جیسے لپاڑی آدمی کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ حد ہے، بے وقوف لڑکی ہے اور سخت معصوم، بورژوا فلسفی بے چاری۔ اگر اس کے دماغ کو کھرچا جائے اندر سے تو اس میں سے کتنی فالتو مٹی ملے گی۔ ہزاروں سال پرانی مٹی۔ ٹیرا کوٹا۔

''طلعت نے اتنے سارے مشہور لوگوں کے سر بنائے ہیں۔'' اس نے باآواز بلند کہا۔ ''تم نے کبھی اس سے اپنا سر بنوا کے نہ دیا، اب بھی وقت ہے بنوا لو، تم کہیں جا تو نہیں رہیں۔'' اس نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

''فی الحال تو نہیں۔ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے تھے مگر باہر جانے کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔''

''تمھاری اتنی معصومیت بھی غلط ہے۔ بے کار ایک دم۔'' وہ ٹہلتا ہوا مجسموں کی طرف چلا گیا اور کی سر ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ ''کیونکہ.........'' اس نے ایک مجسمے کی ناک چھوتے ہوئے کہا۔ ''ہر دفعہ تم پکڑی جاؤ گی۔ تمہارا خیال ہے تم نے فیصلہ کرلیا اس لئے اب ہر بات آسان ہے حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں۔ ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی۔''

وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ لحہ گھومتا چکر کاٹتا چتا رہا۔ لمحے کا بھنور دور دور تک پھیل گیا۔ ختم ہو گیا، باقی رہا جگمگاتی ہوئی برف پر سے پھسلتی روشنی کمرے میں داخل ہوئی۔ پیٹرن مکمل ترین بن گیا، وہ ساکت وصامت آتشدان کے پاس بیٹھی رہی۔ کمرے کے تجربے میں بلی بھی شریک تھی۔ ہوائیں بھی جانتی تھیں۔ بہت دور سڑک کی موٹریں، راہ گیر، دکانیں.....سب کو معلوم ہو چکا تھا۔

اب سارا وجود ایک کتاب ہے جسے میں پڑھ چکی ہوں اور انت سمے تک کئی بار پڑھوں گی۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

''دو دنیائیں ہر سمے میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک دنیا میں یہ سب لوگ ہیں ☆'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا ''دوسری دنیا میں صرف میں اور تم تنہا ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک پل ہے۔ جس روز یہ ٹوٹ گیا تو کیا ہوگا۔''

''پل تم خود توڑو گے۔''

''نہیں۔ لوگوں نے چاروں طرف مشین گنیں لگا رکھی ہیں۔ جھاڑیوں میں

توپیں چھپی ہیں۔اوپر بادل گرج رہے ہیں۔ایک روز مجھے لگتا ہے لوگوں کی دنیا پاتال میں گر کر غائب ہوجائے گی۔میں باہر ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں گا۔یہ سوچ کر دل ڈوب جاتا ہے۔''

''تم اپنی اسپوٹ لائٹ لئے چھت کی کڑیوں میں چھپے بیٹھے ہو، جو شامت کا مارا اسٹیج پر آتا ہے تم انتہائی کمینے پن سے اچانک لیمپ کا رخ اس کی طرف کر دیتے ہو، وہ روشنی میں عیاں ہوجاتا ہے۔''

''میں خود بھی تو برابر اس روشنی میں ہوں۔''

''نہیں تم پردوں کے پیچھے چھپے رہتے ہو۔اگر کسی روز ایک سرچ لائٹ تم پر پڑ گئی تو کیا ہوگا۔اس دن تم اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر سرپٹ نکل بھاگو گے۔کھڑکیوں میں لوگ تمہیں نظر آئیں گے۔اسٹوو کے گرد بیٹھے بحثیں کرتے، کھاتے پکاتے، کھاتے تم کسی آوارہ گرد بلے کی طرح چاند کے مقابل میں چھت کے ٹائلوں پر دبے پاؤں چلتے ہوئے آؤ گے۔تمہارا چہرہ ہمیں کھڑکی کے شیشوں میں سے نظر آئے گا۔بوگی مین!''

''اور اس سمے میں تمہارے ساتھ وہیں موجود ہوں گا: اسٹوو کے گرد بحثیں کرتا، کھانا بناتا، کھاتا، اور تم مجھے کھڑکیوں میں سے جھانکتا دیکھو گی..........بوگ وومن!!''

وہ خاموش ہوگئے۔

وہ اچک اچک کر دیواروں کی تصویریں دیکھتا پھرا، پھر دریچے کی طرف چلا گیا۔

''اج بہت برف پڑی۔'' دریچے میں کھڑے گوتم نے ایک جنرل اسٹیٹمنٹ دیا۔

ابھی، اس کی بعد بھی باقی ہے۔ اس کے بعد، جو موت تک، ابد تک پھیلتا چلا جائے گا، موجود رہے گا۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

''سریکھا کا باغ کتنا خوبصورت ہے۔'' گوتم نے کمرے کی طرف سے پشت کیے کیے دوسرا بیان دیا۔

میری کوئی قسمت نہیں۔ سنا ہے لوگوں کی قسمتیں ہوتی ہیں۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

معاً وہ چونکا اور پیچھے مڑا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا.......... سورج ڈھل چکا.......... شام آ گئی.......... میں ابھی یہیں ہوں.......... میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اتنا وقت برباد کیا۔ اتنا انمول۔ انمول وقت.......... وہ بڑبڑایا اور تیر کی طرح گیلری کی اور بڑھا ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پارسل پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر چمپا کو نہیں دیکھا۔ پارسل جھپٹ کر وہ بگولے کی طرح باہر نکلا اور موٹر میں بیٹھ کر دیوانہ وار مڈ ہرسٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چمپا نے جھک کر دار جلنگ کے بیگ سے کمال کے نام کے وہ لمبے لمبے سرکاری لفافے نکالے جو گوتم یہیں بھول گیا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔

ایک ایک کر کے ہر ٹائپ شدہ خط میں کمال کی ملازمتوں کی درخواستوں کو

نامنظور کیا گیا تھا۔

۹۱

"آئے پریم پگے پروانے۔ جوال مئی چھوی کے دیوانے
جڑ چلمن کے پیچھے رے بیٹھی
دیپ شیکھا لہرائے رے۔ دیپ شکیھا لہرائے رے۔
دیپ شکیھا لہرائے رے"

چندرا گاتی ہوئی باغ سے کھانے کے کمرے کے اندر آ گئی۔

"طاعت............چاء............" اس نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

طاعت نے چاء انڈیلی۔

سریکھا انہاک سے وِیڈیو ٹیون کرتی رہی۔ زرینہ نے باغ کے رخ دروازے میں پھیلی ہوئی دھوپ میں ایزل رکھ کر ایک اور تصویر شروع کر دی۔ پڑوسن نے باڑ پر سے سر نکال کر تھوڑی سی شکر مانگی۔

دنیا کا کام سکون سے جاری رہا۔ بلکہ جب سے نرملا مری تھی دنیا کا کام اور زیادہ سکون سے جاری تھا۔ سب اپنی اپنی مصروفیات میں اس طرح جٹے تھے گویا اس سے پہلے انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ اسی شدید مصروفیات کے مارے وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ طاعت اخبار کی رپورٹیں

لکھتی۔ کملاڈل ٹمپل میں ڈنر کھاتی۔ فیروز کتابیں سنبھال کر بڑی سعادت مندی سے روز یونیورسٹی کا رخ کرتی۔ کمال شکستلا یا سریکھا کے ڈرائنگ روم میں آتش دان کے سامنے اوندھے لیٹ کر مزید درخواستیں لکھتا۔ ہری شنکر نے ایک نیا مشغلہ شروع کر دیا تھا۔

وہ چڑیوں کے پر جمع کیا کرتا۔

نرملا کو مرے آج محض دسواں روز تھا مگر معلوم ہوتا جیسے اسے ان لوگوں سے رخصت ہوئے کئی سو سال گزر چکے ہیں۔ وقت ربر کی طرح پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

جس روز ایک جھٹکے کے ساتھ ربر کا یہ تناؤ ٹوٹے گا تو کیا ہوگا۔

''اب ہمیں نرمل کے دسویں کی فکر کرنا چاہیے نا؟'' شنکر نے چڑیوں کے پروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس طرح کمال سے کہا جیسے وہ اکثر اس سے پوچھتا تھا:

''اب ہمیں نرمل کے بیاہ کی فکر کرنا چاہیے نا۔''

''ہاں۔ شاید۔'' کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

''یہاں کوئی پنڈت جی بھی نہیں ہیں جن سے پوچھ لیتے کہ آج کے روز ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا۔'' طلعت نے بھی ہری شنکر ہی کی طرح بڑے عملی انداز میں بات کی۔ برا بھلا زندگی کا کاروبار نرملا نپٹا کر چلی گئی تھی مگر اس کی موت کے بعد کے کاروبار تو ابھی باقی تھے۔

شنیلا دیبی پوچھ رہی تھیں کہ اگر تم لوگوں نے دسویں کا کچھ انتظام نہ کیا ہو تو فکر نہ کرو۔ سوامی دیویکا نند جی کہہ رہے ہیں کہ ان کے سنٹر میں..........

''جی.......... جی ہاں.......... جی بہت اچھا..........شکریہ......'' کمال

نے ریسور رکھ دیا۔

موت بھی سوامی دیویکا نند کی طرح فراڈ ہے۔

اب پھر وہ سب اپنی شدید بہادری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے اپنے مورچوں پر جا بیٹھے۔ طلعت نے ایک مضمون ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ سریکھا گیلری میں جا کر ڈانس کی مشق میں مصروف ہوگئی۔ ہری شنکر نے پروں کا البم اٹھا لیا۔

وقت کا سناٹا بہت سی توپوں کی طرح گرجنے لگا۔ گھڑی نے تین بجائے۔ کمال نے بزبان خاموشی ہری شنکر سے کہا۔ ''سر روجر سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینے جانا ہے۔'' کیونکہ اس لرزہ خیز جملے کو الفاظ میں تو نہیں ادا کیا جا سکتا تھا۔

''لے آؤ۔'' ہری شنکر نے اسی خاموشی سے جواب دیا۔

''مڈ ہرسٹ سے نرملا کا سامان بھی آنا ہے۔'' طلعت نے اپنے خاموش الفاظ بھی اسی سناٹے میں انڈیل دیے۔

''لیکن ہم مڈ ہرسٹ کس طرح جا سکتے ہیں؟'' کمال نے اسی طرح احتجاج کیا۔

ہر شنکر نے ان الفاظ کو ڈی کوڈ کیا۔ وہاں، مگر ہم بہت بہادر ہیں۔ ہم ضرور جائیں گے۔ ہم سرٹیفکیٹ بھی لائیں گے اور اس کا سامان بھی۔ چلو اٹھو۔ اپنے اپنے زرہ بکتر پہنو۔ لفٹ رائٹ۔ مارچ کرو۔ اپنے پرانے آزمودہ ہتھیار سنبھالو۔ چلو ہم جا کر نرملا کے زرہ بکتر اور ہتھیار واپس لے آئیں جن کی اب اسے ضرورت نہیں۔

اس نپٹو مائم کے بعد، جسے کسی نے، خود انہوں نے نہیں دیکھا، وہ سب باہر نکلے، موٹر میں بیٹھے اور ایک جانے پہچانے راستے پر روانہ ہو گئے۔ چار سال تک متواتر وہ اس سڑک پر سے گزر کر سینی ٹوریم جاتے رہے تھے۔

اب وہ آخری بار مڈ ہرسٹ سے لوٹ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ خاموشی سے موٹر سے اتر کر وہ اس روڈ ہاؤس میں گئے جہاں وہ ہمیشہ نارنگیوں کے سائے میں بیٹھ کر چاء پیتے تھے۔ روڈ ہاؤس کی مالکہ موٹی سارہ نے باہر آ کر ان کے سامنے چاء رکھی، وہ بھی اس نپٹو مائم میں شامل ہو گئی۔

سینٹ جانز ووڈ میں اپنے فلیٹ پر واپس پہنچ کر کمال نے سارا سامان گیسٹ روم میں رکھ دیا جس میں ہری شنکر ٹھہرا ہوا تھا۔

جب سب لوگ اپنے مورچوں پر واپس لوٹ گئے تو طلعت نے چوری سے نظر بچا کر اپنا مورچہ چھوڑا، اپنا زرہ بکتر اتار کر گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔

ہری شنکر پروں کا البم میز پر ڈال کر کمال کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز لیمپ کی روشنی میں بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔ آبنوس کا فرنیچر۔ وکٹورین وضع کا اونچا سائیڈ بورڈ جس پر الم غلم بہت سی فالتو چیزیں رکھی تھیں۔ دیوار پر ایک موڈ ڑن پینٹنگ لگی تھی جسے ایک مرتبہ طلعت کسی کباڑی کی دکان سے بہت سستی خرید لائی تھی۔ ایک تانبے کا سو سال پرانا مجسمہ جو ایک مرتبہ طلعت نے کیمڈن ٹاؤن میں ایک کباڑیے سے محض چند شلنگ میں خریدا تھا۔ پرانے اخبار اور رسالے۔ تقریباً شکستہ صوفہ۔

ان سب چیزوں کے درمیان گھرے ہوئے، جب کہ نرملا کا سامان اس کے

قدموں میں پڑا تھا، اسے لگا گویا اس کی زندگی، ساری زندگی ایک بہت عظیم الشان کباڑی کی دکان ہے۔ یہ سب سامان فالتو ہے۔ ان سب چیزوں کو ذرا بیچ کر تو دیکھو۔ اپنی زندگی کو ذرا اس کباڑی مارکیٹ میں رکھو۔ موت اس کی قیمت ہے۔

موت؟

دفعتاً پھر اس کے کانوں میں ایک توپ دغی۔ موت۔

سامنے سائیڈ بورڈ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں کماری نرملا سریواستوا کی راکھ تھی۔ اس کی کنجی ہری شنکر کے پاس تھی جو گویا اس کا قانونی وارث تھا۔ اس مرتبان کو گنگا میں بہانے کے لیے اپنے ساتھ واپس وطن لے جائے گا۔ جو اس وقت کمال کے ساتھ اسی موت کے سلسلے کے باقی ماندہ آخری انتظامات کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ آخری انتظامات۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ۔ گیتا کا پاٹھ۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ۔

ہر شے میں بڑی واقعیت تھی، وہ مرتبان بھی اتنا ہی ٹھوس اور حقیقی تھا جیسے یہ کرسی یا وہ صوفہ۔ یا کھانے کے برتن۔

کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ موت ماورائی ہے۔

موت سے زیادہ پھٹیچر سیکنڈ ویٹ بات کیا ہوگی۔

یعنی ذرا یہ غور کیجئے کہ دوسروں کی موت پر چھکو پھکو روتے ہیں اور پھر خود مر جاتے ہیں۔

ارے میں کہتی ہوں رونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک سخت ایڈیٹ لڑکی تھی۔ اس کا یعنی کہ انتقال ہوگیا۔ کون سی ایسی طرم جنگ تھی۔

اور لکھنؤ میں آپ ردولی والی ثریا باجی کے مرنے کی خبر سن کر کتنا روئی تھیں۔ جب کمال نے ڈانٹا تھا کہ صرف دو دفعہ ہی تو ملی تھیں ثریا باجی سے، اس قدر دہاڑیں کیوں مار رہی ہو، تو اس نے جواب دیا تھا، میں تو اصولاً رو رہی ہوں۔ جب کسی کا دیہانت ہو جائے تو کیا ہنسنا چاہئے؟

یوں بھی سب کو ثریا باجی کے انتقال کا بہت غم ہوا تھا کیونکہ مرحومہ بارہ بنکی والے اصغر بھائی پر جان دیتی تھیں اور اصغر بھائی نے وعدہ تو ان سے بیاہ کا کیا تھا مگر ایک روز نینی تال جا کر کسی عیسائی لڑکی سے انہوں نے شادی رچالی تھی اور اس صدمے سے ثریا باجی کو سل ہو گئی تھی اور کئی سال تک ردولی کی نیم تاریک کوٹھڑی میں پلنگ پر پڑے رہنے کے بعد انہوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا تھا۔

اور چونکہ وہ نہ رقاصہ تھیں نہ انٹلکچول نہ لیکھکا نہ چتر کار نہ ہی لیڈر لہذا نہ ان کی تصویریں چھپی تھیں نہ ان پر مضمون لکھے گئے۔ ان کے جہیز کے کپڑے اور ان کی حیدر آبادی چوڑیاں زنانہ اسلامیہ یتیم خانے میں بھجوا دی گئی تھیں اور ان کے چالیسویں کے بعد، جس میں لکھنؤ سے رشتے دار آ کر شریک ہو گئے تھے، گویا اسٹیج پر پردہ گر گیا تھا۔ ہاں ان کے مرنے کے دوسرے روز لکھنؤ کے مسلم اسکول کے اسمبلی ہال میں ان کی مغفرت کی دعا بھی مانگی گئی تھی جہاں انہوں نے ایف۔ اے تک پڑھا تھا۔

یوں بے چاری ثریا باجی کی زندگی کا افسانہ ختم ہوا تھا جو کوئی ایسا لمبا چوڑا افسانہ بھی نہ تھا۔ ایک بڑے، غیر اہم قصے کا بے حد غیر اہم سب پلاٹ تھا۔

ٹپکل مسلم سوشل پکچر۔

مگر نرملا تو بڑی غیر معمولی لڑکی تھی۔

وہ بھی اس معمولی طریقے سے ختم ہوگئی۔

اری نرملا کی بچی۔ایڈیٹ۔ارے بھائی تو بھی اتنی ہی حقیر نکلی۔کہاں گیا وہ تیرا سارا فلسفہ اور آئیڈیالوجی،مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ سچ مچ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ..........وغیرہ.....واقعہ صرف یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی کیا تھی۔لمبی چوڑی۔ساری عمر تو محنت کرتے،پروگرام بناتے گزری۔ رات رات بھر پڑھا جارہا ہے کہ فرسٹ ڈویژن مل جائے۔یا اللہ۔اچھا سیکنڈ ڈویژن ہی مل جائے۔ہائے بھگوان کم از کم پاس ہی ہو جائیں۔سچی،پھر ملک اور قوم کی فکر میں جان دے دے رہی ہیں۔لڑتی بھڑتی پھر رہی ہیں۔جہاں کسی نے کوئی غلط بات کہی اور یہ کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ہر بحث میں یہ کودنے کو موجود، پھر جب فرسٹ کلاس مل گیا تو کیمبرج جانے کے لیے انہوں نے مہنا متھ مچادی۔ ان کے بابا نے بڑی مشکل سے روپیہ جوڑ کر ان کو ولایت بھیجا،وہاں یہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔کئی دن تک تو ان کو یقین نہ آئے کہ یہ واقعی کیمبرج میں موجود ہیں۔سہمی سہمی پھریں کہ یہ خواب ہے،جلد ٹوٹ جائے گا،پھر پروگرام بنے کہ جب یہاں سے پڑھ کر نکلیں گی اچھی سے اچھی ملازمت ملے گی۔بابا پر جو قرضہ چڑھا ہوا ہے وہ اتاریں گی۔بھین کے لیے بہو ڈھونڈیں گی۔پری زاد بالکل،پھر ذرا پیسے جمع ہو گئے تو میکسیکو کی سیر کریں گی جا کر۔(یہ جانے میکسیکو جانے کا اتنا شوق کیوں تھا۔)یہ موہوم سی امید تھی کہ ایک روز ایک اپنا مکان بھی بنے گا۔اس میں ایک چھوٹا موٹا سا باغ ہوگا۔روک گارڈن۔مکان کا نام رکھیں گی..........کسی

قسم کا کنج............یا کچھ اور............خیر............کوکل جی سے پوچھ لیں گی، وہ شاعرہ ہیں۔اتنی تو تھی مستقبل کی چنتا، پھر یہ کہ بلیاں پل رہی ہیں، کتے، کبوتر، گائیں، بھینسیں پالنے کا بھی شوق ہے اور ساریوں پر تو خیر دم نکلتا ہے۔ نیا اوور کوٹ بنانے کے لیے وہ مہابھارت مچائے ہوئے ہیں۔ضد ہے کہ جیسے زمرد کے گہنے لاج کے بنے ہیں ایسے ہی میرے بھی بنیں۔اپنی سہیلیوں کے لیے جان حاضر ہے۔چند لوگوں سے سخت جلن بھی ہے۔محبت کی اہلیت بھی ہے۔ جو ہر انسان، ہر جاندار میں ہوتی ہے۔

پھر ہوا یہ کہ کیمبرج میں ان کو بخار ٹھہر گیا۔ان کو ہسپتال پہنچا یا گیا جہاں کئی سال تک پلنگ پر لیٹے رہنے کے بعد ایک روز آپ نے جان شیریں جان آفریں کے سپرد فرما دی۔

تو کیا اس موت پر اصولاً رونا چاہیے۔قطعی نہیں۔ یہ تو بڑی سخت ہنسی کی بات ہے۔ دراصل اس سے زیادہ لطیفے کی بات تو طاعت نے بہت دنوں سے نہیں سنی تھی۔

اس نے کمرے کا چکر لگایا۔ سارے فلیٹ میں گھومی۔ باغ کے سرے پر باورچی خانے میں روشنی ہو رہی تھی۔چندرا اور سریکھا کے سائے دریچے میں سے نظر آ رہے تھے، گھوم پھر کر وہ پھر ہری شنکر کے کمرے میں واپس آ گئی۔فرش پر بیٹھ کر اس نے نرملا کے سامان کو اکٹھا کر کے سنگوانا چاہا۔ بے دلی سے اس نے چیزیں الٹیں پلٹیں۔کتابوں کے بکس میں گیتا پر اس کی نظر پڑی۔اسے نکال کر وہ ڈرائنگ رم میں لے آئی۔

لیمپ جلا کر اس سے اصولاً گیتا کا صفحہ کھولا اس احساس کے ساتھ کہ گویا وہ شانتی کے حصول کے لیے اس آسمانی صحیفے کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس نے بے حد دھیان سے پڑھنا شروع کیا:

............ان کو بہادری سے جھیل......

جسم فانی ہیں لیکن ان جسموں کے اندر رہنے والی روحیں امر ہیں۔ چنانچہ لڑ۔ او بھارت کے فرزند۔ آتما نہ قتل کرتی ہے نہ خود قتل ہوتی ہے۔ تلوار اسے زخمی نہیں کر سکتی۔ آگ اسے جلا نہیں سکتی۔ پانی اسے بھگو نہیں سکتا۔ ہوا اسے خشک کرنے سے قاصر ہے۔ جو پیدا ہوا اس کی موت یقینی ہے۔ جو مرا اس کی پیدائش اٹل۔ اس میں دکھ کی کیا بات ہے؟

دکھ اور سکھ، نفع نقصان، ہار جیت کو ایک سمجھ کر تو جنگ کر۔

تب ارجن نے کہا: او کیشو، اگر خرد کی راہ عمل کی راہ سے افضل ہے تو تو مجھے جنگ کرنے کے لیے کیوں کہتا ہے؟ جنگ کا عمل خوفناک ہے۔

بھگوان نے جواب دیا: انسانوں کو کام نہ کر کے کرم سے نجات نہیں مل سکتی۔ نہ کرم سے بے نیاز ہو کر وہ مکمل بن سکتا ہے کیونکہ پراکرتی سے پیدا شدہ گنوں کے زیر اثر انسان متواتر مصروف عمل رہتا ہے۔

او ارجن! تو اور میں کئی بار پیدا ہوئے ہیں۔ گو میں خداوند عالم ہوں لیکن اپنی پراکرتی پر قدرت رکھتے ہوئے اپنی مایا کے ذریعے خود وجود میں آتا ہوں۔ او بھرت، جب دنیا میں نیکی کا زوال ہوتا ہے تو میں خود کو مجسم کر لیتا ہوں اور جو میری الوہی پیدائش اور میرے عمل کو پہچان لیتا ہے، اے ارجن، وہ اپنا جسم چھوڑنے کے

بعد دوبارہ پیدا ہونے کے بجائے مجھ سے آن ملتا ہے۔ بڑے بڑے گنوان گھبرا جاتے ہیں کہ کرم کیا ہے اور نہہ کرم کیا، وہ جونہہ کرم میں کرم اور کرم میں نہہ کرم دیکھتا ہے وہی اصل گنوان ہے۔اوارجن، عقل کی آگ کرموں کو جلاکر راکھ کردیتی ہے۔

او جنارڈھن، میری پراکرتی مٹی، پانی، ہوا، آکاش، دماغ، ذہن اور انانیت میں منقسم ہے۔ یہ ادنیٰ دتجے کی پراکرتی لیکن مضبوط بازوؤں والے شہزادے، میری اعلیٰ پراکرتی وجوداور حیات کے احساس اور شعور میں موجد ہے جس کے سارے یہ کائنات قائم ہے میں ہی ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا! او کنتی کے بیٹے، میں پانی کا سوادا ہوں۔سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے ویدوں میں لکھا ہوااوم ہوں۔ میں آکاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کی اجتماعی خودآگہی ہوں۔میں زمین کی متبرک خوشبو ہوں۔میں سارے جانداروں کی جان ہوں۔راہبوں کا زہد ہوں۔جوجس عقیدے سے میری عبادت کرتا ہے میں اسے بھگتی میں تبدیل کردیتا ہوں۔میں عالم الغیب ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔

میں عبادت کے مختلف طریقے ہوں۔ میں ہی جڑی بوٹی ہوں اور پوجا کی آگ۔ میں خود ہی پوجا کا عمل بھی ہوں۔ میں کائنتا کا باپ ہوں۔ میں ہی ماں۔ راستہ ہوں اور گواہ اور آخری جائے پناہ۔ابتداء۔انتہا۔آرام گاہ۔گنجینہ اور ازلی بیج۔اوارجن! میں تپش پیدا کرتا ہوں۔مینہ برساتا ہوں۔ میں ابدیت ہوں۔ میں موت ہوں۔میں وجوداور عدم وجود ہوں۔میں وشنو ہوں۔

ویدوں میں میں سام وید ہوں۔دیوتاؤں میں اندر۔حواس میں ذہن ہوں

اور خود آگہی۔ روروں میں شنکر ہوں۔ پ انیوں میں مہا ساگر۔ الفاظ میں اوم۔
عبادت میں جاپ۔ نہ ملنے والی چیزوں میں ہمالیہ ہوں۔ رشیوں میں نارو۔ میں
فلسفی کپل ہوں۔ گھوڑوں اور شاندار ہاتھیوں اور انسانوں میں الگ الگ میرا
بادشاہ کا رتبہ ہے۔ ناگوں میں میں انت ہوں۔ پانی کے باسیوں میں دوون۔
فرمانرواؤں میں یم۔ پیائش میں میں وقت ہوں۔ جنگلی جانوروں میں شیر ببر۔
پرندوں میں گرڑ۔ جنگجو بہادروں میں رام۔ دریاؤں میں گنگا ہوں۔

میں بے پایاں وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں۔ میں عورت کی گفتار اور
ذہانت، وفاداری اور رحم دلی ہوں۔ میں گائتری منتر ہوں۔ میں جیت ہوں۔
صوفیوں میں میں ویاس ہوں۔ رتوں میں بسنت ہوں۔ اناجوں میں جو۔ میں
سنسار کا آد، مدھ اور انت ہوں۔ میں رازوں کا سناٹا ہوں۔ اوارجن! میرے الو
ہی مظاہر بیکراں ہیں۔

اوارجن۔

اوارجن کے بچے۔ ایڈیٹ۔

وہ کتاب زور سے بند کر کے پھر اٹھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے والا
تھا۔ ابھی ہری شنکر اور کمال لوٹتے ہوں گے۔ اس نے ابھی ہری شنکر کا کمرہ بھی
ٹھیک نہیں کیا تھا، وہ دوبارہ گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے
ایک بار پھر نرملا کی چیزوں کو درست کرنے کی کوشش کی: ساریاں۔ جوتے۔
چوڑیاں۔ میک اپ کے پٹارے۔ ہینڈ بیگ جس میں دنیا بھر کی الابلا جمع تھی جو
لڑکیوں ہی کے ہینڈ بیگ میں سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ بس کے ٹکٹ۔ لانڈری

کے بل۔ پرانے خالی لپ اسٹک۔کانوں کے بندے۔پنیں۔ پیسے خریداری کی فہرستیں اور جانے کیا کیا۔ان سب چیزوں پر چار سال قبل کی تاریخیں پڑی تھیں۔ چار سال سے نرملا دنیا سے الگ تھلگ سینی ٹوریم میں مقید تھی، پھر اس نے نرملا کی کتابوں کا بکس پیک کرنا چاہا۔ایک کتاب میں سے ایک تصویر ٹپ سے نیچے گری۔طلعت نے جھک کر اسے اٹھایا۔

یہ گوتم نیلمبر کی تصویر تھی جو آج سے دس سال قبل بردکھوے کے لیے بہرائچ سے سنگھاڑے والی کوٹھی بھیجی گئی تھی۔طلعت نے خالی خالی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھا اور اسے کتاب میں واپس رکھ دیا۔

ہال میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔لڑکے واپس آ چکے تھے۔

سریکھا نے کھانے کی میز پر سے آواز لگائی۔

طعلت، ہری شنکر کا کمرہ قرینے سے ٹھیک کر کے محاذ پر واپس چلی گئی۔

برف باری شدید ہو چکی تھی۔

اس رات، جب ہری شنکر سو چکا تھا، طلعت نے اس کے کمرے میں دبے پاؤں جا کر کتاب میں سے گوتم کی تصویر نکالی۔اپنے کمرے میں آ کر اس تصویر کو جوتوں سے خوب ہی مارا جب جا کر اسے ذرا شانتی کا احساس ہوا۔تب وہ فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چونکہ وہ پچھلے دس روز سے نہیں روئی تھی۔

روتے روتے وہ بیہوش ہو گئی اور گھر میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے ایک اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔

۹۲

ساری دنیا نے سفید برف کا کفن پہن لیا۔سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوئے درخت ایسے نظر آرہے تھے جیسے کسی مصور نے کینوس پر پھیلے ہوئے چائنا وائٹ پر سیاہ رنگ سے ادھر ادھر آڑی ترچھی لیکریں کھینچ دی ہوں جن کے عقب میں مکانوں میں سے چھنتی ہوئی اداس زرد روشنی کے دھبے سے چاروں طرف پ ھیلے تھے۔ بڑے زور کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اس عظیم کینوس کے ایک کونے میں ایک خوبصورت دومنزلہ کاٹج تھا جیسے کاٹج عام طور پر اوسٹرلی میں جا بجا ہیں۔ایونیو میں داخل ہوتو بائیں ہاتھ پڑتا تھا۔سامنے چھوٹا سا روک گارڈن تھا جو بہار کے زمانے میں پھولوں سے لد جاتا۔سامنے مناسا برآمدہ تھا جس کی سرخ اینٹوں کی دیوار پر تانبے کی لالٹین نصب تھی۔اندر گیلری تھی جس میں سے زینہ اوپر بیڈ رمز کو جاتا تھا۔ نیچے نشست کا کمرہ تھا اور کھانا کمرہ اور گیلری کے سرے پر پارلر تھا۔اس کے اندر جا کر باورچی خانہ۔ پیچھے لان تھا جس کے سرے پر شاہ بلوط کا درخت کھڑا تھا۔گھر والوں کا زیادہ وقت پارلر میں گزرتا تھا جہاں وائرلیس سیٹ اور ٹیلی ویژن کرھا تھا، وہیں کھانا بنتا، برتن دھوئے جاتے، اسٹوو کے پاس بیٹھ کر گپیں ہوتیں۔جاڑوں کے زمانے میں زرینہ سر پر اسکارف لپیٹے، پتلون پہنے باہر کولری میں سے لکڑیاں نکال کر سوں سوں کرتی اندر لاتی اور ڈرائنگ روم کا آتش دان دہک اٹھتا۔تب دنیا

ایک دم بے حد محفوظ معلوم ہونے لگتی ۔ آتش دان پر ایک موڈرن مجسمہ رکھا تھا۔ دیوار پر آشا کا بڑا سا پورٹریٹ تھا۔ جو زرینہ نے ماتیس کی طرز میں بنایا تھا بڑا سا ایرانی قالین تھا۔ بڑے بڑے اسٹینڈرڈ لیمپ۔ دریچے میں سے باہر حد نظر تک برف دکھلائی دیتی۔ ریڈیو پر اپنے پسندیدہ نغمے بجتے۔ دوستوں کے فون آتے اب تک بڑی پرامن، سیدھے سادے پرسکون احساسات سے گھری ہوئی زندگی گزر رہی تھی۔

زرینہ یہاں اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی اور یونیورسٹی میں روسی ادب اور فارسی میں بی۔ اے آنرز کر رہی تھی۔ سلیڈز سے آرٹ کا ڈپلوما لے چکی تھی۔ اس کے والد بیرسٹر تھے۔ اس کی جواں سال، سرخ بالوں والی ماں، جو نسلاً انگریز تھیں مگر خالص لکھنؤ ی زبان میں گفتگو کرتی تھیں ٹکسالی محاورے بولنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ بے حد محبت والی بی بی تھیں اور بے حد خوش مزاج اور پر مذاق۔ ان کا گھر زرینہ کی دوستوں کے لیے ہمیشہ جائے پناہ کا کام دیتا اور وہ ان سے بڑی بہنوں کی طرح پیش آتیں۔

اس وقت زرینہ پارلر میں میز پر بیٹھی ایک روسی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

اتنے میں گلیری کی گھنٹی بجی۔ زرینہ نے اٹھ کر دریچے میں سے جھانکا۔ برف سے جوتے لت پت کیے، اوورکوٹ کے کالر سے منہ ڈھانپے سامنے گوتم کھڑا تھا۔ زرینہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

وہ ہاتھ میں اٹیچی کیس لیے سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گیا۔

''یہ پانچواں شہر ہے۔ یہاں بھی روشنیاں جل رہی ہیں۔ میرا خیال تھا یہ

جگہ مختلف ہو گی۔"

"مگر افسوس کہ تمہارا خیال غلط ثابت ہوا۔ اندر آ جاؤ۔" زرینہ نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔"

"ان کو بھی بلا لو اندر۔"

"کیسے بلا لوں۔ اس روشنی میں تم ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکو گی۔"

"وہ کون لوگ ہیں۔"

"بہت سے بھوت۔ لاشیں۔ ارواح خبیثہ، وہ سب میری دوست ہیں اور باہر اندھیرے میں دانت نکوسے کھڑی ہیں۔ ان کا جلوس میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔"

"مجھے ان سے ڈر نہیں لگے گا۔"

"تمہیں ان سے ڈر نہیں لگنا چاہیے کیونکہ ہم سب برابر خود ان لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، مگر۔" اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "میرا خیال تھا یہ جگہ مختلف ہو گی۔ یہاں اندھیرا ہو گا، لیکن تم نے یہاں بھی دیوالی منا رکھی ہے۔ روشنی میں تم کیا دیکھنے کی کوشش کرتی ہو بھائی؟"

وہ اکتا کر اپنے اٹیچی کیس پر بیٹھ گیا۔ زرینہ نے گیلری کا دروازہ کھولا۔

"گوتم۔ میرا مطلب ہے، کہ تم واپس آ گئے ہو، جہاں بھی گئے تھے۔ یعنی کہ۔ دراصل ہم سب بے حد پریشان تھے تمہاری وجہ سے۔"

"میں تم سب کا ممنون ہوں۔"

''میرا مطلب ہے کہ..... ویلکم ہوم..... ہوم جہاں کہیں بھی ہو یعنی۔ ہر سفر کے بعد کا عارضی پڑاو۔''

''ٹھیک ہے۔''اس نے شان استغنا سے ہاتھ ہلایا۔''میں نے تمہارا سواگت قبول کیا''، پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔''یہ مکان تو وہ والا نہیں ہے جس میں تم رہا کرتی تھیں۔ آرٹسٹ کا مکان۔''

''وہی ہے۔''

''اچھا۔''اس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔''تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔ زرینہ کیا میں خبطی ہو گیا ہوں؟''

''نہیں تو۔''اس نے گھبرا کر جواب دیا۔''محض تم تھکے ہوئے زیادہ لگ رہے ہو۔''

''متواتر بھاگتے رہنے سے انسان تھک ہی تو جاتا ہے۔ میں جانے کتنے لاکھوں کروڑوں میل چل چکا ہوں اب تک۔''

''تم کہاں تھے؟''

''میں..... یہ کیوں بتاؤں۔''اس نے بچوں کی طرح جواب دیا۔''کئی راتیں میں نے کھیتوں میں گزاریں۔ بھوسے کے ڈھیروں پر سویا۔ ندیوں کی کشتیوں میں گھسا بیٹھا رہا۔ اسٹیشنوں کے ویٹنگ رومز میں چھپتا پھرا۔ سارے میں پولیس کی نظروں سے بچا بچا گھوما کیا۔ تب آج میں نے کہا کہ کیوں نہ ایک شریف بہادر انسان کی طرح سامنے آ کر اقبال جرم کر لوں۔''

''پولیس؟''

''ہاں۔ کیا تم کو نہیں معلوم؟''

''نہیں تو .... کیا؟''

''میں نے، زرینہ بیگم ....'' اس نے بڑے ٹھاٹھ سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کہنا شروع کیا۔ ''میں نے دو قتل کیے ہیں۔ تب سے مارا مارا پھرتا ہوں کہ کہیں سر چھپانے کو ٹھکانہ مل جائے۔ واپس آ کر سارے دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر سب دروازے بند تھے اور اندر تیز روشنیاں جل رہی تھیں، پھر میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا لاؤ تمہیں بھی آزما لوں۔''

''اندر آ جاؤ گوتم .... یہاں ہوا بہت تیز ہے۔''

''مگر تم پولیس کو خبر تو نہ کر دو گی۔'' اس نے سہم کر پوچھا۔

''قطعی نہیں۔''

''نہیں میں یہیں بیٹھوں گا۔ گھروں کی چھتیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔''

زرینہ نے اسکارف سر کے گرد لپیٹ کر جھکڑ کی زد سے بچنا چاہا۔ برف کے گالے چاروں اور بکھر گئے۔

''سنو زرینہ بیگم۔'' اس نے اٹیچی کیس پر بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر اس سے کہا۔ ''میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے دو قتل کیے ہیں اور کمال یہ ہے ....''

وہ ہنسا ..... ''کہ میں اس قدر چار سو بیس ہوں کہ میرے دونوں مقتولوں کو اس کا علم تک نہ ہوا کہ میں نے ہی ان کا کام تمام کیا ہے۔'' اب دفعتاً اس کی آواز بالکل نارمل ہو گئی۔ ''اس روز جب میں سریکھا کے یہاں سے پارسل لے کر بھاگم بھاگ

ہسپتال پہنچا تو نرملا نے مجھے پہچان کر نہ دیا کیونکہ وہ مر چکی تھی اور جب میں اسی رات وہاں سے لوٹ کر شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا تو مجھے چیلسی کے ایک پب میں چمپا احمد نظر آئی اور اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا...... کیونکہ وہ بے حد ڈرنک تھی.......... چنانچہ.........''اس نے بڑے فخر سے کہا........''میں اس قدر کا ماہر فن کروک ہوں.........دیکھا تم نے۔''

برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت پانی اور برفیلی کیچڑ کے چھینٹے اڑاتی ایک موٹر ڈرائیو پر آ کر رکی اور اس کی تیز روشنی میں برف پر ایک پیلا راستہ سا بن گیا۔

کمال اور ہری شنکر موٹر میں سے اترے۔

''زرینہ'' انہوں نے ڈرائیو پر سے آواز دی۔ ''گوتم تو یہاں نہیں آیا؟''

وہ دونوں برف پر بھاری بھاری قدم رکھتے سیڑھیوں پر آ گئے۔

''سوامی جی کے سنٹر میں ابھی ابھی معلوم ہوا کہ گوتم لندن لوٹ آیا ہے اور شاید اوسٹرلی کی طرف گیا ہے۔'' کمال کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گوتم نیلمبر کو موٹر میں ڈال کر اپنے گھر لے گئے۔

۹۳

''کوئی نہیں آیا۔'' شنیلا دیبی نے دروازہ میں آ کر کہا۔ ''تینوں کے تینوں

دہریے میں سوگ باشی نرملا کے گھر والے۔ سوامی جی نے سارا انتظام کیا تھا۔ پھول منگوائے تھے۔ مدارسیوں کی ایک کیرتن پارٹی بھی سوئس کاٹج سے آ گئی تھی، مگر یہ لوگ شانتی کا مارگ ڈھونڈنا نہیں چاہتے۔"

"اور جانتی ہو اب یہ لوگ کیا کر رہے ہیں وہاں اپنے گھر میں، یا اس انڈین ڈانسر کے فلیٹ میں جمع ہو کر صبح سے شام تک تاش کھیلتے ہیں..........حد ہے۔" ایک بے حد روحانی انگریز بڑھیا نے دریچے میں سے منڈیا نکال کر بات کی۔

چمپا سیڑھیوں پر سے واپس اتری۔

"تم کسی کی متلاشی معلوم ہوتی ہو۔" دوسری ویدانت پرست امریکن بڑھیا نے دریچے میں سے سر نکال کر کہا۔ "دیکھو..........وہ یہاں موجود ہے.......... تمہیں..........ہم سب کو بلا رہا ہے.........." انہوں نے انگلی اٹھا کر کرشن کی بڑی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو سنٹر کے ہال میں رکھی تھی۔ "اسے دیکھنے کے لیے وہ تیسری آنکھ چاہئے جسے افسوس کہ تم ہندوستانی کھو بیٹھے۔"

چمپا ہڑبڑا کر دوڑتی نیچے اتر گئی۔ سڑک پر آ کر اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سڑک پر چلنے والے سب انسانوں کے ماتھوں پر تیسری آنکھ موجود ہے جو اسے گھور رہی ہے۔

وہ دوڑ کر ایک ۷۳ نمبر کی بس میں سوار ہو گئی۔

سنٹر میں سوامی دیویکانند نے اپنا لیکچر پلانا شروع کر دیا تھا۔ یوگا پر ان کا لیکچر سننے کے بعد ان کی سامعین معرفت پسند بڑ ذیں اپنے گھروں کو لوٹ کر سنک میں پڑے ہوئے صبح کے برتن دھوئیں گی اور موزے رفو کریں گی اور گیس کے بل

کی فکر کریں گی ۔ اس وقت لارڈ کرشنا ان کے کتنے کام آئیں گے ۔

وہ بس سے اتر کر طالب علموں کے مرکز کی طرف روانہ ہوئی ۔

ہال میں طالب علموں کی ایک بالکل نئی ٹولی گپوں میں مصروف تھی ۔

''میں چمپا احمد ہوں ۔'' کس نے دروازے میں جا کر کہا ۔

''لیس؟''

ایک مدراسی طالب علم نے آگے آ کر پوچھا ۔

اس کا دل ڈوب گیا ۔ اس کا نام کتنا غیر اہم تھا ۔ اسے کوئی نہ جانتا تھا ۔ کسی کو اس کی ضرورت نہ تھی ۔

''کچھ نہیں .... کچھ نہیں ....''

''جی .... آپ کو کیا چاہیئے؟'' ایک بنگالی لڑکی نے پوچھا ۔

''کچھ بھی تو نہیں ....'' اس نے اور زیادہ ہڑبڑا کر جواب دیا ۔ ''ایسے ہی آپ لوگوں کا سنٹر دیکھنے چلی آئی تھی ۔''

چند لڑکوں نے اسے شک و شبے کی نظروں سے گھورا ۔

وہ الٹے پاؤں پھر سڑک پر آ گئی ۔

اسٹرینڈ پہنچ کر وہ انڈیا ہاؤس میں داخل ہوئی ۔ لفٹ میں اوپر کی منزل تک پہنچی جہاں کینٹین میں حسب معمول خوب شور مچ رہا تھا ۔

''میں چمپا احمد ہوں ۔''

اس نے کاؤنٹر پر جا کر کہا ۔ اسے اپنی اس احمقانہ حرکت پر مطلق تعجب نہ ہوا ۔

''لیس ڈیئر ۔'' ادھیڑ عمر کی ہندوستانی عورت نے ، جو ایڈنگ مشین پر بیٹھی تھی ،

انگریز عورتوں کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا، ''کھانا تو ختم ہو چکا ہے۔ اسنیکس ہیں۔''

نہیں.........ٹھیک ہے۔ وہ سٹ پٹا کر پھر باہر نکلی۔ میزوں پر بیٹھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں نے سر اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔ ایک کونے میں سریکھا کامیاں گلشن سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا، وہ پھر باہر آ گئی۔

اب وہ چوزے کی سرائے پہنچی، وہاں سامنے کمال ملا جو کاؤنٹر پر کھڑا کسی کو فون کر رہا تھا۔ اس سے چند باتیں کرنے کے بعد وہ جلدی سے باہر نکل گیا، وہ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی اسے بھیڑ میں شامل ہوتے دیکھتی رہی، پھر باہر آ کر اس نے بی بی سی کی کینٹین میں جھانکا۔ چچا صدیقی کوئی لطیفہ بیان کر رہے تھے۔ اعجاز بٹالوی نے ایک نئی بحث شروع کر دی۔ تقی سید منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ یاور عباس کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں چمپا احمد ہوں۔ اس نے ان سب کو بتانا چاہا مگر پھر واپس لوٹ گئی۔

سامنے ہی انڈر گراؤنڈ تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے بالکل غیر ارادی طور پر میڈا ویل کا ٹکٹ لے لیا۔ چند منٹ بعد میڈا ویل کی چوڑی سڑک پر برآمد ہو کر وہ ایک درخت سے ٹک گئی اور چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر سریکھا اور آشا کے مکان تھے۔ پارک کی دوسری طرف چند قدم پر طلعت اور کمال کا فلیٹ تھا۔ اسٹیشن کے مقابل کے جدید بلاک میں شانتا اور رولیم کریگ رہتے تھے۔

عین اسی وقت گروسر کی دکان سے سبزی کا تھیلا اٹھائے سریکھا باہر نکلی۔

''ارے چمپا۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''وہاں کیسی کھڑی ہو.........آؤ.........

آؤ۔"

وہ خاموشی سے سریکھا کے ساتھ ہولی۔

چند قدم چل کر وہ مکان میں داخل ہوئیں۔

"چانچہ یہی گوکل تھا...........شارمیلا......یہی گوکل تھا..........." اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا....." سریکھا نے پلٹ کر پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"بیٹو۔ گلشن ابھی انڈیا ہاؤس سے نہیں لوٹا۔ تمہیں معلوم ہے اس نے وہاں کام شروع کر دیا ہے۔"

"اچھا۔"

ڈرائنگ روم کے چوڑے دروازے کے باہر ابھی دن کا اجالا باقی تھا۔ بہت سی سرخ پتیاں آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی آ کر نیچے بکھر گئیں۔ پورچ کی سیڑھیوں پر، ڈرائیو پر۔ چار پانچ پتیاں دریچے کے باہر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں کے نیچے ہوا میں لرزتی رہیں۔ دھوپ کی سنہری لکیر نے گھاس پر حلقہ سا بنا لیا۔

کیا پتا انسان دراصل کیا چاہتا ہے؟

"ارے چمپا.......... یہاں اس صوف پر بیٹھ جاؤ آرام سے.........."
سریکھا نے ترکاریاں سینی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اس صوفے پر بیٹھنے سے کمرہ وہی تو نہیں بنے گا جو اس روز تھا۔" چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

''اس روز........... کس روز؟ کیسا تھا؟'' سریکھا نے باورچی خانے میں جاتے ہوئے پوچھا۔

''کیامعلوم...........؟''

خالص موسم اب باہر فضاؤں میں پھیل چکا تھا۔ شدھ سردی۔ شفاف، پاکیزہ برف۔ سارا وجود بے حد ہلکا پھلکا اور صاف محسوس ہو رہا تھا۔ سریکھا نے شال اوڑھی اور کمرے میں آ کر آتش دان جلایا۔

''کل...........'' اس نے بالٹی میں سے کوئلے الٹتے ہوئے بات کی۔ ''بہت سے لوگ گھر واپس جا رہے ہیں۔''

''ہاں۔ ہندوستان۔'' سریکھا نے راکھ کریدنا شروع کی۔

''کون...........کون...........'' چمپا نے بے تعلقی سے پوچھا۔ اب اسے کسی سے کیا مطلب، وہ اس خالص موسم کی طرح سارے میں پھیلی تھی۔ اسے مخصوص شخصیتوں سے کیا غرض۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔

سریکھا گھریلو انداز میں پلو کمر میں کھونسنے کے بعد پھر ترکاری کاٹنے بیٹھ گئی۔

''سبھی...........'' اس نے جواب دیا۔ کمال۔ ہری۔ کملا۔ ہری فلائی کر رہا ہے۔ کمال پرسوں کیلیے دو نیا سے جائے گا۔ گوتم آج صبح کرشنا مینن کے ساتھ پھر نیو یارک چل دیا۔

باہر چھتوں کے پرے ایک دم سورج ڈوب گیا۔ بگ بین نے ریڈیو میں اپنا بگل بجایا۔ باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ جاڑوں کی رات کی تاریکی جو دفعتاً دنیا کو آ دبوچتی ہے، وہ سریکھا کی مدد کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

ڈرائنگ روم میں گلشن کے اور اس کے دوست داخل ہو چکے تھے، وہ باورچی خانے کے دروازے سے نکل کر سرد باغ میں سے گزرتی آشا کے گھر چلی گئی۔

سریکھا کی آواز پر وہ واپس لوٹی۔ اس نے دریچے میں سے اندر جھانکا۔ شام کا اثر کمرے میں ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ رات نے لے لی تھی، وہ دوبارہ اس کمرے میں گئی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ سائے دوسرے تھے، رنگ، فضا کا سر۔ وقت بھی کھڑکی کے راستے باہر چلا گیا۔ اس کا ذرا سا ٹکڑا بھی پیچھے پڑا نہیں ملا۔

سریکھا کے گھر سے باہر نکل کر اسے کمال کے مکان کی روشنیاں نظر آئیں۔

مجھے چھوڑ کر مت جاؤ............ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ............ مجھے چھوڑ کر مت............اس نے چلا چلا کر کہنا چاہا مگر خاموشی سے تیز تیز قدم رکھتی اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی اور جون کارٹر کی گلی میں پہنچی اور اصطبل کے دروازے میں جا کر روشنی جلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

مگر دفعتاً تاریکی نے سامنے آ کر اسے خوش آمدید کہا، وہ دریچے میں رکھے ہوئے جریئنیم کے پودوں پر جھک گئی۔ اب تک رات میری خلاف تھی۔ اس نے سوچا۔ اب شاید میری ساتھی بن جائے۔ اونچے مکانوں پر سے گزر کر آتی ہوئی ہوا، گھاس کی سرسراہٹ، پتوں پر جمی ہوئی برف۔ زمین پر رات کی موجیں بہتی چلی جارہی ہیں اور اب دھارے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب میں واقعتاً مکمل طور پر آزاد ہوں، وہ ہنسی۔ نیچے بہت ٹھوس، حقیقی زمین ہے اور اس زمین پر مجھے موت تک چلتے جانا ہے۔ قدم مجھے کہاں کہاں لے جائیں گے۔ (اس نے پیروں کو اس طرح دیکھا گویا آج تک وہ اسے پہلے کبھی نظر نہ آئے تھے۔) رات میرے ہاتھ

میں موجود ہے اور اس کے ہاتھ میں بھی۔ رات کی رسی کو میں مضبوطی سے تھامے تھامے دن تک پہنچ جاؤں گی۔ رات تو آج سے میری سکھی ہے۔ کہو سکھی کیسی ہو۔ میں تو تم کو مدتوں سے جانتی ہوں۔ برساتوں میں، پھاگن کی رت میں پورنماشی میں، امتحانوں کی پڑھائی کے زمانے میں، اجنبی دیسوں میں، ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے تمہاری ہر کیفیت کو دیکھا ہے۔ میں نے اور تم نے اکٹھے سے بتایا ہے۔ ایک روز تم ہی جیتو گی۔

اور تم، اس نے دوسری بات شروع کی، میں تم کو تمہارے خوابوں کی دوسراتھ میں چھوڑتی ہوں۔ میں شاید ایک واقعیت تھی اور تم خواب دیکھنے سے کبھی باز نہ آؤ گے۔

رات تاریک تر ہوتی گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ جون کارٹر کے فلیٹ میں مکمل سناٹا تھا۔ نیل اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ جون بھی سو چکی تھی۔ اوجیت اپنی میٹنگ سے نہیں لوٹا تھا۔ خاموشی کی لہریں بوسیدہ دیواروں سے ٹکرایا کیں۔ وقت نے کہا: مجھے پہچانو۔ میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا خیال تھا لمحے اپنی جگہ قائم رہیں گے، لیکن تمہارا یہ خیال بھی غلط تھا۔ مجھے دیکھو اور جانو۔ میں جا رہا ہوں پل پل، چھن چھن۔ پردوں کے پیچھے تہ در تہ اندھیروں میں غائب ہوتا جا رہا ہوں۔ میں حد فاصل ہوں۔ اس کے آگے تم نہیں جا سکتیں۔ اب واپس لوٹ چلو۔ سرحد پر تم پہنچ چکی ہو۔ سامنے پھاٹک ہے۔ اب دوسرا دیس شروع ہوتا ہے۔ اب تم کو دوسرے پروانہ راہداری، نئے کاغذات کا انتظام کرنا ہو گا۔ نئے سرے سے خانہ پری اور دستخط کرنے ہوں گے کیونکہ اب نئی سرحد شروع ہوتی ہے۔ میں نے اب

تک بہت سے سحر توڑے ہیں ۔تمہاراوالا سحر تو بہت ہی غیر اہم تھا۔

مجھے پہچانو۔ میں برابر تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا۔تم کم از کم مجھ سے نہیں بھاگ سکتیں ۔لوگ تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے ۔میں تم کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ دیکھا تم سرحد پر کتنی جلدی پہنچ گئیں ۔تم کو فیصلہ کرنے میں کتنی دقت پیش آ رہی تھی۔ میں سارے معاملے طے کر دیتا ہوں۔ سارے فیصلے، سارے ارادے میری وجہ سے خود بخود پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی لیکن میں تم کو ان کا مقابلہ کرنا بھی سکھا دوں گا۔ اب مجھ سے صلح کرلو۔ میں اب بھی موجود ہوں۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کا پردہ پھڑپھڑانے لگا۔ کمرہ کہرے سے بھر گیا۔تب اسے معاً محسوس ہوا کہ وہ سردی سے کپکپا رہی ہے۔اس نے جلدی سے دریچہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

۹۴

''اپی کے بیاہ میں پہننے کے لیے میں تو بڑی بڑھیا بڑھیا ساریاں بنواؤں گی، کارچوبی۔'' نرملا کہہ رہی تھی۔

میں خاموش رہی۔

''مجھے تو یہ نئے قسم کی بارڈر والی ساریاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔'' مالتی نے

ہونٹ لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔ مالتی رائے زادہ سولہ برس کی تھی۔ نرملا اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ میں نرملا سے ایک سال چھوٹی۔ ان دونوں نے سخت بزرگی کے عالم میں ملبوسات کے متعلق اپنی وسیع معلومات کا مجھ پر رعب ڈالنا شروع کیا۔ میں بڑی عقیدت سے ان کی باتیں سنتی رہی۔

پھر طلعت دفعتاً خاموش ہوگئی۔ ''دیکھو'' اس نے کمال سے کہا، ''میں نے آج یہ محسوس کیا ہے میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے، دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ دنیا کو اس سے کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے۔''

''میرا ماضی محض میرا ماضی ہے۔'' کمال نے طلعت کی بات دہرائی۔

''اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔'' ہری شنکر کی آواز گونجی۔

''لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبدے بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔'' طلعت نے کہا۔ ''میں وقت کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا۔''

''تمہاری مدد طلعت بیگم شاید آئن اسٹائن بھی نہیں کرسکتا۔''

''میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔'' کمال نے پھر ضد سے دہرایا۔

''وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔'' طلعت نے کہا۔

یہ لوگ جولندن کے سینٹ جانز ووڈ میں بیٹھے ۱۵ دسمبر ۵۴ء کی سہ پہر کو یہ باتیں کر رہے تھے ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر عجیب عجیب شکلیں بناتے

رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ موٹریں آ جا رہی تھیں۔ وائرلیس میں سے وی آنا کے کسی کونسرٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وقت کے وسیع اندھیرے اور اونچی دیواروں اور سڑکوں اور گلیوں اور آوازوں کی بھول بھلیاں میں گھرے تینوں موجود رہے۔

وقت کے اسی اندھیرے میں طاعت ۱۹۴۱ء کی جولائی میں سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور مالتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس طاعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ شاکیہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے جوانی میں کچھ اور۔ تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ دور پہاڑوں میں گلیشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوائیں۔ وقت جو سیال تھا، وقت جو منجمد تھا۔

''ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔'' ہری شنکر نے کہا۔ ''کیونکہ ہم خوفزدہ ہیں۔''

''اور گوتم نیلمبر تک کس قدر خوفزدہ نکلا۔'' کمال نے کہا۔

''گوتم نیلمبر کا اس وقت ذکر نہ کرو۔ تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ جاؤ گے۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔'' ہری شنکر نے کہا۔ ''میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد بھی ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا اور جب وقت کے سارے تجربے ہم اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنی پگ ہم لوگ ہیں ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔''

وقت کے پیٹرن میں طاعت جہاں بیٹھی تھی وہی طاعت اسی پیٹرن میں ایک

جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے............ اور آگے...... پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کی مختلف عکس نظر آتے ہیں۔

کمال گویا اسٹیج پر چلتا ہوا وسط کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ مکھی کی آنکھوں سے اس نے سب کو دیکھا۔ مائیکل۔ بل کریگ۔ زرینہ، وہ سب صبح صبح گوتم نیلمبر کو ایئر پورٹ پہنچا کر واپس لوٹے تھے اور کمال کے کمرے میں ہرشنکر اور کمال کے بندھے ہوئے اسباب پر چڑھے بیٹھے تھے۔

گوتم زرینہ کے یہاں سے آ کر پندرہ دن تک کمال کے گھر پر بیمار پڑا رہا تھا۔ تب وہ دن بھر تاش کھیلتے یا بیت بازی کرتے۔ مکی ماؤس کے کومک اور فلمی رسالے تک پڑھے گئے۔ گوتم ابھی پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا کہ کشمیر کے کیس کے لیے اسے پھر نیویارک جانے کا حکم آ گیا۔ لندن میں یہ کمال اور ہری شنکر کا آخری دن تھا۔ ہری رات کو ایئر انڈیا سے پرواز کرنے والا تھا۔ کمال کو کل صبح بوٹ ٹرین پر سوار ہونا تھا۔ کملا بھی جا رہی تھی۔ مائیکل بھی جا رہا تھا۔

طلعت نے دوبارہ کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ ۱۵ دسمبر ۵۴ء۔ اسے پھریری سی آئی۔ ''مائیکل دروازہ بند کر دو۔'' مائیکل نے اٹھ کر ایسا ہی کیا۔ لوگ طلعت کو کلدار کھلونوں کی طرح نظر آئے۔ سپاہی جن کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں (مائیکل) سر ہلاتے ہوئے سفید چگی داڑھی والے چینی فلسفی (ہری شنکر)۔ مہاراجہ چندر گپت

کے دربار کی نرتکی (سریکھا)۔ دھاڑیں مار مار کر روتے، ماتم کرتے اپنی زندگی کے تعزیے کے ساتھ ساتھ ننگے پاؤں چلتے گولہ گنج والے کمرخمیدہ نواب کمن صاحب (کمال)۔ دیوالی کے گڑیوں گڈوں کی طرح وہ سب سامنے سجے تھے۔ مورتیاں جن کو لکھنؤ کے کمہاروں نے بنایا تھا۔ (ان میں سے ایک مورتی گر کر ٹوٹ چکی تھی۔) ابھی بہشتی آئے گا، چھڑکاؤ ہوگا، تخت بچھے گا۔ تخت پر راجہ بیٹھے گا۔ لونا چماری کا جادو چلے گا، پھر یہ سب جا کر اپنے طاقوں میں بیٹھ جائیں گے۔

''میں بالکل ٹھیک تھی۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مگر پھر ایک دم چیزوں نے مجھے ڈرانا شروع کر دیا۔''

کمال نے گویا اس سے کیو لے کر کہا: ''یہ انکشاف ہوا کہ کائنات میں بڑی گڑبڑ ہے۔''

''اور اس سے پہلے کہ مجھے معلوم ہو میں الفاظ کے سمندر میں سے گزرتی خیالات کے پرخطر راستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔''

''الفاظ کیا تھے؟ حقیقت کیا تھی؟ کتابوں نے کہا الفاظ غلط ہیں۔ حقیقت کوئی شے نہیں سمبندھ لایعنی ہیں۔ پتارم، ماترم، پترم، پوترم...........سب..........''

ہر شے فالتو ہے۔ کبھی میں نے دیکھا برہسپتی راکھشوں کو اپنا علم بڑھا رہا ہے۔ کبھی میں خود اپنے آپ کو ایک عظیم راکھشنی نظر آئی یا پریوں کی کہانیوں کی کوئی چڑیل جو اپنے علم کی جھاڑو پر سوار تاریک خلاؤں میں ناچتی پھر رہی تھی۔

ان تاریک خلاؤں میں اور بہت سی جھاڑوئیں سن سے پاس گزر جاتیں جن پر ہزاروں لڑکیاں سوار تھیں: تہمینہ، نرملا، روشن، جون کارٹر، فیروز، چمپا، زرینہ اور

جانے کون کون۔ یہ جھاڑوئیں اب اتنی اوپر اڑ گئی تھیں کہ اب ان کا نیچے اترنا محال تھا۔ دراصل ساری دنیا کے آسمان ان جھاڑوؤں سے پر تھے۔

ان سب میں چمپا ایک بڑی قابل ذکر ہستی تھی۔ اس سے غلطی یہ ہوئی خواب دیکھنے شروع کر دیے۔

اب اگر آپ ایک جھاڑو پر سوار ہوں اور سو جائیں تو لامحالہ آپ راستہ بھول جائیں گی اور آپ کی جھاڑو ٹکرا کر نیچے آ رہے گی۔

اپنی خواب کی حالت میں وہ عہد عتیق کے بھگتوں کی مانند گاتی پھری۔ گرجاؤں میں گئی۔ راہبات کو رشک سے دیکھا۔ ذاتی زندہ خدا اور اپنی زندگی کے مجازی خدا کے تصور کو یکجا کرنے سے اسے غالباً بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ اس مسرت کا تم تجزیہ نہیں کر سکتے۔ یہاں عقیدے اور اللہ کی ذات میں یقین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ محض تھوڑی سی معرفت کی ضرورت تھی جو صبح منہ اندھیرے بھیرو گاؤ تو آپ سے آپ حاصل ہو جاتی ہے۔ میں رادھا ہوں۔ میں سیتا ہوں۔ میں مریم مگدلین ہوں۔ میں زریں تاج طاہرہ ہوں۔ مدتیں گزریں اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ جب میں چیپل میں جاتی ہوں اور بشپ گھنٹی بجاتا ہے اور یوکراسٹ کے گلاس اٹھائے جاتے ہیں تو میں اس ساری اشاریت کے جال میں خود کو موجود پاتی ہوں۔ گوتم نیلمبر کی طرح اس ہر واقعے میں رمزیت نظر آ جاتی تھی۔

وہ سب کمرے سے نکل کر نیچے سڑک پر آ گئے۔ کمال نے ناک اٹھا کر کہرے کو سونگھا۔

''چیزوں کی رمزیت کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ میں نے اس کی وجہ سے بہت

دکھ اٹھائے ہیں۔" مائیکل نے ہوا میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" طلعت نے جواب دیا، وہ سب سر جھکائے زمین کو تکتے چلا کیے۔ شام کی کلرنگ روشنی میں وہ ہمپسٹیڈ ہیلتھ کی طرف بڑھتے رہے۔ مکانوں کے چھوٹے چھوٹے بیک گارڈن، کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگ، تنگ گلیارے جن کے سرے پر نیم تاریک قہوہ خانے تھے۔ لڑکیاں دفتروں سے لوٹ رہی تھیں۔

"یہ منظر میرے لیے لرزہ خیز ہے۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ہاں۔" طلعت نے اسی طرح جواب دیا۔

پہاڑی پر پہنچ کر وہ مصوروں کی تصویریں دیکھتے پھرے اور مزید بور ہوئے۔

"وہ دیکھو تر و تا وغیرہ آ رہے ہیں۔"

"آہا۔"

نیچے میلہ لگا تھا۔ جپسی عورتیں ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتلا رہی تھیں۔ بچے مونگ پھلی اور آئس کریم کھا رہے تھے۔

"سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے خوابوں میں گھسیٹنے کی کوشش کریں۔" مائیکل نے کہا۔

"ہاں۔" طلعت نے دہرایا۔ "میرا ماضی، میرا وقت، میرے خواب صرف میرے ہیں، وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے، گو خیال رکھو....." اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ "میں شخصی سطح پر یہ بات کر رہی ہوں۔ مستقبل ہم سب کا مشترک ہے۔"

مائیکل نے ایک کنکرا اٹھا کر غصے سے اسے مارا۔ ''خدا کے لیے اس نقطے پر پہنچ کر بھی پارٹی لائن مت چلاؤ۔ مستقبل مشترک نہیں ہے۔ مستقبل اس پہاڑی کے ادھر ہم سب کے لیے الگ الگ منہ پھاڑے کھڑا ہے، ہری کے دس سر والے خدا کی طرح۔''

''او مائیکل۔'' طلعت نے بچوں کی طرح کہا، ''یہ واقعہ ہے کہ میں بہت ڈرتی رہی ہوں۔''

''ہاں۔''

میرے ڈرانے کو کیا کم چیزیں تھیں۔ خوبصورت مناظر۔ آرام دہ گھر۔ بیگ کھولتی تو اس میں سے طرح طرح کے کاغذات نکلتے۔ بنکوں کے مراسلے۔ شیرز کے کاغذات۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی رپورٹیں جن پر نام ہوتے: سہنا، سربیرین مکرجی۔ شری تھاپڑ۔ ان سب ناموں کے پیچھے ایک اور دنیا تھی۔ اونچی مضبوط عمارتیں۔ شفاف غیر شخصی دفاتر۔ روپیہ۔ روپیہ۔ روپیہ۔ معاشیات کے مسائل۔ اسٹرائیک۔ بھوک۔ بے روزگاری۔ ڈائریکٹروں کے اجلاس۔ ٹریڈ یونین۔ مزدور بستیاں۔ سٹی آف لندن۔ کلائیو روکلکتہ۔ بشپ گیٹ۔ چورنگی۔ ٹاٹا نگر۔ اینڈریو یول کلکتہ۔

''میں ڈرتے ڈرتے ان کاغذات پر دستخط کرتی، جو گویا میرے تحفظ کے ضامن سماج میں میرے اونچے دولت مند درجے کے گواہ تھے۔ یہ سب کیوں ہے؟ مجھے اس کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ میں رضا خاندان میں پیدا ہو کر اس کھڑاگ کی وارث قرار دی جاؤں۔ کاغذ کے ٹکڑے۔ روپیہ۔ روپیہ۔

روپیہ۔ دفعتاً روپے کی اہمیت کا سارا احساس میرے دل سے مکمل طور پر زائل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا: پوٹڑوں کے رئیس ایسے ہی غنی ہوتے ہیں، وغیرہ مجھے یہ سن کر بڑی ہنسی آتی۔''

وہ سب پتھروں پر بیٹھ گئے۔ نیچے وادی میں جھیل کے پانی پر ڈوبتے سورج کی کرنیں رقصاں رہیں۔ سالویشن آرمی والوں کا ایک دستہ بینڈ بجاتا سامنے سے گزرا۔

کمال جھیل کے کنارے تنہا کھڑا تھا اور اس بلندی پر سے بہت چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔

معاً طلعت زور سے قہقہہ مار کر ہنسی۔

سب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں نے ایک مرتبہ نرملا سے پوچھا تھا: رانی بی بی! تمہیں ڈر کاہے کا ہے۔ نرملا نے جواب دیا تھا کہ میں اپنے خوابوں کو اس سے بچانا چاہتی ہوں، وہ میرے خواب جانتا ہے۔ کتنی ہنسی کی بات ہے کہ نرملا کے خواب اب اس کے پاس ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔ گوتم بالآخر لاعلم رہا۔ ہم لاعلمی میں پیدا ہو کر لاعلمی میں زندہ رہتے ہیں اور اسی میں مر جاتے ہیں۔ یہی اصل سدھانت ہے۔''

کمال ان کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ مائیکل نے جھک کر گھاس کا پتا توڑا۔ میلے میں بجتی ہوئی موسیقی ختم ہو چکی تھی۔ سردی زیادہ ہو گئی۔

ایک جیٹ طیارہ ان کے سروں پر سے گرجتا ہوا گزر کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھا کیے۔

''لاعلمی کا جوشہر ہم نے بسا رکھا تھا اس کی دیواریں ہم نے فلسفے کی اینٹوں سے چنی تھیں☆''طاعت نے بات جاری رکھی۔''ایک روز سیندھ لگا کر موت ہمارے شہر میں داخل ہوئی۔''

''ایک مرتبہ جب فارن برا کے ائیر فیسٹول کے موقعے پر بے چارہ جان ڈیری آواز کی سرحد توڑتے خود ہلاک ہو گیا تھا اس کا طیارہ فضا میں پاش پاش ہو کر تماشائیوں کے اوپر آن گرا تھا.............بیسیوں لوگ مرے تھے۔اس سے، جب طیارہ دہکتے ہوئے آتشیں گولے کی صورت میں آواز سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا، اس لمحے مجھے پتا تھا کہ یہ موت ہے۔آن کی آن میں میں بھی جل کر بھسم ہو جاؤں گی، مگر جانتے ہو۔زمین پر اوندھے لیٹنے کے بجائے میں طیارے کے ٹکڑوں کی بوچھاڑ میں چندرا اور زرینہ کو پکارتی پھری کہیں وہ نہ مر گئی ہوں۔مجھے اس وقت اپنے بجائے ان دونوں کی زندگیوں کی فکر تھی۔ اپنے متعلق تو احساس بھی نہیں تھا۔''

''لہذا ازملا نے موت کا سامنا کیا تو مجھے لگا کہ اسے بھی خوف محسوس نہ ہوا ہو گا گویہی ایک واحد تجربہ ایسا ہے جس میں انسان کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتا لہذا ہم نے اسے یہ تجربہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔بے چاری ہاتھ پاؤں مارتی دریا کے تاریک کنارے میں بہہ گئی۔''

''ویدانت میں کہیں پر وجود کی چار کیفیتوں کا ذکر ہے۔: جاگتا ہوا انسان، خواب، بغیر خواب کی نیند اور موت۔''

''جس روز میں بے ہوش ہوئی تھی۔مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں بہت

گہری نیند سو رہی ہوں۔ خالی اس گہری نیند میں مجھے خواب نہیں دکھائی دیے۔ میری آتما جا کر اندھیرے سے مل گئی اور جب واپس آئی تو مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ میں کہاں گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی موت ہے اور جب یہ آئی تو آتما دوسرے غیر مرئی لیکن مادی جسم کو ساتھ لے کر اپنی راہ نکل کھڑی ہوئی۔ اب بہت سے راستے سامنے تھے۔ ان پر مارا مارا پھرنا تھا مگر واپس نہیں آنا تھا۔ یا نہ جانے کیا ہونا تھا۔ مہاراجہ جنک نے کہا تھا: متھا! جل رہا ہے مگر میں باقی ہوں۔ غالباً یہ صحیح ہے۔" طلعت نے کہا۔

"ہم سب چلے جا رہے ہیں۔" ہری شنکر نے مائیکل سے کہا۔ "کیا آگ کی لپٹیں تم تک نہیں پہنچیں۔"

مائیکل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

نیچے نیم تاریک گھاٹی میں کمال گاتا پھر رہا تھا۔ اس کی آواز ہوا پر تیرتی ان لوگوں کے کانوں تک پہنچی۔ چاند درختوں پر طلوع ہو رہا تھا۔

طلعت پھر اپنے سفر پر چل کھڑی ہوئی: "اس سے چاند سنگھاڑے والی کوٹھی کے باغ میں کنوئیں پر جھکا آنگن کے اندر کھڑا ہے۔" اس نے کہا۔ "مرنے کے بعد روح شعلے سے رات میں، رات سے بڑھتے چاند میں، بڑھتے چاند سے بڑھتے سال میں، دیولوک میں، وایو کی دنیا میں ہوا، سورج اور بجلی سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ واپسی میں وہ فضا، دھوئیں، بادل اور بارش اور پودوں میں پہنچی۔ قربانی کا شعلہ ہوا سے دھوئیں میں دھوئیں سے کہر میں، کہر سے بادل میں، بادل سے بارش میں تبدیل ہو کر برس جاتا ہے۔ ساری روحیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔"

''خیالات کا اور روح کا سفر ایک ہے۔'' شنکر نے کہا۔

''موت مجھے ختم کردے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا؟ ہوائیں میرے سانس کو اڑا لے جائیں گی۔ سورج میری آنکھوں کی روشنی پر پردہ ڈال دے گا۔ چاند میرے دماغ کو سلا دے گا۔ آتما فضا میں گھل جائے گی۔ خون پانی میں گھل کر پانی بن گیا۔ طلعت نے چٹان پر کھڑے ہو کر دہرایا۔''

''گہری نیند۔ گہرا خواب۔'' شنکر نے کہا۔ ''عناصر سوچ رہے ہیں۔ حواس سو چکے ہیں۔ صرف موت باقی ہے۔''

''جسم سوچتا اور محسوس کرتا ہے، وہ ختم ہوا تو سمجھو سب کچھ ختم ہوا۔ جلتی اگنی، سرد پانی، خنک ہوائیں۔ سب اپنے سبھاؤ سے آپ پیدا ہوئی ہیں۔ گوتم نے چمپا سے کہا تھا: اگر تمہارا جسم تمہارے ذہن سے کوئی علیحدہ چیز ہے تو اسے علیحدہ کردو اور صرف تم میرے پاس آجاؤ، مگر تم ایسا نہیں کرسکتیں۔'' مادہ پرست گلشن نے کہا۔

''آئے پریم پگے پروانے جوال مئی چھوی کے دیوانے
جڑ چلمن کے پیچھے رے بیٹھی دیپ شنکھا لہرائے رے......
دیپ شنکھا لہرائے رے..........''

چندرا نے گایا۔

''ابھی بہت سوں کو مرنا ہے، میں ان کے پہلے جارہا ہوں۔ بہت سے مر رہے ہیں، میں ان کے ساتھ جارہا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں جو مر گئے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ آگے دیکھتا ہوں، جو میرے بعد مریں گے ان کے ساتھ کیا ہوگا؟'' ہری شنکر نے کہا۔

''چیونٹی چڑھی پہاڑ پر کانوں میں ہاتھوں لٹکائے
ایک اچنبھا ہم نے دیکھا، نیا بیچ ندیا ڈوبی جائے''
گھاٹی میں سے کمال کے گانے کی آواز آئی۔

''میری قیمت کیا ہے۔ میں نے اب تک کیا کیا ہے۔''سریکھا نے کہا۔

''میں جو کچھ کرتا ہوں میرا ہر فعل لگتا ہے ساری کائنات کے چکر سے اس کا براہ راست تعلق ہے۔ اس اہمیت کو چھپانے کی غرض سے میں ہنستا ہوں۔ ویسے میں تم کو یہ بتلا دوں۔''مائیکل نے انگلی اٹھا کر کہا''ہمارا حشر بہت برا ہوگا۔''

''کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔''ڈراؤنے کورس کی مانند ان کی آواز پہاڑی پر گونجی

''سامنے مستقبل کی دیوار ہے اور میں مائیکل کی مانند اس کے سامنے کھڑی کھڑی چلا چلا کر رو رہی ہوں۔ کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟''طلعت نے کہا۔

''کسی امریکن نیگرو کو بلاؤ، کسی جرمن یہودی کو پیش کرو، کسی عرب پناہ گزین کو ہمارے سامنے حاضر کیا جائے، کسی پاکستانی مہاجر اور ہندو شرنارتھی کو آواز دو.......... اور ان سب سے پوچھو کہ تمہارا جرم کیا ہے جس کی یہ سزا تم کو ملی؟'' گلشن نے کہا۔

''میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ میری سزا تجویز کرو۔''مائیکل نے کہا۔

''اسرائیل کے نئے نغمہ نواز! ہم تو محض ڈیبورا کا گیت تم سے سننا چاہتے تھے۔''طلعت نے کہا۔''مگر تم نے ہاتھ میں بندوق اٹھالی۔''

''ہم ہزاروں برس تک روتے رہے۔صحراؤں کی بھوک۔غصہ۔ بے کسی۔ چیخ چیخ کر ہم نے یہوواہ سے فریادیں کیں۔داؤد کے گیت کاروں کا کرب۔ بے چارگی۔خواب۔ میں طلعت کا سوال دہراتا ہوں..........کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟ روح کی تنہائی انہوں نے اپنے لحن میں انڈیل دی۔گہرائی کی تنہائی۔ اونچائی کی تنہائی۔دکھ، شک، ترغیبات اور گناہ کی تنہائی۔کسی کشش میں گرفتار ہوکر انسان خودکو کس قدر اکیلا محسوس کرتا ہے۔'' مائیکل نے کہا۔

''جنگلوں میں ایک ہزار جوگی بیٹھے بھجن کرتے تھے۔میں نے ان کی آوازیں سنیں۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''بابل اور فلسطین کے سبزہ زاروں پر میں گاتا پھر رہا تھا۔'' مائیکل نے کہا۔

''میں نے تمہاری آواز بھی سنی تھی۔'' طلعت نے کہا۔

''یہ سارے تصورات جمع کر کے ایک قربان گاہ کا پردہ کاڑھ دو یا کھڑکیوں کے شیشے رنگ دو۔تمہارا تخیل بازنطینی مصوروں کی طرح حد سے زیادہ بھرپور ہے۔'' مادہ پرست گلشن نے کہا۔

''تاریخ کا احساس میرے سر پر تلوار کی طرح معلق ہے۔میں اپنے آپ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔'' مائیکل نے کہا۔

''کیا کریں۔کیا کریں۔کیا کریں۔'' کورس نے کہا۔

''کتابیں وہی تھیں جواب تک ہزاروں لوگ پڑھ چکے تھے۔نئی کتابیں چھپتی تھیں۔مضمون لکھے جاتے تھے۔نئی کہانیاں بنتی تھیں۔روز صبح کو پہاڑوں پر روشنی پھیلتی تھی۔کلیساؤں میں داؤد کے نغمے دہرائے جاتے تھے۔میرے ربائی نے کہا:

انسان کو سبت کی رات پانی نہیں پینا چاہیے اگر پیئے گا تو اس کا اپنا خون اس کے سر پر ہے، لیکن انسان پیاسا ہے تو اس کا کیا علاج ہو؟ اس سے کہو، انسان سے کہو داؤد کے ساتھ سات آوازوں کو دہرائے۔ خداوند خدا کی آواز پانیوں کے اوپر ہے۔ خداوند خدا کی لرزہ خیز قہرناک آواز۔ اس آواز سے لبنان کے دیودار ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آواز سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ اس آواز سے ویرانے لرز اٹھتے ہیں۔ جنگل سونے ہو جاتے ہیں اور اس کے ہیکل کے پجاری کہہ اٹھتے ہیں۔ تقدیس ہو............ تقدیس ہو...... تقدیس ہو...... مگر تم پھر بھی کہتے ہو: میں پیاسا ہوں..... میں پیاسا ہوں.....'' مائیکل نے کہا۔

''بھوک سے زیادہ انسان پیدا ہوتا ہے۔ عمر بھر اسے بھوک ستاتی ہے۔ محبت کی۔ روٹی کی۔ سکون کی۔'' مادہ پرست گلشن نے کہا۔ ''بھوک اور پیاس ہمارے سب سے بڑے بھوت ہیں ☆ میں سب سے پہلے ان بھوتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ دوسری نجات مجھے آپ سے آپ مل جائے گی۔''

کمال گاتا ہوا چڑھائی پر آ گیا۔

''لوگوں کو احساس جرم اکٹھا کرتا ہے۔ یہاں احساس معصومیت نے کہیں کا نہ رکھا۔ کاش ہم نے ایک آدھ چھوٹا موٹا گناہ کر لیا ہوتا۔ اس احساس معصومیت کی رسیوں سے ہم سب ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جس دن ہم میں سے ایک نے اس رسی کو توڑا ہم سب، ہمیشہ کے لیے تتر بتر ہو جائیں گے۔'' ہری شنکر نے کہا۔

طلعت اب ایک دوسری چٹان پر جا بیٹھی تھی اور سب کی طرف سے پشت کیے

وادی کو دیکھ رہی تھی۔ ''ایسا کبھی نہ ہوگا۔'' اس نے مڑ کر جواب دیا۔ ''ہمیشہ ہماری کلچر، ہماری بیک گراؤنڈ، ہمارا بے حد اونچا مورل کوڈ آڑے آجائے گا۔''

''نہیں طاعت بیگم۔'' ہری شنکر نے کہا۔ ''ہماری کلچر کی رسی تو پہلے ہی ٹوٹ چکی ہے۔ جس کے ایک سرے پر تم اور دوسرے پر میں ہوا میں معلق لٹک رہے ہیں۔''

''اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ، اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ۔'' گلشن نے کہا۔

پھر شیشے کا بڑا دروازہ کھلا۔ اس میں سے جو لوگ اندر آ رہے تھے۔ ان میں چمپا بھی تھی۔ ہلو......

اس نے کہا اور میری طرف آئی۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ کون جگہ ہے؟ یہ چوزے کی سرائے ہے اور میں جہاز کے دفتر فون کر رہا ہوں۔ میں فی الحال بہت محفوظ ہوں۔ میرے چاروں اور شہر کی سنگی عمارتیں کھڑی ہیں۔ میرے پیروں کے نیچے ٹھوس زمین ہے مگر مجھے بے حد ڈر لگا۔ چمپا باجی میرے سامنے موجود ہیں۔ ان کے بال بھی وہی ہیں۔ ساری بھی اسی انداز سے پہنی ہے۔ وقت کا الاؤ جو جل رہا ہے اس میں وہ بڑی نکھری ہوئی نظر آ رہی ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مجھے اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی کوئی رنج کوئی جھنجھلاہٹ بلکہ یہ کہ میں جلد از جلد یہاں سے چیختا ہوا بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں کہ تم چمپا ہو۔ اگر تم دوبارہ دس پندرہ سال تک بھی مجھے نظر نہ آؤ تو مجھے ہرگز فکر نہ ہوگی۔ پندرہ سال قبل میں تم کو دیبی کہا کرتا تھا۔ اب تم تب سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ زیادہ سمجھ دار، سنجیدہ، بردبار۔ اللہ جانے تم کیا کیا بن چکی ہو۔ ''میں نے سنا تھا کہ آپ آج کل اپنی آواز اردو میں ڈب کر رہی ہیں کسی فلم کے لیے۔ شاید آل کہہ رہا تھا۔

''میں نے اخلاقاً گفتگو شروع کی۔

مجھے لگا جیسے وہ کوئی بڑا اہم بات بتانا چاہتی تھی مگر خاموش ہوگئی۔

آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور ہلکی پھلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ''چمپا باجی سامنے کون فلم ہو رہا ہے۔'' میں نے پھر اخلاقاً گفتگو کی سعی کی۔ لوگ جو سینماؤں میں سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے چہرے اداس تھے۔ بیزاری سارے ماحول پر چھائی تھی۔ روشنیاں غمگین تھیں۔ موسیقی رو رہی تھی۔ سڑک پر موٹروں اور بسوں کے چلنے کی آواز میں پژمردگی تھی۔ وقت گھٹتا جا رہا تھا، وہ شیشے کی بڑی دیوار سے ناک چپکا کر کھڑی ہوگئی اور باہر ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ میں جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔

''اب میں نے اس کو بہت پیچھے کھڑا چھوڑ دیا ہے۔ میں گھر کی طرف جا رہا ہوں وہ اس بیکراں اداسی، سناٹے کے اس پرشور بھنور میں اکیلی چپ چاپ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی رہ گئی ہے۔ میں کیوں اس قدر تھک گیا ہوں۔ مجھے چپکا بیٹھ جانے دو۔'' کمال نے قریب ایک پتھر پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

''لکڑی جل کوئلہ بھی، کوئلہ جل بھئی راکھ
میں برہن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ''

چندرا نے گایا۔

''چوروں کی طرح ہم نے بھی اپنے اپنے دیوتا جگائے۔ مگر دیکھو کیا ہوا۔ دیوتا صاف چوٹ دے گئے۔'' طلعت نے کہا۔

''کاکا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس

دوئی نینا جن کھائیو، پیا ملن کی آس''

''سبز رنگ کا کہرہ اب سارے میں پھیل گیا ہے۔ سب اس کہرے میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں تاریکی کے کنارے، اجالے اور خوف کے سنگم پر پاؤں ٹکائے، سونے کے رنگ والے خدا پر جاپتی کی مانند از سرِ نو چیزوں کے نام تجویز کر رہی ہوں۔'' طلعت نے کہا۔

''دیکھو۔'' اس نے چٹان پر کھڑے ہو کر افق کی طرف اشارہ کیا۔

''مائیکل.......... ادھر تمہارا یروشلم ہے۔ ہم سب کا یروشلم ہے۔''

''اور یروشلم بھی تقسیم شدہ ہے۔'' ہری شنکر نے یاد دلایا۔

''اور پہاڑیوں پر داؤد کے نغمہ نواز کراہتے پھر رہے ہیں۔ لحن ختم ہو چکے۔ صلیبوں پر یسوع کے ساتھ ہمیں لٹکایا گیا ہے۔ یسوع کے بجائے ہم سولی پر چڑھتے ہیں کیونکہ ہم سب سے بڑے چور تھے۔ ہم نے خدا کے خزانوں میں سے مسرت کی چوری کرنا چاہتی تھی۔'' طلعت نے کہا۔

''وہی شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑی رہ گئی ہے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ گزرتے ہوئے برس بگولوں کی طرح میرے چاروں اور منڈلا رہے ہیں۔ سڑکوں پر بارش میں رات کی روشنیاں جھلملاتی ہیں۔ سوتے ہوئے مکانوں کی چمنیوں پر سے چاند لڑھکتا ہوا سمندر کی اور جا رہا ہے ندی کے کنارے، گل پوش سنہرے باغوں میں۔ ایسٹ اینگلیا کے جنگلوں میں تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ سنسان بندرگاہوں میں سیاہ پانیوں پر رات کے پرند چکر کاٹ رہے ہیں۔ میرے سامنے سے لوگ کے ہجوم گزرتے ہیں۔ جھیل میں ڈونگیاں تیرتی

ہیں۔ میں کنارے پر ہوں۔ مجھے اب اپنے جہاز کو تلاش کرنا ہے۔ ایسا جہاز جس کی روشنیاں بجھ گئی ہوں، جو چپکے سے سمندر کی عمیق تاریکی میں داخل ہو جائے۔ ایسا جہاز جو صرف اس سمت جاتا ہو جہاں کوئی خوش آمدید کہنے والا نہ ہوگا۔" کمال نے کہا۔

کہرہ اب بہت گہرا ہو چکا تھا۔

"سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کرو کہ بھور کبھی نہ ہوئے۔"

چندرا گاتی ہوئی پہاڑی کے نیچے اتر گئی۔

"روپ اور نام روپ۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ودیا اور اودیا۔" طلعت نے کہا۔

"کانٹ اور ویدانت۔" مائیکل نے کہا۔

"اب ہماری سمجھ میں آ گیا ہے۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیونکہ جذبات اور خیالات کی سب سے اونچی چوٹی پر ہمیشہ وہی اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے۔ تنہا، ازلی اور ابدی جس کا نام گوتم ہے اور مائیکل اور ہری اور سرل، اور کمال رضا۔ اس کی تنہائی امٹ ہے۔"

سرد تاریک ہواؤں میں ان کی آواز ڈوب گئی سبز کہرے نے ان کو اپنے اندر ڈھانپ لیا۔

۹۵

طلعت دوسرے روز صبح منہ اندھیرے ٹیوب میں بیٹھ کر چیلسی روانہ ہوئی۔ اس وقت بہت سخت سردی پڑ رہی تھی اور دھند کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن ابھی سنسان پڑے تھے۔ وہ چیلسی پہنچ کر اس مانوس سڑک پر چلنے لگی جس پر کئی سال سے چلتی آئی تھی۔ یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اس نے سوچا کملا کے بلاک پر پہنچ کر حسب عادت فرن کے پتوں کو چھوا۔ بوڑھے پورٹر نے، جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا، اسے دیکھ کر سر ہلایا اور مسکرایا۔ برسوں سے مسٹر جنکنز اور طلعت میں نے یہ مکالمہ ہوتا آیا تھا: کیسا اچھا موسم ہے یا کیسا برا موسم ہے یا اچھی ہوا چل رہی ہے یا بہار آنے والی ہے۔ مسٹر جنکنز زندگی کے اس ڈرامے کا خاموش کورس تھا۔ مسٹر جنکنز، جس کا دایاں ہاتھ برما کے محاذ پر کٹ گیا تھا، لفٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔ طلعت اوپر پہنچی۔ گیلری کے دبیز سرخ قالینوں پر سے گزر کر اس نے کملا کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ آج گویا جو کچھ ہو رہا تھا ایک اداس سے رمز کی حیثیت رکھتا تھا۔ کملا نے دروازہ کھولا۔ اس کا سامان فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ خاموشی سے، ایک لفظ کہے بغیر دونوں پیکنگ میں جٹ گئیں۔ اتنے برسوں میں کتنی گرہستی جمع ہو گئی تھی۔ برتن، کتابیں، ہابوسات۔ یہ بھی تم لے لو، یہ بھی تم لے لو۔ کملا میکانکی انداز سے کہتی چلی گئی۔ کتابوں کو بڑے ٹرنک میں ٹھونسا گیا۔ جوتے نکال باہر پھینکے گئے۔ تصویریں دیواروں پر سے اتریں۔ سامان کے ڈھیر پر بیٹھ کر ایک اٹیچی کیس بند کرتے کرتے کملا نے یکلخت ہوا میں ہاتھ لہرا کر Ash

Wednesday پڑھنا شروع کر دی اور پھر اسی طرح چپکی ہو کر سلیپر اور ہاؤس کوٹ سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ باہر ابھی دھندلکا موجود تھا۔ ایک آدھ روشنی کسی فلیٹ میں جھلملا جاتی تھی۔ ''یہ گوتم صاحب بھول گئے یہاں پر۔'' طاعت نے ایک کتاب اٹھا کر اسے الٹا پلٹا اور صندوق میں اوپر سے گرا دیا۔ جس طرح تالاب میں پتھر گراتے ہیں۔ اب وہ تھک گئی۔ چائے بنائی گئی۔ سویرا ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد کملا کینیڈا کے لیے روانہ ہو گئی۔

اب طاعت نے کمال کا سامان پیک کرنے کی غرض سے واپس گھر کی طرف رخ کیا۔ صبح دس بجے کمال کی بوٹ ٹرین چھوٹ رہی تھی۔

۹۶

جہاز کے برآمدے میں آرکیسٹرا کا رخصتی نغمہ بلند ہوا۔ کمال کا دفعتاً دل بھر آیا، وہ ریلنگ پر جھکا نیچے دیکھتا رہا۔ لندن میں اسے بوٹ ٹرین پر پہنچانے کے لیے بیسیوں لوگ آئے تھے۔ آنسو پونچھے گئے تھے۔ رومال ہلائے گئے تھے۔ اوجیت اور ترونا نے تو چول چول چول بھی شروع کر دیا تھا۔ قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا.......... گویا وہ سپاہی تھا اور ایک ایسی جنگ میں کودنے جا رہا تھا جس کا مقصد کسی کو معلوم نہ تھا۔

مگر پورٹ سمتھ میں وہ اکیلا تھا۔ اجنبی بندرگاہ، اجنبی مسافر، دنیا کی

اجنبیت ابھی سے اس کے لیے شروع ہوگئی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ برابر میں دو بوڑھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے شفقت سے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کمال نے جذبہ تشکر میں ڈوب کر اسے دیکھا۔ بوڑھا سونی سونی آنکھوں سے بندرگاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا تو وہ اپنے کیبن میں آ گیا اور سارا دن اس نے اپنے کیبن میں گزار دیا۔ اپنے ہم سفر سے بھی بات نہ کی جو کوئی اطالوی معمار تھا۔

دوسرے روز اس نے سارے جہاز کا جائزہ لیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فارن سروس کے چند اعلیٰ حکام اور ان کے خاندان فوجی افسر طالب علم جو سرکاری وظیفوں پر سفر کر رہے تھے۔ چند پاکستانی، ہندوستانی اور لنکا کی لڑکیاں جو ڈاکٹری اور ایجوکیشن کی ڈگریاں لے کر لوٹ رہی تھیں۔ انگریز اور امریکن جو دولت مشترکہ اور امریک امداد کے پروگراموں کے تحت برصغیر کو ترقی دینے کی غرض سے جا رہے تھے۔ ٹورسٹ کلاس کا مجمع زیادہ دلچسپ تھا۔ طلباء جو اپنے خرچے پر پڑھنے آئے تھے۔ ان پڑھ سکھ اور کاروباری، مشنری، کیتھولک راہبات، ایک فرانسیسی بھکشو۔ برلن کی مسجد کے قیادیانی مبلغ اور ان کا خاندان۔ پنڈت جی، جن کو کمال لندن میں بھی جانتا تھا جو چھٹی پر گھر جا رہے تھے، اور مغل سکول میں پڑھاتے تھے۔ شدھ ہندی بولتے تھے۔ بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ گھنگھریالے لمبے لمبے بال، لڑکیوں کی ایسی خوبصورت شکل، دبلے پتلے نازک سے، مہاتما گاندی کے چیلے، بے حد ہنس مکھ اور خوش اخلاق۔ چلے کے جاڑوں میں بھی لندن میں دھوتی اور چپل پہنتے۔ برج کے علاقے کے لوک گیتوں پر ریسرچ کر رہے تھے۔ ''ری اماں

مورے بھیا کو بھیجوری کہ ساون آیا'' خوب لہک لہک کر گاتے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کمال سے فرداً فرداً سارے دوستوں کی خیریت پوچھی اور کماری نرملا کے دیہانت پر اظہارِ تعزیت کیا۔ مائیکل بھی، جو جبرالٹر تک جا رہا تھا، ٹورسٹ کلاس میں تھا۔

شروع شروع میں فرسٹ کلاس کی لڑکیوں نے کمال کے بے حد دلچسپی سے دیکھا مگر جب اس نے کوئی پیش قدمی نہ کی تو وہ اکتا کر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ایک روز کمال برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ریلنگ میں پیر اٹکائے واقعتاً سمندر کی لہریں گن رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز آئی:

''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

''ضرور اس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہی بوڑھا کھڑا مسکرا رہا تھا جس نے پہلے روز کمال کو خاموشی سے دلاسا دیا تھا، وہ اس اجنبی بوڑھے کی اس چھوٹی سی مہربانی کا بے حد ممنون تھا، وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور اس کے لیے دوسری آرام کرسی کھینچ لی۔''

''فریڈ، پال، تم لوگ بھی ادھر آ جاؤ۔''

''ٹھہرو، ہم بیئر لے آئیں۔''

چند لمحوں بعد دو اور یورپین آ کر قریب بیٹھ گئے۔

''میرا نام ڈاکٹر ہینس کریمر ہے۔ میں آسٹرین ہوں۔ میں اور میرے دونوں دوست، جو تاریخ کے پروفیسر ہیں، انڈیا جا رہے ہیں۔ تم انڈین ہو؟''

''ہاں''

''اسی لیے میں نے پہلے سے پوچھ کر اطمینان کرلیا کیونکہ کل میں نے اس سامنے والی لڑکی کو انڈین کہہ دیا تو وہ بھڑ گئی، وہ پاکستانی ہے۔'' تینوں کھوکھلی سی ہنسی ہنسے۔

کمال خاموش رہا۔

''تم انڈیا میں رہتے ہو۔''

''جی''

''میں بوڈا جینٹی کے لیے جا رہا ہوں۔'' ڈاکٹر کریمر نے کہا۔

''اوہ؟ اوہ! بدھ جینتی!!''

''بوڈا تاریخ کا سب سے بڑا آدمی تھا۔'' پال نے اظہار خیال کیا۔ ''تم ہندو ہونا؟''

''جی نہیں۔''

''اوہ، معاف کرنا، مجھ سے پھر غلطی ہوئی۔ تو کیا تم محمڈن ہو؟''

''جی۔''

''تو پھر انڈیا میں کیسے رہتے ہو؟''

''یہی اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' کمال نے جواب دیا۔

''ہائی ڈوک.........ایک امریکن نے بشاشت سے قریب آتے ہوئے کہا۔

''ہائی! اس نے بے تکلفی سے کمال کو مخاطب کیا۔

''ہائی!!'' کمال کہتے ہیں۔

''میرا نام ٹامس جیرلڈ ٹیکز ہے۔مگر مجھے ٹام پکارو اور تم؟''

''مجھے کمال کہتے ہیں۔''

میں تم کو کم کہوں گا...........کپلنگ کا کم!!؟

''لو بیئر پیو اولڈ نام۔'' کمال نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

''باقی جرنلسٹ لوگ کہاں ہیں؟''فریڈ نے پوچھا۔

وہ لوگ بھی آ گئے۔ان میں سے ایک فرانسیسی تھا، مارلیس، جو ہند چینی جا رہا تھا۔وہ دوسرا ایک مشہور برطانوی شاعر تھا جو بی بی سی کے نمائندے کے حیثیت سے بدھ کی پچیس صد سالہ برسی میں شرکت کے لیے عازم ہند تھا۔چند دولت مند امریکن سیاح خواتین تھیں جو امریکہ سے اسی یاترا پر نکلی تھیں۔ایک فرانسیسی بھکشو نارنجی چادر میں ملبوس سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا رہتا، وہ بھی گیا اور بنارس جا رہا تھا، وہ ٹورسٹ مسافر تھا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ تم دوڑ دوڑ کر نیچے بہت جاتے ہو۔'' کھانے کے وقت ٹام نے مسکرا کر دوستانہ لہجے میں کمال سے کہا۔''کیا وہاں تمہاری گرل فرینڈ سفر کر رہی ہے؟''

''نہیں میرا پرانا دوست ہے، مائیکل گولڈ اسٹائن کیمبرج میں میرا ہم جماعت تھا۔اس سے آپ ضرور ملئے گا۔''

''مائیکل گولڈ اسٹائین، یہودی ہے؟''پال نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اوہ۔''

خاموشی چھا گئی۔

''اور سونے پر سہاگہ یہ۔'' کمال نے گلا صاف کر کے کہا، ''کہ اسرائیل جا رہا ہے۔''

شام کو کمال نے مائیکل کو ان سب لوگوں سے ملوایا۔ پنڈت جی بھی اس حلقے میں شامل ہو گئے۔ اب ان سب کی اٹھک بیٹھک ساتھ رہتی۔ ایک بیگم صاحبہ نے، جو نیو پارک سے آ رہی تھیں، کئی مرتبہ کمال کو اپنی محفلوں میں بلایا۔ ان کی لڑکی بھی ہمراہ تھی اور یونیورسٹی آف سن سنائی سے سوشل سائنس میں ایم۔ اے کر کے آ رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر کم عقل تھی۔ بیگم صاحبہ کے گروہ میں اعلیٰ افسران اور دوسرے بڑے لوگ شریک رہتے۔ دو مسلمان لڑکیاں اور تھیں جو ہمیشہ ٹنٹک کرتی رہتیں۔ ایک مرہٹی لڑکی گاتی بہت عمدہ تھی۔ یورپین اور امریکن لڑکیاں ہر وقت آفتابی غسل میں مصروف رہتیں کمال کی شکل وصورت اور اس کی کم آمیزی سب کو بہت بھا گئی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہر وقت بلڑ مچانے والا لڑکا ہے جو ایسا فقیر منش بنا ہوا ہے۔

دن بھر اور رات گئے تک وہ سب ادھر ادھر کرسیوں پر بیٹھے کتابوں پر تبصرہ کرتے۔ فلسفہ تاریخ کھنگالا جاتا۔ پنڈت جی کیرتن کرتے۔ لیلا بھاسکر گاتی۔ رات کو رقص ہوتا۔ سینما دیکھا جاتا۔ ہر طرف زور شور میں فلرٹیشن چل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصے تیار ہو گئے۔ شادی شدہ بیگمات مسلمان لڑکیوں کی ایک ایک بات نظر میں رکھتیں۔ جہاز پر ایک شادی بھی تقریباً طے ہو گئی۔ ایک پٹھان انجینئر صاحب تھے ایک کراچی کی ماہر تعلیم صاحبزادی تھیں۔ دونوں گھنٹوں ڈیک پر

کھڑے ہو کر سمندر کے منظر کا مطالعہ کریں تو لامحالہ بہن رشیدہ سلطانہ کے کانوں میں شادی کی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔ ایک شادی شدہ بزرگ، جو تنہا سفر کر رہے تھے، بہن ایڈوینا رتن وردھن پر بہت مہربان ہو گئے جو کولمبو جا رہی تھیں۔ اس کا بڑا قصہ رہا۔ کمال یہ سب دیکھا کرتا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی محدود دنیا میں انسانوں کی ساری اچھائیاں، ساری کمزوریاں ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ کاش میں بھی ان عام نارمل انسانوں میں شامل ہوتا۔ وہ بعض مرتبہ جھنجلا کر سوچتا اور پھر ڈاکٹر کریمر کے پاس جا بیٹھتا۔ اپنے ساتھی بچھڑ گئے تھے مگر یہ لوگ کتنے اچھے تھے۔ سفر بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔

کل صبح جہاز جبرالٹر پہنچنے والا تھا۔ کمال مختلف گروہوں میں بیٹھ کر لوگوں کی باتیں سن کر، تاش کھیل کر، سوئمنگ کر کے، لائبریری میں رسالے پڑھ کر اب بری طرح اکتا چکا تھا۔ ایک انگریز لڑکی سے فلموں پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد وہ پھر سارے جہاز کا چکر لگاتا پھرا اور آخر سب سے اوپر کے ڈیک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

عقب سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، دور کشتیوں کے پاس ڈاکٹر ہینس کریمر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مائیکل ریلنگ کے سہارے کھڑا ان کو مخاطب کر رہا تھا۔ ایک امریکن پروفیسر لڑکی فرش پر دری بچھائے کہنیوں کے بل لیٹی تھی۔ کسی نے گٹار بجانا شروع کر دیا تھا۔

"لکھو۔" مائیکل کی آواز آئی۔

"کیا لکھوں۔" نام نے کہا۔

''جو میں کہتا ہوں اس کی غلط رپورٹ کرو کیونکہ خداوند خدا کی وعدہ کی ہوئی روٹی تم اسی طرح کماتے ہو۔'' مائیکل گرجا۔

''اوہ۔'' کمال نے سوچا، مائیکل اور ٹام میں پھر جھگڑا شروع ہوا۔

''مصیبت یہ ہے مائیک'' ٹام نے کہا'' کہ تم جذباتی ہو۔ آخر ہونا اصل نسل ایشیائی!''

''میں جذبات کو باعث شرم یا گالی نہیں سمجھتا۔'' مائیکل نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔

''آہاہا۔'' پنڈت جی نے زلفیں جھٹکا کر کہا۔ ''آیئے شری رجا جی۔ اپنا مائیکل ایک اور بھاشن دے رہا ہے۔''

''آ نا، پنڈت جی! اس کی ٹوٹا کاوش ناشک میرے پاس بھی نہیں۔''

کمال نے ہنس کر جواب دیا۔

برطانوی شاعر غور سے دونوں کو دیکھتا رہا۔

''مصیبت یہ ہے،'' ٹام نے کمال سے کہا، ''جو غیر ملکی تمہارے ملک کے بارے میں کچھ لکھتا ہے تم اسے ای۔ ایم۔ فارسٹر کے پیانے سے ناپتے ہو جو بے چارہ خود آئیڈیلسٹ تھا۔ بونوں کی دنیا میں رہنے والا دیو۔''

''فارسٹر نے اپنا ناول ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔ اس وقت اس نے ڈاکٹر عزیز کو ہندوستان کے نمائندہ کردار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔'' برطانوی شاعر نے کہا۔

''آج اگر فارسٹر دوسرا ''پیسج ٹو انڈیا'' لکھے تو اسے اپنا یہ کردار بدلنا پڑے گا۔ اب ڈاکٹر عزیز ہندوستان کا نمائندہ نہیں رہا۔ اب ہر مسلمان لامحالہ پاکستانی ہے۔

اب ہندوستان کا صحیح نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔''

''ہاں۔'' کمال نے جواب دیا۔

''کمال تم نے بہت دکھ اٹھائے ہیں؟'' شاعر نے پوچھا۔

''ہاں۔ مگر مظلوم کے روپ میں نظر نہیں آنا چاہتا۔ ہندوستان کی ازلی اور ابدی، دکھ سہنے والی روح۔! یہ تحمل، یہ گریس، یہ دکھ اٹھانے اور برداشت کرنے کی عادت، تم موسیو پال بلال کی طرح دھوتی پہن کر چوکے میں بیٹھ جاؤ تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔''

''سینٹ آگسٹائن تو بنارس میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔'' مارلیس نے پوچھا۔

''کیتھولک نظریہ حیات ایک مخصوص Cult تھا۔ ساری زندگی کو اس نے اپنے اندر نہیں سمیٹا ورنہ تم آج کیتھولک ہونے کے باوجود انڈوچائنا لڑنے کے لیے نہ جا رہے ہوتے۔'' کمال نے چڑ کر جواب دیا۔

''آبزروا اور combatant میں کیا فرق ہے؟'' مارلیس نے پوچھا۔

''یہ تم اپنے آپ سے پوچھو۔ دوسرے جنگ کریں تم اوبزرو کرتے رہو، اس سے کیا احساس جرم کم ہو جاتا ہے؟'' کمال نے کہا۔

''تم تو مجھے کوئیکرز کی طرح پروفیشنل امن پرست معلوم ہوتے ہو۔'' ٹام نے کہا۔

''بھور بھئے گین کے پاچھے مدھوبن موہی پٹھایو۔'' ڈیک کے سرے پر لیلا بھاسکر نے گانا شروع کیا۔ کمال ٹام کی بات کو نظر انداز کر کے گانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پنڈت جی نے تال دینا شروع کی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں لیلا بھاسکر کی

طرف چلے گئے۔

ہر کلچر کی ایک خفیہ زبان ہے جسے صرف وہی کلچر سمجھ سکتی ہے۔ برطانوی شاعر نے کہا۔

''مزید! سپنگارا!'' ٹام نے کہا۔ ''پنڈت اور کم کی کلچر ایک کہاں ہے؟''

''تم تو خیر مائیکل کی بھی خفیہ زبان سمجھنے سے قاصر ہو۔'' برطانوی شاعر نے مسکرا کر کہا۔ ''اسرار تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں ٹامس بے اٹیلز !!''

مائیکل ڈرائی مارٹینی کے اثر میں مبتلا ایک کونے میں چپکا بیٹھا تھا۔ اپنا نام سن کروہ چونکا۔ میکانکی انداز سے اس نے پلٹ کروہیں سے بات شروع کر دی جہاں سے اس کا سلسلہ تقریر منقطع ہوا تھا۔

''لکھو.......... مائیکل پھر گرجا'' دنیا کی اقوام کی تاریخ فتوحات اور سلطنتوں کے قیام اور ملکوں کی آبادکاری سے عبارت ہے۔ میرے ہاں تاریخ کا تسلسل شدید ترین مظالم اور تکلیفوں کی داستان کی طویل کڑی ہے۔ تیرھویں صدی میں مجھے انگلستان سے نکالا گیا۔ چودھویں میں فرانس سے پندرھویں میں اسپین کا قہر شروع ہوا۔ سارا زمانہ میں نے یورپ کے شہروں میں اچھوتوں کی طرح زندہ رہ کر گزارا مگر میں خانہ بدوش، دنیا کی لعنت کا شکار، مشرق اور مغرب دونوں جگہ میں نے آنسوؤں کے چراغ جلا کر علم کی روشنی پھیلائی۔ میں نے بوعلی سینا اور ابن خلدون اور امام غزالی اور الفارابی اور خوارزمی کے نظریوں کو یورپ میں رائج کیا۔ میں نے......

''ٹھہرو......تم بھولتے ہو کہ..........ٹام نے بخشنا شروع کیا۔''

لیلا! بھاسکر گاتی رہی۔کمال نچلے ڈیک پر اتر آیا جہاں برآمدے میں موسیقی بج رہی تھی۔ بیگمات خوبصورت ساریاں اور شلواریں پہنے ایک حلقے میں بیٹھی تھیں ایک میز پر برج ہو رہا تھا۔

دوسری طرف سینما دکھایا جا رہا تھا۔کمال ایک کھمبے سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے اسکرین کے پیچھے عمیق بیکراں اندھیرا تھا۔اسکرین پر ایک غنڈہ صفت لوفروں کی سی شکل والا مشرقی برلین کا کمیونسٹ جاسوس امریکن ہیروئن کو اڑا لے جانے کی فکر میں دبے پاؤں ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے، پھر ہیروئن موزہ اتار کر چھت پر چڑھ گئی۔ دوسری طرف سے ہیرو، جو شاید رابرٹ ٹیلر تھا، کود کر سامنے آیا اور کمیونسٹ ویلن کو چاروں شانے چت گرا کر ہیروئن کو بچانے کے لیے لپکا۔

''آیئے، آیئے، بیٹھیے کمال صاحب۔'' مس خان نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں، اب میں چل دوں۔ میں یہ فلم پہلے دیکھ چکا ہوں دراصل۔''

لڑکیوں کو کھس پس کرتا چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں کراچی اور کلکتے کے چند ملک التجار پلیس پگال کا تذکرہ کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ان کی بیویاں اس وقت باہر سینما دیکھنے میں محو تھیں۔ ان کے قریب سے گزرتا ہوا وہ ایک دریچے میں جا کھڑا ہوا۔

کیوں جی، اب کے سے مرسی ڈیز خرید کر خشکی کے راستے واپس آیا جائے کراچی۔کیا خیال ہے؟ وہ فورڈ کونسل تو میں نے اپنے بھائی کو دے دی۔ دریچے کے نیچے برآمدے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ''اچھا جی میں اپریل میں یو۔این۔

سیشن کے لیے نیویارک جا رہی ہوں ۔ مجھے اپنی بھابھی کا پتا ضرور دے دیجئے گا۔
شیو تو اب میں ۵۶ء کا موڈل ہی لاؤں گی ۔"

"کیا کیا جائے ، پاؤنڈ نہیں ملتے ۔"

"میری بڑی لڑکی نے لاہور سے ایم۔ اے کر لیا ہے کہیں اس کی شادی کرائیے ۔"

"کیسا لڑکا چاہیے ۔"

"کم از کم سی ایس پی تو ہو ۔"

"کہیں کام کر رہی ہے بچی ۔"

"جی ہاں ۔ کنڈر گارٹن اسکول میں پڑھاتی ہے ۔ ویسے اس کو تو امریکہ کا اسکالر شپ بھی مل گیا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ شادی ...."

"ہاں جی ۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے ۔ یہ بیگ روم سے لیا؟"

"جی .... آپ .... اب کے امریکہ سے بہت جغادری فریجڈیر لے آئیں ۔"

"جی کیا بتاؤں .... ضروریات زندگی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں ۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے ۔"

کمال دریچے سے ہٹ آیا ۔ سیڑھیاں اتر کر ٹورسٹ کلاس کا چکر لگانے میں مصروف ہو گیا۔ ڈیک پر سردار صاحبان دری بچھائے ہیر گانے میں محو تھے ۔ دوسری طرف رقص ہو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں تاش کھیلے جا رہے تھے ۔ کمال مائیکل کے کیبن کے سامنے سے گزرا اور اسے یکلخت خیال آیا کہ کل صبح مائیکل

جبرالٹر پر اتر جائے گا اور اس کے عین بعد ممکن ہے کہ ساری عمر، مرتے دم تک اس سے دوبارہ ملاقات نہ ہو۔ کیسی عجیب بات تھی۔ سردار صاحبان کے گانے کی آواز مدھم پڑ گئی۔ وہ مائیکل کے کیبن کے باہر ریلنگ پر جھکا کھڑا رہا۔ سامنے پورنماشی کا چاند افق پر طلوع ہو رہا تھا۔ سمندر بے حد پر سکون تھے۔ جہاز لہروں کو چیرتا ہوا وقار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ڈیک کے اس حصے میں مکمل تنہائی تھی۔ صرف فرانسیسی بھکشو ایک سرے پر کمال کی طرف سے پشت کیے بیٹھا تھا۔

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔ سناٹا اتنے زور سے گرجا سا محسوس ہوا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اسے ٹام اور برطانوی شاعر کی باتیں یاد آئیں۔ اس کا جی بیٹھنے سا لگا، وہ ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں اسٹیٹ لیس ہوں، میں اسٹیٹ لیس ہوں۔'' اس نے پہلی مرتبہ اپنے آپ سے کہا۔ سمندر کی لہروں کے سفید جھاگ چاندنی میں چمکتے رہے۔ دور دور دنیا کے چاروں کھونٹ چاندنی کی اس وسیع نیلگوں چادر پر مسافروں سے بھرے ہوئے جہاز چل رہے تھے۔ کانسٹی ٹیوشن اور کوئین الزبتھ۔ امراء کے یاٹ۔ تجارتی اور جنگی بیڑے۔ ان کشتیوں سے موسیقی کے سر بلند ہو رہے تھے۔ دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ یورپ اور انگلستان کے عالم۔ اٹلی کے راہب۔ امریکن سیاح میکسیکو کے نقاش۔ ہندوستان کے رقاص۔ دنیا میں فی الحال امن قائم تھا۔ دلی میں پنڈت نہرو حکومت کرتے تھے۔ زندگی میں بظاہر بڑی گہما گہمی تھی۔

''خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے بھائی۔ مجھے شانتی

چاہیے۔'' کمال نے آہستہ سے کہا۔

فرانسیسی بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت ایسی ہی پورنماشی کی رات، ڈھائی ہزار سال ادھر، اس سمندر کے اس پار ایک ملک میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ چودھویں کا چاند سمندر کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔

''مجھے میرے خیال سے نجات دلاؤ'' کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار نیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ''خیال۔ خیال خود کو نہیں جان سکتا۔ خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے۔ اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سناٹا ہے۔'' اس نے فرانسیسی میں کہا۔

''مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔'' کمال نے کہا۔

''شونیا............سناٹا............شونیتا............سونا جو ذات مطلق ہے، جو صفر کا تصور ہے۔''

''مجھے اس تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔'' اس سناٹے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس نے مہایان مذہب کے اس فرانسیسی بھکشو کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا جو سوربون یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف فلاسفی تھا۔

''میں اسٹیٹ لیس ہوں اور یہ تمہاری سکھ وتی نہیں ہے۔'' اس نے دل میں کہا

اور بھاری بھاری قدم رکھتا اپنے ڈیک پر واپس آ گیا۔ رات گزر گئی۔
جہاز اپنا سفر طے کرتا رہا۔ منزلیں گویا قریب تر آتی گئیں۔

۹۷

ہندوستان کا ساحل! بمبئی!! گھر!!! گھر؟؟

کمال لکھنؤ پہنچا۔ گلفشاں کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ اسے دنیا بدلی ہوئی نظر آئی۔ باغ کے درخت جل چکے تھے۔ پودے سوکھ گئے تھے۔ گھاس کی جگہ جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ موٹر خانہ اور اصطبل گودام بنے ہوئے تھے۔ (جتنے عزیز پاکستان ہجرت کر کے جاتے ہیں اپنا اپنا سامان لا کر یہاں ڈمپ کر دیتے ہیں، خالد بیگم نے کہا) شاگرد پیشہ سنسان پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں نے گنگا دین کو ڈھونڈا۔ قدیر اور قمرن کی تلاش کی۔ حسینی کی بی بی اور رام اوتار اور چھٹکی کو آوازیں دی۔

آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گیا اور چپکے چپکے رونے لگا۔ دنیا وہی تھی۔ گلفشاں، لکھنؤ، عزیز رشتے دار۔ سب کچھ وہی تھا۔ کیا صرف وہ خود بدل گیا تھا؟ کیا وہ اپنے باپ کی تنگ دستی دیکھ کر جذباتی طور پر مضطرب تھا؟ وہ جس کی ساری عمر زمینداروں کے خلاف نعرے لگاتے گزری تھی۔ زمینداری کے خاتمے کی وجہ سے اب اتنا بڑا زوال آیا تھا کہ گلفشاں والوں کے یہاں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے چلتی تھی۔ (بہت انقلاب انقلاب کرتے تھے۔ لو بوڑھے باپ کو

اکیلے پر بیٹھا دیکھ کر اب تو خوش ہو لو، نواب صاحب بہادر نے کہا) بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہو گئیں تم ہم کس گنتی میں ہیں، شام کو اپی نے اس سے کہا جو اس سے ملنے کی خاطر جھانسی سے آئی ہوئی تھیں۔ نانپارہ کی کراکری بک رہی ہے۔ راجہ سورج سنگھ کے پاس ایک دھیلہ نہیں رہا۔ امی نے اپنے آدھے زیور بیچ ڈالے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' کمال نے اپنے بابا سے پوچھا۔ ''کربلا ہجرت کیجئے گا پاکستان؟''

''یہیں رہوں گا۔'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''کوئی ہم بھگوڑے ہیں۔''

کمال ہکا بکا رہ گیا۔ ''مگر بابا آپ تو بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔''

''ہاں ہاں تو پھر؟'' پاکستان بن گیا، ٹھیک ہوا۔ اب اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم بھی بھاگ جائیں جہاں سے۔

''آپ پاکستان کو اپنا جائز وطن سمجھنے کے باوجود ہجرت نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ سوچتے ہیں کہ اس بڑھاپے میں کہاں دربدر مارے پھریں گے یا اس لے کہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور اس سے محبت کی بناء پر اسے نہیں چھوڑ سکتے۔''

کمال آج قطعی طور پر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے باپ اور اس کے باپ کی نسل کے لوگوں کی نفسیات آخر کیا تھی۔ ان کے آئیڈیلز، ان کی منطق، ان کی بہادری یا بزدلی۔

''اب تم سے جرح کون کرے۔ تمہاری کھوپڑی ہمیشہ کی الٹی ہے۔'' نواب

صاحب نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ان کو آج عدالت سے جا کر معاوضے کی قسط کے دوسو روپے لانے تھے جن سے مہینے کا خرچ چلتا تھا۔

''اب میں عامر بھیا کی دلہن کے در پر تو جا کر پڑنے سے رہی کراچی میں۔ یہاں کم از کم اپنا گھر تو نہیں چھنا ہے۔اگر چلے گئے تو یہ بھی گیا اور معاوضہ بھی ختم، وہاں کون کلیم ولیم کرتا پھرے گا۔ویسے میرا دل نہیں لگتا اب یہاں۔'' امی بیگم نے کہا۔

''مگر یہ تو آپ کا گھر ہے، آپ کا شہر، آپ کا وطن، جنم جنم کا دیس۔''

''مسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔سارا جہاں وطن ہے۔'' چھوٹے پھوپھا نے کہا جو حال ہی میں ہجرت کر کے کراچی گئے تھے اور ان دنوں سامان کا تیا پانچہ کرنے آئے ہوئے تھے۔

کمال نے مزید تبادلہ خیالات اس موضوع پر لا حاصل سمجھا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

چند روز بعد اس نے کمر کس کر ملازمت کی تلاش شروع کی۔اس کے پاس ان گنت ڈگریاں تھیں۔ٹرنٹی کالج، کیمبرج۔امپیریل کالج آف سائنس، لندن اور کئی سال اس نے انگلستان کی ایک مشہور لیبارٹری میں نوکری کی تھی۔برطانیہ کی ملازمت چھوڑ کر وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے واپس آیا تھا۔یونیورسٹی میں جس جگہ کے لیے وہ کوشاں تھا وہ ایک معمولی ایم۔ایس سی کو دے دی گئی چونکہ وہ ہندو تھا۔

چھ مہینے گزر گئے، وہ دلی کے چکر لگا لگا کر دیوانہ ہو گیا۔

''میاں کسی سے سفارش کروالو۔'' نواب صاحب نے کہا۔

''سفارش تو میں قیامت تک نہیں کرواؤں گا۔کیا مجھے اپنی اہلیت پر بھروسہ نہیں جو سفارشیں کرواتا پھروں۔''

''یہی تو تمہارے دماغ میں خناس ہے۔''

اب وہ سارا سارا دن گلفشاں میں چپ چاپ پڑا رہتا یا طاعت کو خط لکھتا: انڈیا ہرگز مت آنا۔جہاں تک ہو سکے وہیں رہے جاؤ۔یہاں آؤ گی تو وہی حشر ہو گیا جو میرا ہورہا ہے۔

تم کو کیا ہو گیا ہے۔طاعت جواب دیتی۔''اتنے ڈی مورالائزڈ کیوں ہو گئے۔جدوجہد کی ہمت ہار بیٹھے۔یہی تو وقت ہے آزمائش کا۔ڈٹے رہو، مزدوری کرو، ہل چلاؤ۔آخر انقلاب کا سامان کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔مگر کیا تم عیش کے خواب دیکھ رہے ہو؟''

کیا لڑکیوں میں ہمت زیادہ ہوتی ہے؟ وہ سوچتا یا وہ آئیڈیلسٹ پرلے درجے کی ہوتی ہیں۔بہر حال طاعت کے خطوط سے اس کو بڑا سہارا مل جاتا۔

گوتم نے اسے متواتر نیویارک سے خط لکھے۔اس نے کسی کا جواب نہ دیا، وہ لکھتا کیا آخر؟ ہری شنکر امریکہ سے لوٹ چکا تھا۔اور بنگلور میں تعینات تھا۔کمال نے اسے بھی کوئی خط نہ لکھا۔

بھیا صاحب نے کراچی سے ڈاک بٹھادی: فوراً یہاں آجاؤ۔ایک سے ایک بڑھیا عہدے یہاں موجود ہیں۔بس تمہارے آنے کی کسر ہے۔ضد چھوڑ دو۔وہ دوبارہ تبدیل ہو کر برازیل کے سفارت خانے جانے والے تھے اور برابر لکھا

کرتے: آجاؤ..........آجاؤ..........آجاؤ..........

نوبت یہ آئی کہ اب کمال نے ان کے خط کھولنے بھی چھوڑ دیے۔ چند روز بعد اسے بارہ بنکی کے کالج میں لیکچررشپ مل گئی مگر چونکہ بھیا صاحب پاکستانی تھے اور ''گلفشاں'' اور موروثی جائیداد میں ان کا بھی حصہ تھا لہذا کسٹوڈین کا قبضہ شروع ہوگیا۔ نواب صاحب نے عدالت میں کسٹوڈین کے فیصلے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اب دن بھر کمال اس چکر میں مارا مارا پھرتا۔ اس کے لہجے میں اب تلخی آ گئی تھی۔ وہ بہت کم ہنستا تھا۔ اودھم مچانا وہ کب کا بھول چکا تھا۔

''بورژوا انقلابی تھے حضرت۔ جب اصلیت کا سامنا کرنا پڑا تو بیٹا چیں بول گئے۔'' کافی ہاؤس میں کامریڈز نے کہا۔

حسینی اوران کی بی بی بھیا صاحب کی دلہن کے ساتھ کراچی جا چکے تھے۔ قدیر اور قمرن مدتیں گزریں، موٹر بکنے کے بعد، مرزاپور واپس چل گئے۔

ایک روز وہ حسب معمول دلی میں لاج کے یہاں جمنا روڈ پر ٹھہرا تھا اور ایک درخواست لکھ کر میڈنز ہوٹل کے ڈاک خانے میں پوسٹ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ٹامس ایکلز مل گیا جو جہاز پر اس کا ہم سفر رہ چکا تھا۔

''ہلو۔ تم، یہاں کہاں۔'' کمال نے پوچھا۔

''میں سارے ملک کا چکر لگاتا پھر رہا ہوں۔ جنوب، بنگال اور آسام اور اڑیسہ۔ اب راجستھان کا قصد ہے۔''

''تم نے دلی کی سیر کر لی؟''

''ابھی نہیں۔''

''تم نے ہمارا راشٹر پتی بھون دیکھا۔'' کمال نے فخر سے کہا۔ ''اور براڈ کاسٹنگ ہاؤس اور نئی دلی کی عمارات جو نئے ہندوستان کی سمبل ہیں اور پونا انسٹیٹیوٹ اور راج گھاٹ اور...........اور...........'' وہ دفعتاً پرانا کمال بن گیا۔ فکر معاش سے آزاد۔ ہندوستان کا جوشیلا فرزند۔ وہ دلی کی ایک ایک چیز ٹام کو دکھاتا پھرا۔ شام کو اس نے سپر دہال میں کونسرٹ سنانے کا پروگرام بنایا۔

''آج کل تم کیا کر رہے ہو؟'' الپس میں بیٹھ کر قہوہ پیتے ہوئے ٹام نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ نوکری ڈھونڈھ رہا ہوں۔'' اس نے بے فکری سے جواب دیا۔

''بے روزگاری بڑا زبردست پرابلم ہے۔'' ٹام نے کہا۔

''سب کے لیے ہے۔ اس میں میری کیا تخصیص ہے۔ جب خوشحالی آئے گی تو سارے ملک کے لئے آئے گی۔ یہ تھوڑا ہی دیکھتی پھرے گی کہ یہ ہندو کا دوار ہے یہ مسلمان کا۔ ہم سب اکٹھے ڈوبیں گے اکٹھے ابھریں گے۔''

''لیکن تم نواب زادے ہو۔ تم مزدوری نہیں کرو گے۔'' گلشن نے کہا جسے انہوں نے براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے ساتھ لے لیا تھا۔ تم اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کر سکتے۔

''بالکل غلط ہے۔''

''اچھا تو آؤ میرے ساتھ چلاؤ ٹریکٹر۔''

''اگر میں نے ٹریکٹر چلانے کی ٹریننگ لی ہوتی تو ضرور چلاتا مگر افسوس کہ میں آٹھ سال نیوکلر فزکس میں برباد کر کے آیا ہوں۔''

''سنا ہے پاکستان میں بڑا قحط الرجال ہے، وہاں جاؤ۔ یہاں کیوں جھک مار رہے ہو۔'' **گلن** نے رائے دی۔

''تم بھی یہی کہتے ہو؟''

''بالکل''

رات کی ٹرین سے وہ لکھنؤ لوٹ رہا تھا۔ اسٹیشن پر اسے ہمراز بھائی ملے، وہ بھی لندن سے کراچی آ چکے تھے اور اب اپنی والدہ سے ملنے فیض آباد جا رہے تھے۔

کہو کمال میاں کیا حال ہے؟ انہوں نے پوچھا۔

بہت اچھا حال ہے ہمراز بھائی۔

اچھا تو نہیں دکھتا مجھے۔ کیا قصہ ہے۔ ایں؟

''کچھ بھی تو نہیں ہمراز بھائی۔'' اس نے جلدی سے ان کو آداب کیا اور آگے بڑھ گیا۔

آخر وہ دن بھی آن پہنچا جب کمال نے دہلی جا کر ویزا کی درخواست دی۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اس نے کئی راتیں جاگ کر گزاری تھیں، وہ دنیا کی نظروں سے بچتا پھرا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتی گلفشاں میں صرف سائے ڈولتے نظر آتے۔ دروازے بند ہوتے۔ ہوا سے خالی کمروں کے پردے پھٹپھٹاتے۔ اندر کی خواب گاہ سے بوڑھے نواب صاحب کے کھانسنے کی آواز آتی۔ امی بیگم پچھلے دروازے میں تخت پر بیٹھ وظیفے پر وظیفے کئے جاتیں۔ ہزاروں منتیں انہوں نے مان ڈالیں۔ جناب عباس کی درگاہ پر نذرانے چڑھائے۔ سبطین آباد کے امام

باڑ میں جا کر جمعرات کی جمعرات جناب علی اکبر کے نام کی مجلسیں کروائیں کہ یا مولا کمن بھیا کام پر لگ جائیں، یا مولا کمن بھیا کی مدد کر۔ (بارہ بنکی کی لیکچرر شپ ختم ہو چکی تھی)۔ وہ متواتر اپنے آپ سے مکالمہ کہتی ہے۔ گھاس کھودو، ہل چلاؤ۔ لعنت ہو تم پر۔ موقع پرست، بےایمان، ڈھلمل یقین کہیں کے۔ اب جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی دو جگہ کا آسرا رہ گیا تھا مگر فی الحال وہاں بھی اس کے لائق کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ اس نے بہر حال طے کر رکھا تھا کہ بھوکا مر جائے گا مگر ترک وطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب ایک روز عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ **گلفشاں** کمال کے بڑے ابا یعنی بڑے نواب صاحب مرحوم کے نام سے رجسٹرڈ تھی۔ عامر رضا ان کا اکلوتا وارث پاکستانی تھا۔ **گلفشاں** متروکہ جائیداد قرار دے دی گئی۔ دوسرے روز صبح جب کمال کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو **لکھنؤ** میں پایا۔ تیسرے دن پولیس کے افسر کوٹھی میں تالے ڈالنے کے لیے آ گئے۔ چوتھے روز کمال رضا نے ویزا بنوایا اور اپنے بوڑھے والدین کو لے کر ٹرین میں بیٹھا۔ پانچویں دن ٹرین دلی پہنچی۔ چھٹے دن ٹرین نے بارڈر کراس کیا۔ ساتویں روز کمال رضا کراچی میں تھا۔

ساتویں روز یوم سبت تھا اور انسان اپنا خون پی رہا تھا

''کراچی۔ مملکت خداداد پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کے پانچویں بڑے **ملک** کا دارالحکومت۔ جہاں کے سلمز اور پناہ گزینوں کے جھونپڑے عجائبات عالم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ غلیظ ترین بھیانک ''جھگیاں'' جو قائداعظم کے آس پاس پھیلی ہیں۔ اس شہر میں سفید فام غیر ملکیوں بالخصوص امریکنوں کی بہت بڑی نوآبادی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں بے انتہا خوبصورت کوٹھیاں بنی ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان متوسط طبقے نے اپنی ساری تاریخ میں آج تک اس قدر زبردست خوشحالی حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں نئے دولت مند متوسط طبقے کی حکومت ہے۔ ان کا نیا سماج۔ ان کے نئے اصول۔ کراچی بے حد موڈرن شہر ہے یہاں روز رات کو اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ایک جگمگاتی کائنات آباد ہوتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے لیے یہ مسئلہ انتہائی دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس **ملک** میں جنم لیا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے اور روپیہ بناؤ اور دولت حاصل کرو۔ آج بہتی گنگا میں ڈبکیاں لگا لو، کل جانے گنگا خشک ہو جائے یا اپنا رخ بدل لے۔ تیسرا عنصر شدید ترین فرسٹریشن کا احساس ہے۔ بلیک مارکیٹیئے کو فرسٹریشن ہے کہ مزید بلیک مارکیٹ کیوں نہیں کر سکتا۔ بائیں بازو کا انٹلکچول روتا ہے کہ اب انقلاب کی کوئی امید نہیں۔ جماعت اسلامی والا چلا رہا ہے کہ مسلمان عورتیں بے پردہ گھوم رہی ہیں اور بال روم میں ناچتی ہیں۔ متوسط طبقے والے کی جان کو ہزاروں فکریں کھا رہی ہیں۔ سفارشوں کے بغیر نہ ملازمت ملتی ہے نہ بچوں کا اسکول اور کالج میں داخلہ ہو سکتا ہے نہ عہدوں میں ترقی ہوتی

ہے۔ اوپر سے بنگالی اور پنجابی مہاجر اور مقامیم آبادی کی کش مکش اعصاب پر سوار ہے۔ یہ کش مکش اتنی ہی شدید ہے جتنی غیر منقسم ہندوستان میں ہندو مسلمان کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں آخر امید اب فوجی انقلاب میں باقی ہے۔''

ایک جماعت مہاجرین کی کہلاتی ہے۔ یہ پاکستان کی عجیب ترین مخلوق ہے اور ہندوستان سے ائی ہے اور ملک کے ہر شہر، قصبے اور قریے میں پائی جاتی ہے۔ کراچی میں اس کا ہیڈ کوارٹرز ہے۔ اس جماعت کا خاص ریکٹ کلچر ہے۔

تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہارے کلچر اور تمہارے نظریے علیحدہ ہیں تو جاؤ پاکستان۔ اب ہمارے سر پر کیزں سوار ہو؟ چنانچہ یہ قوم ''مہاجر'' بن کر پاکستان آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا ملا مگر ایک مصیبت کا سامنا درپیش تھا۔ لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکے میں بنگالی۔ دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فرسٹریشن ہوا۔ لہذا ہر مہاجر نے ادبدا کر کراچی کا رخ کیا۔ اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے۔ بڑی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ اتر پردیش کی اس آبادی نے کس خوش اسلوبی سے اپنے آپ کو ٹرانس پلانٹ کرلیا۔ اب یہاں جگہ جگہ ان کی ''کولونیاں'' قائم ہیں۔ یہاں آگرے والے رہتے ہیں۔ ادھر رسپوریوں کا جتھا ہے، وہ حیدر آباد دکن کے جانبازوں کا محلّہ ہے۔ اس طرف گڑھ والے، لکھنؤ والے، دلی والے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے مکان قرضہ لے کر بنائے گئے ہیں۔ زیادہ تر ناظم آباد کا علاقہ ہے۔ لارنس روڈ، الٰہی بخش کالونی، جہانگیر روڈ، مارٹن روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہ خالص، ٹھوس، مسلمان متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی دنیا ہے اور مہاجرین

کی سماجی زندگی کی گویا ریڑھ کی ہڈی۔ ان کی لڑکیاں برقعے پہن کر بسوں میں بیٹھ کر اسکول اور کالج اور یونیورسٹی جاتی ہیں، بندر روڈ پر خریداری کرتی ہیں، ریڈیو پر عورتوں کے پروگرام میں حصہ لیتی ہیں، ویمنز نیشنل گارڈ میں پریڈ کرتی ہیں۔ یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔ یہ لوگ جنگ اور انجام اور ڈان پڑھتے ہیں کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ سال میں ای مرتبہ ویزا بنوا کر خاندان کے بچے کچے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں جس کو اب تک یہ ''گھر'' کہتے ہیں۔ یعنی گھر دراصل سندیلہ یا مرادآباد ہے، **ملک** پاکستان ہے۔

انسانیت کا وہ حصہ، جو برصغیر ہندو پاکستان کی مسلمان قوم کہلاتا ہے، اس کی نفسیات سمجھنا کوئی آسان بات نہیں!

دوسرا طبقہ اعلیٰ طبقہ کہلاتا ہے پچھلے نو سال میں بے حد مستحکم ہو چکا ہے۔ اور محتاج تعارف نہیں۔ اس طبقے کی زندگی اس قدر الف لیلوی ہے کہ اب ''قصہ سوتے جاگتے کا'' اس کے مقابلے میں بالکل ہیچ سمجھو...... یعنی کل جو صاحب بالکل گمنام اور ہما شما قسم کے آدمی تھے آج وہ مرکزی وزیر ہیں یا کروڑ پتی یا بہت مشہور لیڈر۔ پورے **ملک** کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ نہایت ادق بین الاقوامی سیاسی مسائل پر اس فراٹے سے اخباروں میں بیان دیتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ انتہائی معمولی قابلیت کے حضرات اقوام متحدہ اور دوسرے بڑے بڑے عالمگیر اداروں میں **ملک** کی نمائندگی فرماتے ہیں اور ہاولرز کرتے ہیں مگر کوئی برا نہیں مانتا۔

ان گنت خواتین وحضرات اندھوں میں کانے راجہ بنے بیٹھے ہیں۔

اورخواتین! پاکستان کی بیگمات بھی دنیا کی عجائبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کی ساریاں، ان کے زیورات، ان کے ڈنراور پارٹیاں، بیرونی ممالک میں ان کے سفر۔ان کی زندگی کاعکاس اور گویاان کااوفیشل آرگن ماہنامہ مررہےجس میں ان کی دعوتوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔تب اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان دراصل کس قدرترقی یافتہ اوردولت منت ملک ہےجس کی آدمی آبادی صرف ڈنراورایٹ ہوم کھاتی ہےاورسمبا ناچی ہے۔

ہندوستان پوری کوشش کرکے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ تقسیم غلط تھی اور ملک دراصل ایک ہےاوراس کی تہذیب ناقابل تقسیم۔پاکستان یہ ثابت کرتا ہے تقسیم بالکل جائز اورصحیح تھی اور یہاں کی کلچر بےحد مختلف ہے اوراسی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا ہے۔

ادھر ہندوستان کہاتا ہے کہ سارے مشرق کی تہذیب کامنبع اس کاکلچر ہے۔ ادھر گپتاپیریڈ پر روشنی ڈالی جاتی ہے ادھر خلافت راشدہ اورعباسیوں اورمغلوں کے زمانے کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ان دونوں ممالک کاپروپیگنڈہ غرضیکہ بڑےزوروں میں چالو ہے۔اوراس چاند ماری کانشانہ مغربی ممالک۔

ایک اورعجیب وغریب چیز یہ ہے کہ ملک کے حالات سےلوگ حد سے زیادہ نالاں ہیں۔اقتصادی مشکلات، گرانی، رشوت ستانی، اقرباءپروری، بےایمانی، چارسو بیسی، سیاسی غنڈہ گردی وغیرہ وغیرہ کا ذکر روانہ بلاناغہ اخباروں کے اڈیٹوریل میں ہوتا ہے۔لوگوں کے پاس بھی سوائے اس کےاورکوئی موضوع نہیں

مگراس کے باوجود کوئی ان حالات کا مداوا کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ پنسلین اور دواؤں کی بلک مارکیٹ ہوتی ہے، ان کو پتا ہے کہ ناممکن سے ناممکن کام ذاتی رسوخ یا سفارش کے ذریعے چٹکی بجاتے میں پورا کرلیا جاتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ شروع سے آخر تک اوپر سے نیچے تک بے ایمانی کا دور دورہ ہے مگر اس کے لئے کوئی کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ عوام جانتے ہیں کہ ان کے لیڈر کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن لیڈر کو بھی چند ایسے گر یاد ہیں جن کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں اتنے پیانے پر مسلمانوں نے اتنے گرے ہوئے کردار کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ بار بار میں نے اپنے نئے دوستوں سے (جن کا تعارف میں تم سے آگے چل کر کروں گا) پوچھا کہ جب مسلمان کو آزادی اور اقتدار ملا تو اس نے من حیث القوم اتنے گھٹیا پن کا مظاہرہ کیوں کیا۔ مجھے بتلایا گیا کہ شروع کے دو تین سالوں میں جس قدر جوش و خروش یہاں طاری تھا اب اس سے چوگنی مایوسی کی عملداری ہے۔ اب تو لوگ کہتے ہیں کہ یار ہمیں بیرونی ممالک میں خود کو پاکستانی کہتے شرم آتی ہے۔ یہی احساس کمتری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔

کراچی میں شام کو لوگوں کو کوئی کام نہیں سوائے پارٹیوں میں جانے یا سینما دیکھنے کے۔ نہ یہاں تھیٹر ہیں نہ کانسرٹ نہ سیمنار نہ دوسری تہذیبی سرگرمیاں۔ تھوڑی بہت دلچسپی غیر ملکی سفارت خانوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ کسی روز برٹش کونسل نے ایلیٹ پر ایک لیکچر کر دیا یا تصویروں کی نمائش منعقد کر لی گئی، کسی

روز امریکن اطلاعات کے دفتر میں کوئی پروگرام ہو گیا، کبھی ایران یا انڈونیزیا فرانس والوں نے کوئی تقریب کر لی، کبھی جرمن سفارت خانے میں فلم شو منعقد کر لیا۔

ویسے بس پارٹیوں کا بڑا زور ہے جن میں یہ خم پہ خم لنڈھائے جاتے ہیں۔ پارٹیوں کے ذریعے لوگ اپنا اپنا مستقبل بناتے ہیں۔ موٹروں کا لین دین ہوتا ہے۔ اعلی عہدے حاصل کرنے کی ٹپس لڑائی جاتی ہے۔ مکانوں اور زمینوں کے الاٹمنٹ کا کاروبار رہوتا ہے۔

یہاں مجموعی طور پر جنگل کا قانون نافذ ہے۔

اعلی طبقہ، جو بڑے بڑے تاجروں، اعلی حکام پر مشتمل ہے، اس کی علیحدہ برادری ہے۔ اتوار یہ لوگ سمندر کے کنارے گزارتے ہیں۔ چھٹیاں لے کر یورپ اور امریکہ جاتے ہیں۔ ان کی اولاد بھی مغربی ممالک میں پڑھ رہی ہے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ سوئیٹزرلینڈ کے بنکوں میں جمع کر لیا ہے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ، جو بات بات پر دوسروں کو غدار اور وطن فروش کے نام سے نوازتے ہیں اور حب وطن کا سارا ٹھیکہ انہوں نے خود لے رکھا ہے، یہی سب لوگ خود انگلستان یا کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔

پاکستانی انٹلکچولز کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ان ذہین لوگوں کا وقت کس بھیانک خلاء میں برباد ہو رہا ہے۔ ان کے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے، کوئی راستہ، کوئی مقاصد، یہ سب بھی جنگل کے قانون میں گرفتار ہیں۔ محض تلخی اور بیزاری اور مایوسی کا فلسفہ ہے، میں ان کا مقابلہ اپنے ساتھیوں سے کرتا ہوں جو ان ہی کی نسل کے

نوجوان ہیں اور پچھلے نو سال میں بالکل مختلف راہوں پر چلتے ہوئے ارتقاء کی منزلوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اکثر میرے نئے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں انڈیا میں ہر مہینے اہم ٹھوس موضوعات پر کتنی ان گنت کتابیں چھپتی ہیں، مختلف شعبوں میں کس قدر زبردست ریسرچ اختیار کی جا رہی ہے، کیسے کیسے رسالے نکل رہے ہیں، کیا کچھ سوچا اور لکھا جا رہا ہے، حکومت فنون لطیفہ اور ادب اور علم کی کتنی سرپرستی کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک اکثر مجھ سے کہتا ہے: ''یار اقسم خدا کی، باہر کے اخبار پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بڑا فرسٹریشن ہوتا ہے۔''

فرسٹریشن ...... یہ لفظ یہاں کی ساری ذہنی زندگی کا سمبل ہے۔

دوسرا لفظ ریکٹ ہے۔ سیاست، ادب، کلچر، مذہب۔ ہر چیز کا نہایت اعلیٰ پیانے پر ریکٹ چلایا جا رہا ہے۔ میرے ذہن پرست دوست جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑے بے نیازانداز میں سوال کرتے ہیں: ''کہو بھئی آج کل کون سا ریکٹ چلا رہے ہو۔''

جب میں ان لوگوں کو اپنی عمر کا بہترین حصہ اس خلاء میں ضائع کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے کس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، یہ لوگ اپنے اپنے کام پر نکلتے ہیں، دوپہر کو ایک نیم تاریک اور غیر دلچسپ کافی ہاؤس میں جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اور شام کو جا کر کوئی انگریزی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ منگل کے منگل کسی ایک کے یہاں جمع ہو کر پھر وہی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اپنے ضمیر کا بڑا احساس ہے مگر زندہ بہر حال رہنا ہے، روزی بہر حال کمانا ہے، اگر بھوکوں ہی مرنا ہوتا تو ہندوستان سے ادھر کیوں آتے (ان میں سے اکثر حضرات ''مہاجر''

ہیں)۔ جرنلسٹ ایمانداری سے رپورٹنگ نہیں کر سکتے کیونکہ اپنے اپنے اخباروں سے نکال باہر کیے جائیں گے ۔ ادیبوں کے پاس لکھنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا (گو بے شمار رسالے نکل رہے ہیں)۔ ترقی پسندی آؤٹ آف فیشن ہوچکی حتی کہ ادب میں جمود کا نعرہ بھی پرانا ہوگیا۔

اسلام...... اس لفظ کی جو گت بنی ہے (کرکٹ میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگے تو سمجھو اسلام خطرے میں ہے)۔ دنیا کے ہر مسئلے کی تان آخر میں آ کر اسی لفظ پر ٹوٹتی ہے۔ دوسرے مسلمان ملک اس بات پر خوب چڑتے ہیں ۔ ساری دنیا کی طرف سے اسلام کا ٹھیکہ اس وقت ان لوگوں نے لے رکھا ہے۔ ہر چیز پر تنگ نظری کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ موسیقی، آرٹ، تہذیب، علم و ادب...... سب کو ''ملا'' کے نقطۂ نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ اسلام، جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ان گنت معاون ندی نالوں کو اپنے دھارے میں سمیٹ کر ایک عظیم الشان آبشار کی صورت میں رواں ہوا تھا، اب وہ سمٹ کر ایک مٹیالے نالے میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ نالہ ایک وسیع بھیڑ میں کہہ رہا ہے جس میں چاروں طرف سے بند باندھے جارہے ہیں ۔

لطیفہ یہ ہے کہ اسلام کا نعرہ لگانے والوں کا فلسفہ مذہب سے قطعی کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کو صرف اتنا معلوم ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال عیسائی اسپین پر حکومت کی، ایک ہزار سال ہندو بھارت پر۔ عثمانیوں نے صدیوں تک مشرقی یورپ کو تابع رکھا۔ امپیریلزم کے علاوہ اسلام کی جو عظیم انسان پرستی کی روایات ہیں ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ عرب حکماء، ایرانی شعراء اور ہندوستانی صوفیائے

کرام کی وسیع القلبی کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ علیؑ اور حسینؑ کے فلسفے سے کوئی غرض نہیں۔ اسلام کو ایک نہایت جارحانہ مذہب اور طرز زندگی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے ملکی اور اشد اہمیت کے مسائل نظر انداز کر کے کلچر کو غیر ملکیوں کے سامنے پیش کرنے کا رجحان بھی زوروں پر ہے۔ یعنی یہ کہ شاید ہماری یہ کتاب انگلستان یا امریکہ سے چھپ جائے، کوئی امریکن فلم کمپنی ہمیں اپنے مووی میں لے، ہم کسی بین الاقوامی کانفرنس میں بھیج دیے جائیں۔

انگریزی جرنلزم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمانوں کے پاس پہلے ہی کون سے اخبار تھے اور کون سی ان کو صحافت کی ٹریننگ ملی تھی اور ۴۷ء کے بعد سے اب تک جو کھیپ یونیورسٹیوں سے باہر نکلی اس میں اچھے لکھنے والے نمودار ہونے چاہئیں تھے۔ ان گنت خواتین و حضرات یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر لوٹے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کوئی اکا دکا خوش نصیب ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار جاتا تھا۔ جانے آج کل لوگوں کو ڈگریاں اور ڈاکٹریٹ کیسے مل جاتے ہیں اور یہ لوگ پڑھ لکھ کر کہاں لا دو دیتے ہیں، یہ اسرار آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستانی لڑکیاں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ (کم از کم شہروں میں کیونکہ متوسط طبقہ موڈرن ہو چکا ہے)۔ ان گنت لڑکیاں ڈاکٹر، نرس اور لیکچرر بن رہی ہیں ملازمتیں کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کی ملازمت کو اب معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مجموعی طور پر پاکستانی خواتین نے فی الواقعہ بہت

ترقی کی ہے اور یہ ایک بہت ہی اچھا شگون ہے۔

رات گزرتی جا رہی ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں آتا جا رہا ہے لکھتا جا رہا ہوں۔ اسی وجہ سے شاید تم کو خط بے ربط معلوم ہوگا مگر اتنی بہت سے باتیں تم سے کرنا ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری آنکھوں سے میرے نئے **ملک** کو دیکھ لو، میری ہمت بڑھاؤ تا کہ میں اس **ملک** کے لیے اپنے بھر برا بھلا کچھ کر سکوں۔

مغربی پاکستان کی سوسائٹی کا ڈھانچہ اب تک فیوڈل رہا ہے لہذا یہاں سیاسی شعور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عوام مڈل ایسٹ کے بادشاہوں کے جلوس دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ جہانگیر پارک میں جمع ہو کر وزیر اعظم کی تقریر سننے کے بعد زندہ باد اور مخالف پارٹی کے لیڈروں کی تقریروں کے بعد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہنستے بولتے خوش خوش گھر لوٹتے ہیں۔ عام طور پر سرکاری اور غیر سرکاری جلسے جلوسوں کے لیے کرائے کے آدمی بلوائے جاتے ہیں نعرہ بازی کے بعد ان کو پیسے دے کر رخصت کیا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈر شپ بڑے بڑے کاروباریوں وار سیٹھوں کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

عوام کی نفسیات اور ہسٹیریا کی عجیب وغریب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

چند سال قبل پنڈت جی یہاں آئے تو عوام کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے پولیس کورڈن توڑ دیے اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھایا۔ پنڈت جی خود ایک نمبر کے جذباتی آدمی، ان پر خوب رقت طاری ہوئی۔ خوش آمدید کے پھاٹک بنائے گئے۔ تقریبات ہوئیں، یہی عوام وقتاً فوقتاً مخالفین کی ارتھی کے جلوس نکالتے ہیں اور ان کے پتلے سڑکوں پر جلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کرکٹ میچ بھی اس ہسٹیریا کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ انڈیا پاکستان کا میچ ہوا تو چند روز کے لیے گمان ہوتا تھا پنجاب تقسیم نہیں ہوا اور لاہور اور امرتسر حسب سابق ایک ہی صوبے کے دو شہر ہیں۔ ہزاروں سکھ اور ہندو جوق در جوق سائیکلوں پر بیٹھ کر لاہور آئے۔ لاہور کے حلوائیوں نے ان کو مفت مٹھائی کھلائی۔ تانگے والوں نے ان سے کرایہ نہیں لیا۔ قیامت کی چہل پہل رہی۔ آئیڈیلسٹ قسم کے کالم نگاروں نے اخباروں میں عظمت انسان کے گن گائے، بڑے دلخراش واقعات بھی ہوئے۔ ایک بوڑھا اندھا سکھ مشرقی پنجاب سے آیا اور اپنے سابق شہر کے گلی کوچوں کے در و دیوار چھوتا پھرا۔ اس نے کہا مجھے میرے پرانے مکان لے چلو جو کہیں شاہ عالمی میں تھا۔ لوگوں نے اسے وہاں تک پہنچایا اور وہ اپنے گھر کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رو دیا۔

میں اس نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اسٹریو ٹائپ کے متعلق ہم نے سوشیولوجی میں بہت کچھ پڑھا ہے مگر جب اصلیت میں اس سے دوچار ہوتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔

مہاجرین کا ایک اور مسئلہ ہے، یہاں ہنوز روز اول ہے۔ ۴۷ء کے ہندوستان میں جو حالت شرنارتھیوں کی تھی وہ آج اٹھ سال گزرنے کے بعد مہاجرین کی ہے اور روز بروز ہولناک تر ہوتی جا رہی ہے۔

چونکہ میں ٹیکنیکل طور پر خود ''مہاجر'' ہوں لہذا اس پرابلم میں نے بہت غور کیا۔ دیکھو بیٹا، بات ساری یہ ہے کہ ہندوستان میں متوسط طبقے کے مسلمان کے قدم اکھڑ چکے ہیں، وہی اسٹریو ٹائپ کا حوالہ یہاں پھر دینا پڑے گا۔ سکیورٹی کی

تلاش میں یہاں کے ناگفتہ بہ حالات جانتے ہوئے بھی ہندی مسلمان یہاں آ جانا چاہتا ہے۔

جب مسلمان لڑکے یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں تو ہند کی دفاعی افواج میں اس لیے نہیں جاتے کہ ان کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ سارے خاندان بٹ چکے ہیں۔ ایک بھائی پاکستان آرمی میں ہے دوسرا نیوی میں، تیسرا آزاد کشمیر ریڈیو میں نوکر ہے، اس کا چوتھا بھائی، جو ابھی پٹنہ میں بی ایس سی کر رہا ہے، انڈین ائیر فورس میں درخواست بھیجنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا لہذا وہ یہاں پہنچ کر جٹ پائلٹ بن جاتا ہے، پٹنے میں شاید کلرک بھی نہ بن سکتا۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ اسے یہ خیال رہتا ہے کہ اگر وہ ملازمتوں کے کمپیٹیشن میں بیٹھا بھی تو ہندو سے، جو زیادہ محنتی ہوتا ہے، نہیں جیت سکے گا، اگر جیت بھی گیا تو تعصب کی وجہ سے اسے سلیکٹ نہیں کیا جائے گا، ہندوستان وطن نہیں ایک قسم کا عارضی پڑاؤ کا کیمپ ہے۔

علی گڑھ میں کہاوت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی سڑک نئی دلی کے بجائے سیدھی کراچی جاتی ہے۔ برطانوی دور حکومت میں مسلمانوں کی دوسری اقلیتوں کی مانند ملازمتوں میں نشستیں مخصوص تھیں، نامزدگی کا دستور تھا اور ہندوستان میں ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں سے جو تعصب برتا جا رہا ہے اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کس کو ہو گا۔

مسلمان کے لاشعور میں ہجرت کا فسوں بسا ہوا ہے۔ پچھلی صدی میں ایشیاء میں سیاسی بیداری کے پھیلتے ہی یہ قوم متضاد مخالف وفاداریوں کی کش مکش کا شکار ہو گئی۔ رہا ہند میں لیکن "میرے مولا بلا لے مدینے مجھے" اس کا محبوب نغمہ تھا۔ پان

اسلام موزم کی تحریک نے اس تصور کو اور دل آویز بنایا اور مسلمان کے یہاں نیشنلزم اور وطن پرستی کا تصور ہی بدل گیا۔ اب ہندوستانیت اور اسلام ہم معنی نہیں تھے کیونکہ اول الذکر میں ہندو ازم بھی شامل تھی اور اس میں انگریزوں نے فرقہ پرست عناصر کے ذریعے الگ ہندویت کی تحریک چلا رکھی تھی۔ ایرانیت اور اسلام، عربیت اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں تھا جس طرح ہر فرانسیسی لامحالہ عیسائی بھی ہے مگر ہندی مسلمان کو اس ملک میں اکثریت کی ایک بڑی رنگین تہذیب اور مضبوط معاشرے سے مقابلہ کرنا تھا لہٰذا وہ اس ماحول میں شامل ہو کر اس سے مدافعت کرتا رہا، مگر یہ مدافعت کب پیدا ہوئی؟ سارے غیر ملکی مبصرین کا، جو مغلوں کے زوال کے وقت ہندوستان میں آئے اور جن کو اس وقت جدا کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا علم نہ تھا جو انیسویں صدی میں تیار کی گئی، یہ کہنا کہ اس طوائف الملوکی کے باوجود ملک میں ہندو مسلم سوال کا وجود نہیں تھا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سوال کس طرح پیدا ہوا۔ انیسویں صدی میں جب ملک کی اقتصادی تباہی کی وجہ سے یہ کھنچاؤ شدید تر ہو گیا، ہندو اکثریت کے ہاتھوں پٹ جانے کے خوف کی نفسیات کا تذکرہ پنڈت نہرو اور سردار پانیکر دونوں نے کیا ہے، یہ سوال تاریخ کا بہت بڑا "اگر" ہے کہ اس خوف کا تدارک کیا جا سکتا، جو کہ کانگریس کر سکتی تھی، تو آج حالات کیا ہوتے۔

خیر۔ تو ہندی مسلمانوں کا صیہون، حجاز تھا۔ یورپین یہودیوں اور ہندی مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی کسی اور قوم نے وفاداریوں کے اس تصادم کا سامنا نہیں کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے علیحدہ ملک بنائے ہیں اور دونوں اب ان مزید

مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔

پاکستان میں جو نفسانفسی کا عالم اور حب وطن کی کمی نظر آتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اس سرزمین سے کوئی بے اختیار جذباتی اور روحانی لگاؤ نہیں، وہ موقع اور سیکیورٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں جس طرح یورپین اقوام امریکہ پہنچی تھیں۔ نیویارک میں رہنے والا پولش بوڑھا وارسا کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے مگر پولینڈ کے اس دھندلے تصور سے اس کی اولاد کو کوئی غرض نہیں جو نئے ملک میں امریکن کی حیثیت سے پروان چڑھتی ہے۔ اسی طرح یہاں پر جو لوگ گومتی کے خربوزوں اور پریاگ کے میلے اور ساون کی گھٹاؤں کو یاد کر کے روتے ہیں ان کی اولاد، جو یہاں بڑی ہو رہی ہے، اس کے لیے یہ سارے تصورات بے معنی اور مضحکہ خیز ہیں، یہ نسل خالص پاکستانی ہو گی اور اس طرح ان متضاد وفاداریوں کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

زبان کا مسئلہ ہماری کتنی بڑی بدقسمتی رہی ہے۔ ہندوستان سے مڈل کلاس مسلمان کے قدم اکھڑنے کی دوسری وجہ سنسکرت آمیز ہندی زبان کا تسلط ہے۔ اپنی زبان کی تباہی کسی قوم کے لیے سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ انسان اپنی دولت لٹتے دیکھ سکتا ہے مگر اپنی زبان اور تہذیب کی بیخ کنی برداشت نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں ہندی مسلمان کو غیر شعوری اور شعوری طور پر اپنی مخصوص تہذیب کی برتری کا ناز بھی رہا ہے چنانچہ یہ اس کی دوسری بڑی زبردست نفسیاتی شکست ہے۔ مسلمان بچے اسکولوں میں ہندی پڑھ رہے ہیں (جبکہ ان کے باپوں کی نسل کے ہندو انہی اسکولوں میں اردو پڑھتے تھے) یہ بچے اگر ہندوستان میں رہ گئے تو

اس نئے تمدنی سانچے میں کھپ جائیں گے، اوراسی میں ان کی عافیت ہے، اگر وہ اسے بھی resist کرنا چاہتے ہیں تو لامحالہ ان کو ادھر آنا پڑے گا۔

زبان کا مسئلہ زیادہ تر شہروں کے مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ پورب کے مسلمان کسانوں کی زبان وہی ہے جس میں ملک محمد جائسی نے پدماوت، کبیرداس نے اپنے دوہے اور تلسی داس نے رمائن لکھی تھی۔

دیہاتوں میں مسلمانوں کو ایک مختلف مذہبی فرقے کی بجائے محض ایک اور جات سمجھا جاتا رہا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اتر پردیش کا وہ مسلمان، جو مسلمانوں کی مڈل کلاس سیاست اور تہذیب کا علمبردار تھا، نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا، اس کی حالت قابل رحم ہے۔

اب میں پھر یہاں کے حالات کی طرف واپس آتا ہوں۔

کل میں بھیا صاحب کے دفتر میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے پبلسٹی کے لٹریچر کی ورق گردانی شروع کی اور بہت سی کتابیں گھر اٹھا لایا۔ رات کو میں نے پچھلے برسوں کے وزرائے اعظم کی اہم ترین تقاریر نکال کر پڑھیں۔ طلعت! وعدوں کا ایک سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اسکیموں کا ایک ریلہ ہے جو آٹھ سال سے اب تک بہتا چلا آرہا ہے۔

مسلمان سیاست ہمیشہ سے مڈل کلاس، شہروں کی سیاست رہی ہے لہذا دیہاتوں کی طرف کوئی بھولے سے بھی توجہ نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے پروگرام میں تقسیم سے پہلے زرعی اصلاحات وغیرہ کا دور دور کہیں ذکر نہ تھا، وہی روایت اب بھی باقی ہے۔ زمینداری کے خاتمے کا فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسی

طبقے کی حکومت ہے۔

آج جمعہ کی رات ہے اور میں ایک انٹلکچول محفل سے لوٹ کر آ رہا ہوں۔ وہاں گھاس پر، قالینوں پر، صوفوں پر بیٹھے گروپ بنا ہے مغربی ادب اور عالمگیر سیاست کی موشگافیاں کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر میں سوچا کیا کہ کاش تم ان سب کی باتیں سنتیں۔ (اس محفل میں دیسی لڑکیاں صرف دو تین ہی ہوتی ہیں، میں نے یہاں کی مسلمان لڑکیوں میں ان کی اعلیٰ تعلیم کے باوجود بنیادی سنجیدہ مسائل کے متعلق سوچنے کی طرف سے حیرت انگیز بے اعتنائی دیکھی)۔

اس محفل کے غیر ملکی ارا کین بھی بہت دلچسپ ہیں۔ الفریڈ ایک انگریز لڑکا ہے جو لندن اسٹیج پر رہ چکا ہے۔ جولین ایک اور انگریز لڑکا ہے، رومن کیتھولک انٹلکچول، اس کا ساتھی رونلڈ ہے، یہ بھی اوکسفرڈ سے آیا ہے۔

اس محفل میں دنیا جہاں کے مسائل پر زور شور سے بحثیں ہوتی ہیں۔ دراصل یہ ایک قسم کا ہائیڈ پارک کورنر ہے جہاں لوگ باگ آ کر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

آج شام وہاں ایک طرف کیتھولک عقیدے پر بحث ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مغرب کے رجعت پسند ادیبوں پر تبرا بھیجا جا رہا تھا۔ ایک فرانسیسی پر الجیریا کے سلسلے میں لعنت ملامت ہو رہی تھی۔ امریکن امداد کے بارے میں میری رچرڈز کی لوگ جان کھا رہے تھے۔ میں دوسری طرف مڑا۔ قالین کے ایک سرے پر اجلا کا گروپ فرانسیسی انٹلکچول سے الجھ رہا تھا۔ کانگریس آف کلچرل فریڈم کا تذکرہ

تھا۔

"فرانس کی موجودہ دگرگوں حالت سے مغربی دانشوروں کی حالت غیر ہے۔ فرانس، جو یورپ کی کلچر اور ذہن کا سمبل تھا، اس کے موجودہ رویے نے مغربی انٹلکچولز کو ہڑبڑا دیا ہے۔ مغرب کا اب واقعی زوال ہو گیا ہے۔ اب اس کے پاس اپنے جواز میں کوئی دلیل نہیں۔" تنویر گرج رہا تھا۔ "اب اگر کل کو سارتر دوبارہ تائب ہو جائے تو میں متعجب نہ ہوں گا۔ مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔"

"برطانوی دانشوروں کی کیا مضحکہ خیز حالت ہے۔ امریکہ سے روپیہ کھاتے ہیں.........."

یوجین دوسری طرف گوہر افشانی کرنے میں مصروف تھا۔ میں ٹہلتا ہوا جا کر امریکنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ "میری.......... ذرا امریکن ایڈ دینا۔" رونلڈ نے سگریٹ لینے کے لیے میری رچرڈز کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ قہقہہ لگا کر ہنسی، بری خوش اخلاق لڑکی ہے۔

دوسرے گروپ میں چند بین الاقوامی شہرت کے مورخ بیٹھے تھے جو چند روز کے لیے کراچی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

"اگر امریکہ خانہ جنگی کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو ہم لوگوں کا آج تک جانے کیا حشر ہوا ہوتا۔" امریکن مورخ نے کہا۔ "تم اپنی تھیوری مت دہرانا کہ تقسیم کی وجہ اقتصادی تھی۔" اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ملایا۔ "اس کے علاوہ کیا تھا، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

''میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ مشرق کے ڈاؤن فال کی اصل وجہ کیا ہے؟''
فرنی نے کہا۔

''میں نے ٹوئنبی سے بھی یہ پوچھا، وہ حیران ہیں ہندوستان کا اٹھارہویں صدی میں کیوں زوال ہوا۔''

''ہندوستان کی نہری آبپاشی کا انتظام ناقص تھا۔'' جیکب موریسن نے کہا۔
''یہ مسئلہ خالص زرعی ہے۔'' اب رونلڈ اور یوجین اور میری رچرڈز ایک اور بحث کر رہے تھے۔

''مشرق کے ڈاؤن فال کی وجہ اسلام ہے۔''

''ایں؟''

ریفرمیشن کے بعد عیسائی یورپ نے انتقاد کی اسپرٹ پیدا کی، وہ اسلام میں آج تک موجود نہیں۔ تم اعلانیہ اپنے مذہب پر اعتراض کر سکتی ہو؟ تمہارا جینا دوبھر کر دیا جائے گا۔

''واہ، اسلام میں بھی بدعتی اور باغی پیدا ہوتے رہے ہیں۔'' فرنی نے کہا۔

''ہاں، مگر اپنے رسولؐ یا خدا کے تصور یا قرآن .... کسی چیز پر بھی تنقید کر سکتی ہو؟ عیسائیوں کے یہاں ان گنت چرچ ہیں اور ملحدوں کی فوج کی فوج موجود ہے۔ عیسائی بڑے اطمینان سے تثلیث اور ورجن میری کے تصور کا مذاق اڑاتے ہیں کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ مسلمان سائنٹیفک طریقے سے سوچنے کا اہل نہیں۔''

''جبھی ٹوئنبی نے کہا ہے کہ انڈک سوسائٹی اسلامک سوسائٹی کے مقابلے میں زیادہ روادار ہے۔''

''بدھ ازم اور..........''

ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ وہاں سے اٹھے۔ ائیر پورٹ جا کر قہوہ پیا۔ جب میں واپس گھر پہنچا اس وقت میں تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔

سامنے ٹام کی کوٹھی ہے۔ اس میں روشنیاں بجھ گئی ہیں۔ ٹام بھی کسی پارٹی سے لوٹ کر سونے جا چکا ہے، یہ لڑکا میرے ہمراہ جہاز پر بمبئی آیا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے اخبار نویس ہے، کچھ عرصے ہندوستان میں گھومتا پھرا۔ اب محکمہ فشریز یعنی مچھلیوں کا ایڈوائزر ہو کر یہاں آ گیا ہے۔ فشریز کے علاوہ براڈ کاسٹنگ کو بھی ایڈوائز کرتا ہے۔

ایڈوائزرز کی ہر طرف ریل پیل ہے۔ ہر محکمے میں ان گنت ایڈوائزر منسلک ہیں جو جانے کیا جادو سکھاتے ہیں مگر اب تک کوئی ترقی کہیں نظر نہیں آئی۔

چہار سو اسکنڈلز کا بازار گرم ہے۔ رشوت کے اسکنڈل، دھاندلی اور سیاسی غنڈہ گردی کے اسکنڈل۔

آج سب سے بڑا واقعہ، طلعت میری چہیتی بہن، یہ ہے کہ میں لکھنؤ کا انقلابی، کانگریس کا سرگرم کارکن، متحدہ ہندوستان کی عظمت کا جوشیلا نقیب، آج صبح میں بارہ سو روپے ماہوار کے ایک عہدے پر لے لیا گیا۔ ایک پوری لیبارٹری مجھے سٹ اپ کرنا ہے۔ اس کے لیے ساز و سامان خریدنے میں شاید جلد امریکہ بھیج دیا جاؤں۔ فی الحال اسی کام کے سلسلے میں اگلے ہفتے مشرقی پاکستان جا رہا ہوں۔ اگلا خط تم کو ڈھاکے سے لکھوں گا۔

اب صبح ہو رہی ہے۔ ساری رات میں نے تم کو خط لکھنے میں گزار دی، حد

ہے۔میں نے جانے کتنے صفحے سیاہ کر دیے ہوں گے۔ابھی میں نے دریچوں کے پردے ہٹائے اور باہر جھانکا۔کراچی جگ اٹھا ہے۔کراچی اپنے کام پر جا رہا ہے۔سینکڑوں ہزاروں انسان سائیکلوں، چھکڑا ایسی بسوں، سائیکل رکشاؤں پر سوار کارخانوں اور دفتروں کی طرف رواں ہیں، یہ وہی لوگ ہیں بٹیا جن کو عرف عام میں جتنا کہا جاتا ہے۔طاعت! ان لوگوں نے تو کوہی قصور نہیں کیا، کوئی جرم۔ ان کو تعلیم نہیں دی گئی۔ان کو بھوکا رکھا گیا۔ان کو جس لاٹھی سے ہانک دو ہنک جائیں گے، یہ سب امن سے زندہ رہنے، پیٹ بھر روٹی کھانے، آرام سے سونے کے مستحق ہیں۔طاعت جس وقت صبح سویرے ہزاروں انسانوں کا ریلا پی آئی ڈی سی کے نئے ڈاک یارڈز کی طرف بڑھتا ہے اس وقت، قسم خدا کی، وہ نظارہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔مجھے پاکستان کے مستقبل سے امیدیں سی بندھ جاتی ہیں، یہ بڑے معصوم بے ضرر انسان ہیں، یہ لوگ جو اس جدید، بے ہودہ، بدشکل بوم ٹاؤن کی پندرہ لاکھ آبادی ہیں، یہ مکرانی اونٹ گاڑی والے، رنگ برنگے لہنگے پہنے راجستھانی اور کاٹھیاواڑی مزدورنیں، سعود آباد کولونی میں رہنے والے بنارس کے جولاہے (جن کے پرکھ کبیر کے ساتھ پنچ گنگا گھاٹ پر دوتارہ بجاتے پھرتے ہوں گے، لالو کھیت اور لیاری کی لرزہ خیز مہاجر بستیوں کے باسی، مغربی یو۔پی۔کے کاری گر، دلی کے بساطی، بمبئی کے ٹیکسی ڈرائیور اور چاءخانے والے، فٹ پاتھ پر دکانیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے کاروباری، انجام کولونی اور آگرہ تاج کولونی کے باشندے جو ہاکس بے کے راستے پر ہندوؤں کے سابقہ شمشان گھاٹ کی دلدل میں جھونپڑے ڈالے پڑے ہیں اور اپنی اپنی جھگیوں پر چاؤ سے چاند تارے

کا جھنڈا لہراتے ہیں۔ ہر سال بارش آتی ہے تو ان کی جھونپڑیاں بہہ جاتی ہیں۔ اپوا کی بیگمات آ کر امریکن دودھ کے ڈبے اور کمبل ان کو تقسیم کرتی ہیں اور ان کی جھونپڑیاں اگلی برسات تک کے لئے پھر آباد ہو جاتی ہیں۔ رات میری رچرڈ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ بحیثیت سوشیولوجسٹ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس قدر ناقابل یقین تکالیف کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے باوجود کراچی کی یہ مخلوق اس قدر امن پسند کس طرح ہے، یہ انقلاب کیوں نہیں بپا کرتی۔ تشدد پہ کیوں نہیں اتر آتی، کمال ہے کہ اس کا جواب میری رچرڈ کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔

نہیں طلعت! یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان سے اس لیے متنفر نہ ہو کہ انہوں نے ہلہ کر کے تمہاری دنیا تقسیم کروا دی، یہ بڑے معصوم انسان ہیں۔ ان کو ان مباحثوں، تاریخ کی ان موشگافیوں اور تجزیوں سے کوئی غرض نہیں جو کل رات میں نے اس محفل میں سنیں۔ جو کچھ رونلڈ کہہ رہا تھا، جو کچھ تنویر کہہ رہا تھا، میری رچرڈ کہہ رہی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ میں کارخانے کھل گئے ہیں اور ان کی مشینیں یہ انسان چلا رہے ہیں اور جس ملک میں وہ رہ رہے ہیں اس کا نام پاکستان ہے۔ اب ماضی پر رونے اور ماضی کی غلطیوں پر پچھتانا مضحکہ خیز ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے، یہ سوچنا حماقت ہے کہ دونوں ملک پھر متحد ہو جائیں۔ دنیا کا نقشہ ہر جنگ عظیم کے بعد بدلتا ہے۔ ۴۵ء کے بعد بھی بدل گیا۔ جب میں ماضی کے متعلق سوچتا ہوں میرا دل کٹتا ہے مگر دل کہاں تک کٹے گا۔ زندگی آدھی گزر گئی تھوڑی سی باقی ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم اس

بچے کچے وقت کو سوارت کر لیں۔

اس ملک نے مجھے اپنی حفاظت میں لیا ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ اس کا بنانا یا بگاڑنا اب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جو عمر بھر تخریب کے بجائے تعمیر کے خواب دیکھے ہیں کیا تمہارا خیال ہے یہاں کے ذہن پرستوں کے خلاء میں داخل ہو کر میں آپنے آپ کو کھو دوں گا؟ نہیں طلعت میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔
میں تعمیر کروں گا۔

پی۔ ایس:
تعمیر پر یاد آیا کہ بھیا صاحب کی کوٹھی، جس میں میں مقیم ہوں، بے حد شاندار ہے۔ ایک اطالوی آرکی ٹیکٹ نے بنائی ہے خالص جدید ترین کیلی فورنین وضع کی۔

بھیا صاحب کی دلہن خاصی بدذات ہیں۔ میں سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہا ہوں کہ تم ان کو کس قدر ناپسند کرو گی، وہ اپوا کی بڑی سرگرم کارکن ہیں اور کراچی کی مشہور میزبان خواتین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دلہن بھابھی میری آبادکاری کے بے حد کوشاں ہیں۔ ابھی انہوں نے میرے لیے ایک ہزار گز زمین خریدوائی اور اپنے ایک با اثر چچا کے ذریعے مکان کی تعمیر کی غرض سے پچاس ہزار روپیہ قرضہ دلوا دیا۔ کل جب ان کا اطالوی آرکی ٹیکٹ مکان کا نقشہ لے کر میرے پاس آیا تو میرا دل چاہا دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ (دلہن بھابھی کی چھوٹی بہن نینی تال کانونٹ میں پڑھ رہی ہے۔) عنقریب بھیا صاحب اور دلہن بھابھی برازیل جانے والے ہیں۔ کوٹھی غیر ملکیوں کو پندرہ سو روپے ماہوار کرائے پر اٹھا دی جائے گی۔ بابا اور

امی اس کاٹج میں رہیں گے جو بھیا صاحب نے احاطے میں بنوائی ہے۔ بابا سارا دن اخبار پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ امی کسی سے ملتی جلتی نہیں حالانکہ کراچی میں لکھنؤ کے بہت سے خاندان براجرہے ہیں۔ بابا اورامی کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ غم سے پھٹتا ہے۔

اب میں پھر جذباتی ہورہا ہوں۔ لہٰذا خدا حافظ

تمہارا
کمن

مزید پی۔ایس:
پچھلے ہفتے گورنمنٹ ہاؤس کے ایک ڈنر میں روشن آراء سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاصی موٹی ہوگئی ہے۔ اس کے شوہر کو میں نے نہیں دیکھا، وہ کسی مشن پر امریکہ گیا ہوا ہے۔ روشن نے تم لوگوں میں سے کسی کی بھی خیریت نہیں پوچھی۔ مجھ سے دوچار رسمی باتیں کرنے کے بعد دوسرے گروہ میں شامل ہوگئی۔

۹۹

ازمنہ وسطیٰ کا ہندوستان گھاس پھونس جس کی دیواروں سے اگ رہا ہے۔ پرانی دلی کی عمارتیں، اجمیر، خاندیش، بنگال اور مالوہ کی مسجدیں۔ گوڑ کا داخل دروازہ، تانتی پاڑا، فیروز مینار، گن منت مسجد، احمد آباد اور گجرات، چندیری اور

جودھ پور کی مساجد، رانی سپاری کی مسجد، چمپانیز، دھروار، مانڈز کا ہنڈولا محل، باز بہادر کا محل، کالپی کا چوراسی گنبد، جونپور کی اتالا دیوی کی مسجد، دولت آباد کے قلعے، بہمنی بادشاہوں کی عمارتیں، سری نگر کی پگوڈا ایسی چوبی مساجد، چندیری کا بادل محل، بیدار اور گلبرگہ، دکھن، دکھن۔

اتر پردیش میں للت پور تھا اور کالپی اور شکوہ آباد اور بدایوں اور جونپور۔ مغلوں سے پہلے کا ہندوستان۔

اڑیسہ، مدراس، کرناٹک آندھرا پردیش، حیدرآباد کا دلفریب، پرشکوہ، شاندار شہر، اجنتا، ایلورا، نیلگری کے پہاڑ، بنگلور، کیرالا، ٹراونکور، سرل گھوم پھر کر دوبارہ ازمنہ وسطیٰ کی عمارتوں میں پہنچ جاتا۔ ان گنت نام، ان گنت زمانے، وقت کے پیٹرن، وہ، جو یورپ کے قدیم کیتھڈرلوں کی محرابوں کے نیچے گھومتا تھا اب خانہ بدوشوں کی طرح سارے ملک میں چکر لگاتا پھرا۔ ان عمارتوں کے پتھروں پر وہ ہاتھ رکھتا۔ کنول کے پھول، ہاتھی، گندھرو، حوض۔ سیڑھیاں، مینار، طاق، کسی تاریک اجاڑ محراب کے نیچے سے کوئی دیہاتی لڑکی بکریاں چراتی نکل جاتی۔ کوئی لڑکا پیپل کی شاخ پر سے باؤلی میں کود جاتا۔ کوئی فقیر راستہ ٹٹولتا محل کے ایک شکستہ کونے میں بیٹھ کر چلم سلگانے میں مصروف ہو جاتا۔ اوپر ٹوٹے ہوئے گنبدوں اور وسیع صحنوں پر جھکا ہوا نیلا آسمان سنسناتا رہتا۔ بادل کی مغربی گھاٹ سے جھوم کر اٹھتے اور دھروار اور چتوڑ پر چھا جاتے۔ خلیج بنگال سے گھٹائیں بڑھتیں اور راج شاہی اور گوڑ پر پھیل جاتیں ازمنہ وسطیٰ کا اداس، خاموش، اجاڑ ہندوستان بارش میں نہاتا، گھاس کے پودے ہوا میں لہراتے۔

یہ پتھر ماضی اور حال دنوں میں شامل تھے اور اس کے ذہن پر اس طرح برستے تھے کہ اسے لگتا تھا کہ اب اس کا دماغ قطعاً معاؤف ہو جائے گی، وہ بھاگ کر حال میں پناہ لیتا۔

سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرنے کے بعد (وہ کس کا متلاشی تھا؟ اس نے کئی مرتبہ جھنجھلا کر خود سے سوال کیا)، وہ پھر کلکتہ پہنچتا، پھر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کی سرزمین پر اترتا۔ ڈھاکہ کلب کی بار میں متواتر بیئر پیتے رہنے کے بعد پھر سلہٹ جانے والی ٹرین میں بیٹھ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاتا۔

منزِ مقصود بالآخر یہ تھی۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دھچکے سے ٹرین رکی۔ طرح طرح کی آوازیں نیند میں ترتی ہوہی اس تک پہنچیں۔ ڈیم (انڈے) بوائلڈ ڈیم.......... سا (چاء) گرم.......... گرم.......... سا گرم.......... سا گرم۔ ڈیم بوائلڈ۔ اس نے کھڑکی کا پٹ چڑھا کر پھر باہر دیکھا۔ اس منظر میں کس قدر بے پناہ اداسی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا، باہر فضا میں پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو وسیع ہرے ترو تازہ کھیتوں پر سے بہتی ہوئی آئی تھی ایک بوڑھا پھوس ہندو بے شمار گٹھڑیاں اور اسباب اٹھائے جھکا جھکا، تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا، وہ دیر تک بوڑھے کی دیکھا کیا حتیٰ کہ وہ اسٹیشن کے مجمع میں نظروں سے اوجھل ہو گیا افواہ، یہاں کسی قدر آبادی تھی۔ عورتیں جن کے ماتھوں پر بڑی بڑی سرخ بندیاں اور مانگ میں گہرا سرخ سیندور رچا تھا۔ رنگ برنگی سوتی ساریاں پہنے، بچیاں، دھوتیوں کے کنارے سنبھالے

ہندو۔ چارخانہ تہمد باندھے مسلمان جن کی زیادہ تر داڑھیاں تھیں فاقہ کش کالے کالے لڑکے۔ حکام، اینگلو انڈین گارڈ، پالکی بردار (یہاں اب تک پالکیاں چل رہی تھیں)۔ پھر ٹرین چلی، بنگالی آوازیں اندھیرے میں معدوم ہو گئیں۔ ٹرین دوبارہ تالابوں کے کنارے کنارے دوڑنے لگی جن میں کنول کے پھول کھلے تھے۔ کسی پھولوں کی بیل سے ڈھکے جھونپڑے کے دروازے پر کوئی عورت اودی ساری پہنے کھڑی نظر آ جاتی۔ چند عورتیں گھونگھٹ نکالے بانسوں کے جھنڈ کے نیچے نیچے چل رہی تھیں۔ ان کے نام کیا ہوں گے؟ آمنہ، سکینہ، ریبا، رادھا۔ ان کی زندگیوں کی کہانیاں کیا ہوں گی بھلا! ان کا نظریہ کائنات، ان کا فلسفہ!! زندہ رہنے سے مر جانے تک کی داستان: تکالیف، افلاس، قحط، قحط، قحط۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اللہ کو پٹر دے۔ پانی دے بھات دے دے..........

اللہ بھات دے.......... اس کے کانوں میں اس کورس کے الفاظ گونجے جو اس نے کئی بار ڈھاکہ کی محفلوں میں طالب علموں سے سنا تھا۔ اللہ بھات دے.......... اللہ بھات دے، یہ یہاں کا قومی ترانہ ہونا چاہیے، اس نے سوچا اور بنگال کے متعلق اس نے ہمیشہ سے کتنے رومانی تصورات باندھ رکھے تھے۔ شنیلا دیبی نے اسے ٹیگور پر کیا کیا لیکچر پلائے تھے اور ساری کتابیں جو اس نے پڑھی تھیں: ڈی۔ سی۔ سین اور جسیم الدین اور لیلا رائے۔ لوک گیت جمع کرنے والوں کی ٹولیاں، ادبی کانفرنسیں، کلکتہ کے تھیٹر اور تہذیبی سرگرمیوں اور یونیورسٹی لائبریری اور اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا پس منظر اور کمپنی کے زمانے کی بنی

ہوئی کوٹھیاں، کلائیو روڈ جو اب سبھاش چندر بوس روڈ تھی اور علی پور اور دھرم تلہ، مگر وہ سرحد عبور کر چکا تھا۔ کلکتہ اور اس کی طلسماتی فضائیں دوسری طرف رہ گئیں۔ ٹرین ایک اور اسٹیشن پر رکی۔ اللہ بھات دے۔ بھات دے۔ بھات دے...... بھات دے۔

چندر پور بنیں گٹھڑیاں اور بچے اٹھائے دھکا پیل میں لڑھکتی پڑھکتی تھرڈ کلاس کے ڈبوں کے طرف بڑھ گئیں۔ اس کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ڈائننگ کار کے بیرے کا سفید براق صافہ اندر داخل ہوا۔

''ڈنر صاحب؟''

''ہاں۔''

اس نے کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا اور دوبارہ آرام سے لیٹ گیا۔

سلہٹ میں چاء کے باغات میں سینکڑوں پوربی مزدور کام کرتے تھے۔ رام دائی، رام اوتار، لچھمن اور سیتا۔ ترلوچن اور چنبیلیا۔ پوربیوں کے یہاں یہ دو نام مقبول تھے: رام اور سیتا۔ ہند کا عہد عتیق زریں زمانہ، پاٹلی پتر، اندر پرستھ، ایودھیا، للکشن وتی، ڈگ وجے رام چندر اور متھلا کی جنک کماری سیتا۔ ارے واہ رے تاریخ دانو۔

''ڈنر صاحب.......... کافی لاؤں..........'' بیرے نے ٹرے لا کر سامنے رکھ دی اور سرگوشی کے لہجے میں اس طرح سے مخاطب کیا گویا وہ دیوتا تھا۔

وہ پھر ہال میں واپس آ گیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے ابھی سری منگل پہنچنا ہے اور رنگاماٹی اور بندربن۔ اسے مزید روپیہ کمانا ہے۔

دوسرے روز ٹرین سلہٹ پہنچی۔ اسٹیشن پر اس کا منیجر پیٹر جیکسن حسب معمول

کار لیے اس کے استقبال کو موجود تھا، وہ شہر سے نکل کر سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔

سر ماندی کے کنارے پہنچ کر اس نے کار روکی۔ اب شام کی تاریکی چھا رہی تھی۔ لالٹین لیے بوڑھے اور عورتیں کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے۔ یا اتر رہے تھے۔ بوٹ گھڑ گھڑ کرتی دوسرے کنارے سے لوٹ آئی تھی۔ ساحل پر شکستہ لاریوں میں لوگ مرغیوں کی طرح ٹھنسے بیٹھے تھے۔ ایک اندھا فقیر قرآن کی آیتیں پڑھ کر بھیک مانگ رہا تھا، اندھیرے میں اس کی آواز بڑی ہولناک لگی۔ دو اندھے ایک نوکے میں جا بیٹھے تھے، ایک اندھی عورت درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔

یہاں کتنے اندھے تھے۔ کتنے بے شمار اندھے۔

بوٹ سے تختے جوڑ کر اس کی کار کشتی پر چڑھائی گئی۔ کشتی مسافروں سے لد گئی۔

''بڑا گندا مجمع ہے، چلو ہم لوگ نوکے میں چلے چلیں۔'' پیٹر نے کہا اس نے مزاحمت نہیں کی، وہ تو خودکشی کی طرح سطح پر بہے جا رہا تھا۔

وہ دونوں کود کر ایک نوکے میں سوار ہو گئے۔ نوکا بوٹ کے پیچھے چلنے لگا۔ ساحل دور رہ گیا جس پر مٹی کے تیل کے چراغ ٹمٹما رہے تھے اور جس کے عقب میں جھونپڑوں پر پان کی بیلیں چڑھی تھیں۔ ایک چاء خانے کے آگے لوگ لالٹین کے سامنے جھکے اخبار پڑھ رہے تھے۔ دریا پر کشتیاں چل رہی تھیں۔ افق پر سپاری کے درخت ہوا میں جھومتے تھے۔ کس قدر سکون تھا، امٹ سکون۔

دفعتاً زور کی ہوا چلی۔ نوکا ہچکولے کھانے لگا۔

بہت بوڑھا مانجھی اپنا زور لگا کر نوکا کھیتا رہا اور پھر گانے میں مصروف ہو گیا۔

اور اس نے دیکھا کہ اس کے بوڑھے ملاح کا نوکا لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں طوفان لرز رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہیب ناکے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر اس فاقہ زدہ ملاح کی کشتی بڑے مزے میں عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالٹین اٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ''پیٹر ہم طوفان میں تو نہیں پھنس گئے؟'' اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

''نہیں یہ تو معمولی سی ہوا ہے۔ پریشان مت ہو۔'' پیٹر نے جواب دیا۔ ''مگر ذرا اس کالے سوڑ سے کہو کہ اپنا بھونڈا اگانا الاپنے کے بجائے چپوار کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔''

''بے چارہ بوڑھا۔'' سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور رجھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ چپوار چلانے میں مصروف رہا۔

''یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ چستی ان میں نام کو نہیں۔'' پیٹر نے کہا۔

سرل نے چھت پر جھکے جھکے آواز دی: ''او آدمی............ کیا نام ہے تمہارا؟''

''ابوالمونشور............ صاحب۔''

''ابوالمونشور.........''سرل نے دہرایا۔

''جب صاحب.........''وہ پھر پتیوار پر جھک گیا۔نوکا اب سرعت سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔کنارے پر دونوں طرف اناس اور کیلے کے جھنڈ تھے اور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔سرل نے نوکے کے اندر جھانکا جہاں ابوالمونشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جانماز اور دو کانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آویزاں تھا، یہ اس بوڑھے پھونس سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو دریا کے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی۔دفعتاً سرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے، یہ صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھایا ہے۔اس عجیب و غریب، حسین ملک میں جسے مشرقی بنگال کہتے ہیں، جسے مشرقی پاکستان کہتے ہیں۔

لالٹین اٹھا کر اس نے دوبارہ چاروں اور نظر ڈالی۔روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔برابر سے ایک شمپان گزر گیا۔چاند بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ انتہائی کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

۱۰۰

یہاں گنگھور گھٹائیں امنڈ کر آتی ہیں۔پر بارش نہیں ہوتی۔

یہاں بیٹا باپ کی، بی بی شوہر کی عزت نہیں کرتی۔

لوگ سبھاؤں میں جمع نہیں ہوتے۔

خوبصورت باغ اور عبادت خانے تعمیر نہیں کیے جاتے۔

یہاں امیروں کی دولت محفوظ ہے لیکن چرواہے اور کسان دروازوں کی چٹخنی چڑھا کر سوتے ہیں۔

بغیر پانی کی ندی۔ بغیر گھاس کا جنگل۔ بغیر چرواہے کا گلہ۔

پڑھتے پڑھتے کمال نے رامائن بند کر دی۔

''یہ کہاں کا ذکر ہے۔'' سرل نے پوچھا۔

''کہیں کا بھی نہیں۔ میں تو رامائن دیکھ رہا تھا۔ یہاں الماری میں پڑی مل گئی۔ مدتوں پرانی۔ اس پر ۱۹۶۷ء کی تاریخ پڑی ہے۔'' وہ اداسی سے کتاب کے سرورق پر لکھے ہوئے نام کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جس کی سیاہی دھندلی ہو چکی تھی۔

''تم تو اس عقیدت سے پڑھ رہے ہو گویا تلسی داس جی کمیونسٹ تھے۔'' سرل نے کہا۔

''ہاں۔ بھگت ویاس بھی پارٹی ممبر تھے۔'' کمال نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''انہوں نے لکھا ہے مہا بھارت میں کہ اگر بادشاہ ظالم ہو تو اس کے خلاف بغاوت کرو۔ ایسا بادشاہ بادشاہ نہیں۔ اسے پاگل کتے کی موت مارنا چاہئے۔''

''واہ پنڈت جی۔'' سرل نے ہنس کر کہا۔ ''کیا بات ہے، مگر یہ بتا دوں کہ اب تم یہ رامائن مہا بھارت بھول جاؤ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔''

''ہاں۔ یہ میں نے بڑی بے وقت کی راگنی چھیڑ دی۔'' کمال نے کہا۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ گزرے ہوئے برس بیئر کے گلاسوں میں بلبلوں کی طرح تیرا کیے۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ سرل چپ چاپ بیٹھا نیلی پہاڑیوں کو دیکھتا رہا جن کے اس پار برما تھا۔

"کیوں بھائی، کیا سوچتے ہو؟" کمال نے اسی الم سے پوچھا۔

"کچھ نہیں............ سوچ رہا تھا کہ برما اگر یہاں سے پاؤں پاؤں جایا جائے تو کتنی دور ہوگا۔"

"بس............ یہی سوچ رہے تھے؟"

ایک آوارہ فاقہ زدہ کتا نیچے سے کود کر برآمدے میں آ گیا۔

"دیکھو یہ بھی برما سے آ رہا ہے۔"

"یا برما جانا چاہتا ہے۔" کمال نے کمینے پن سے کہا۔

کتا دم ہلاتا رہا۔

"ہلو...... ہلو...... لو بسکٹ کھاؤ۔" سرل نے کتے کی خاطر کی۔

"یار، یہ تو ریڈ چائنا سے بھاگ کر آیا ہے۔" کمال نے اسے غور سے دیکھ کر بڑی متانت سے کہا۔ "اینٹی کمیونسٹ کتا ہے۔ آزادی کی تلاش میں یہاں پہنچا ہے۔"

سرل نے منہ لٹکا کر کمال کو دیکھا۔ "تم اب بھی کالج کے زمانے کی سی باتیں کرتے ہو۔"

"اب بھی...... کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔"

میز پر چاء کا سامان رکھا تھا۔ کمال نے ایک سینڈوچ کتے کے سامنے پھینکا اور

بولا: "نہیں سرل...... میں اب مشرف بہ اسلام ہو چکا ہوں۔ دیکھو میرا پاسپورٹ۔" اس نے جیب سے سبز رنگ کا نیا نویلا پاسپورٹ نکالا۔

"ریلے برادرز میں تو میں تم کو اس سے اچھی نوکری دلوا دیتا۔" سرل نے کہا۔

"کیا کرنا فلی مل کی پلاننگ کرنے ائے ہو تم؟ یہاں اکثر لوگ اس سلسلے میں آتے ہیں۔"

"میں جھک مارنے آیا ہوں۔ تم سے مطلب؟ تم بنگالی مزدوروں کا خون چوسنے کے لیے نہیں آن موجود ہوئے۔ سوپ بولے تو بولے چھلنی بھی بولی جس میں باون چھید۔ میں تو ہوں ہی زمانے بھر کا نمبر ایک کا بھگوڑا رجعت پسند۔"

اب اس پر پھر اپنے ضمیر کا دورہ پڑنے والا ہے۔ سرل نے بڑے دکھ سے دوسری طرف منہ کر لیا۔

سرل ہاورڈ ایشلے ندیوں، پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں میں سے گزرتا کل صبح ہی یہاں پہنچا تھا، وہ سری منگل سے کاروبار کے سلسلے میں چاٹگام آیا تھا جہاں سے اس کی چاء ایکسپورٹ کی جاتی تھی۔

چاٹگام میں پھر دل کی وحشت نے زور باندھا اور پیٹر پر کام کی دیکھ بھال چھوڑ کر اس نے پہاڑیوں کا رخ کیا، وہ دو ہزاری اور بندربن اور چندر گونا کے جنگلوں میں مارا مارا پھرا وار رانگا ماٹی کے ڈاک خانے سے اپنے بھائی کو اس نے فرمانبرداری سے اپنی خیریت کا خط بھی بھیجا جس میں آسام اور سلہٹ اور چاٹگام کے علاقوں کی خوبصورتی پر اس نے روشنی ڈالی اور لکھا کہ امید ہے کہ اگلی کرسمس وہ اس کے ساتھ سلہٹ میں منائیں گے۔

یہ خبر سن کر سرل نے روزمیری کو طلاق دے دی (اس کی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی)۔ اس کے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ ان کو محسوس ہوا تھا کہ بوہیمیا سے نکل کر ان کا چھوٹا بھائی بالآخر اپنی دنیا کو واپس لوٹ آئے گا۔ لارڈ موصوف نے کلکتے سے اپنا کاروبار سمیٹ کر اب بڑے پیانے پر مشرقی پاکستان میں روپیہ لگایا تھا جہاں ان کے چاء کے باغات بھی تھے۔ سرل، جواب کیمبرج سے نکلنے کے بعد روزگار کی تلاش میں لندن میں مارا مارا پھر رہا تھا، اسے ایک روز انہوں نے اپنے کلب میں بلایا اور بغیر تمہید اس سے کہا:

''میں تم کو پاکستان بھیج رہا ہوں۔''

''بہت اچھا۔'' سرل نے اسی انداز میں جواب دیا۔ اب زندگی میں مزید جھگڑا کرنے کی گنجائش کہاں تھی!

پچھلے چھ مہینے سے وہ پاکستان میں تھا۔ اسے لندن چھوڑنے کا زیادہ رنج نہیں ہوا۔ گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال، مائیکل، سریکھا، سب لوگ پہلے ہی انگلستان کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے شیلا دیبی کو فون کیا اور طاعت کو بھی مگر طاعت گھر پر موجود نہ تھی۔

اب وہ سری منگل میں ایک بے حد خوبصورت بنگلے میں رہتا تھا۔ کام سے فرصت ملتے ہی ہندوستان کا چکر لگا آتا تھا۔ دارجلنگ، شیلانگ، کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد دکن، عمارتیں، کھنڈر، مکانات اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتے۔

کل شام جب وہ ایک پگوڈا کے باغ میں گھنٹہ بھر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد سرکٹ ہاؤس واپس پہنچا تو ایک نوجوان کی پشت پر اس کی نظر پڑی جو پچھلے

برآمدے کی ریلنگ پر جھکا نیچے کرنافلی ندی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے قدموں کے آہٹ پر اس نوجوان نے پلٹ کر سرل کو دیکھا۔

یہ نوجوان کمال رضا تھا۔

کمال نے اسے اپنی داستان سنائی اور اسے مطلع کیا کہ وہ ایک لیبارٹری قائم کرنے کراچی سے ادھر آیا ہے اور سارے صوبے کا دورہ کرتا پھر رہا ہے۔

اب وہ صبح سے برآمدے میں بیٹھے تھے اور زندگی کا غم ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے ڈال رہا تھا۔

شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ملازمین نے سرکٹ ہاؤس میں لیمپ روشن کر دیئے۔

چند روز قبل کھیدا ختم ہوا تھا۔ برابر کے کمروں میں ہاتھیوں کا ٹھیکے دار ایک اینگلو انڈین مع اپنے اینگلو انڈین عملے کے ٹھہرا ہوا تھا جو شراب پینے کے بعد بے حد فلسفیانہ باتیں کرتا۔

رات کو نوجوان خوش مزاج افسروں کی ایک ٹولی شور مچاتی ہوئی آئی۔ ان میں سے دو ایک لڑکے علی گڑھ کے تھے۔ کمال کی ان سے علیک سلیک ہوئی۔ کھانے کی میز پر وہ بنگال کے مسئلے کا تذکرہ کرنے لگے۔

''بہت سے لوگ تو بس نام کے مسلمان ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''اچھا! میرا تو خیال تھا کہ اسلام کا یہاں بڑا زور ہے جتنا سارے برصغیر میں نہیں ہے۔ مثلاً اتنے نمازی اور اتنے سخت پردہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔'' کمال نے کہا۔

''..........سارا روپیہ یہاں کلکتے کی کمیونسٹ پارٹی سے آتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''بنگال کا مسئلہ ہے.........نازک..........''

کمال چپ چاپ بیٹھا ان سب کو دیکھتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ سرل اور کمال پھر پچھلے برآمدے میں آ بیٹھے جس پر نارنجی پھولوں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ سارے میں خاموشی چھا گئی۔ ندی جہاں مڑتی تھی وہاں پہاڑی پر پاور ہاؤس تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کی گھڑ گھڑاہٹ بڑی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے قریب بانس کا سینما ہاؤس تھا جس میں سے ''بیجو باورا'' کے گانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لتا کی آواز ندی کی سطح پر تیرتی ہوئی سرکٹ ہاؤس تک آ رہی تھی۔ کمال جنگلے پر سر رکھے اس آواز کو سنتا رہا۔ لتا کی آواز ایک ایسا مضبوط پل ہے جس نے دو دشمن ملکوں کو ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے، اس نے سوچا۔

''تم نے لتا کو سنا ہے؟'' اس نے بآوازِ بلند سرل کو مخاطب کیا۔

''وہ کون ہے؟'' سرل نے چونک کر کہا۔

کمال بوریت کے دریا میں غوطہ زن رہا۔

خانساماں کافی کی کشتی لے کر نمودار ہوا۔

کمال کی اس خانساماں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ کئی بار ان دونوں کا مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات ہو چکا تھا۔

''کہیے خانساماں جی، کیا حال چال ہے؟'' کمال نے کہا۔

''مہربانی ہے حضور۔ آپ لوگوں کے آنے سے رونق لگی رہتی ہے ورنہ اس جنگل بیابان میں کیا رکھا ہے۔''

''تم بڑی صاف اردو بولتے ہو۔ ڈھکیا ہو کیا؟''

''جی نہیں سرکار، ہم تو کلکتیہ ہیں۔''

''اچھا۔ ہم بھی تھوڑے سے کلکتیہ تھے ایک زمانے میں۔''

''جی حضور۔''

کمال نے ایک اور جمائی لی۔ خانساماں جھک کر کافی بنانے لگا۔ سرل حسب معمول آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

گورنر جنرل اور ان کی پارٹی کھیدا کے بعد بندربن سے لوٹ کر کراچی واپس جا چکی تھی۔ ان کی آمد کے لیے باشا کا سرکٹ ہاؤس خاص طور پر آراستہ کروایا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی شان وشوکت دیکھ کر خانساماں کو سر فریڈرک کا زمانہ یاد آ گیا جو بنگال کے گورنر تھے اور جب شکار کے لیے آتے تھے تو اسی طرح جنگل میں منگل لگ جاتا تھا اور خوب بخشیش ملتی تھی۔

''پچھلے دنوں تو یہاں بڑی چہل پہل رہی ہوگی۔'' کمال نے کہا۔

''جی حضور۔ آپ کو اس زمانے میں آنا چاہیے۔ دور دور سے صاحب لوگ آیا تھا۔ اب خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑے لاٹ صاحب انگریز کے بجائے مسلمان ہیں مگر شان میں انگریزوں سے کم نہیں۔ اسی پر تو غیر لوگ جلتے ہیں۔ اسلام کی شان دیکھ کر حاسدوں کے آگ لگتی ہے۔''

''کون جلتے ہیں؟'' کمال نے پوچھا۔

''ارے صاحب'' اس نے چاروں طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ''یہاں بڑا بڑا مفسد پڑا ہوا ہے۔''

''یہاں کہاں؟'' کمال کو اس کے رازدرانہ لہجے سے ایسا لگا جیسے ان گھنے جنگلوں میں بڑے جید کمیونسٹوں کی کمین گاہیں ہیں۔ ابھی ان کے گوریلا دستے اندھیرے سے نکل کر سرکٹ ہاؤس پر دھاوا بول دیں گے اور وہ بے چارا اپنا فرض منصبی انجام دیتا ہوا شہید ہو جائے گا۔

سرل کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ خانساماں نے کافی کے برتن اٹھا لیے، پھر خاموشی چھا گئی، کچھ دیر بعد ایک امریکن ڈرائنگ روم میں سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا بے تکلفی سے آن کے کمال کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہاؤ ڈی...'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''ار.......... ہاؤ ڈو یو ڈو......'' کمال نے ہاتھ ملایا۔

''میں جان ٹائی ٹس ایبل جونیئر ہوں۔ مجھے جونی کہو۔''

''ہلو جونی۔ یہاں کیسے آنا ہوا؟'' پھر دفعتاً کمال کو خیال آیا کہ یہ کیسا غیر ضروری سوال تھا۔

''میں چکمہ قبائل کے متعلق ایک ڈوکومنٹری فلم بنا رہا ہوں۔''

''او......... ہاؤ اکسائیٹنگ!'' کمال اور ٹانگیں پھیلا کر آرام کرسی پر لیٹ رہا۔ ''سگریٹ؟''

''تھینکس۔''

دوسرے لمحے جونی بھی فضا کے اس سحر میں کھو گیا، وہ جنگلے پر بازو رکھ کر ندی کو دیکھتا رہا۔ جونی کی بش شرٹ پر جو اخبار چھپے تھے کمال آنکھیں کھول کر برآمدے کے مدھم اجالے میں ان کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر اس سے بھی اکتا گیا۔ دریا پر مکمل سکوت کے ساتھ کشتیاں گزر رہی تھی۔ کبھی کسی ملاح کے گانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ان کشتیوں مں چراغ جل رہے تھے۔ اب گھپ اندھیرا سامنے وادی پر چھا گیا تھا۔

پھر جونی نے بڑے دوستانہ اور بھولے انداز میں کمال سے باتیں شروع کر دیں۔ کمال ہوں ہاں کرتا رہا۔ سرل نے ڈریسنگ گاؤن پہن کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا اور کمال کو امریکن کے ساتھ سر کھپاتا دیکھ کر چپکے سے غسل خانے کے راستے باہر نکل کر پہلو کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بھی دریا بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا اور کشتیوں کی روشنیاں لرز رہی تھیں۔ اندھیارا چکر کاٹتا سارے میں چھایا جا رہا تھا۔ برآمدے میں جونی اپنی یکساں آواز میں کمال کو بتا رہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ قبل ہی مشرقی پاکستان آیا ہے لیکن انڈر ڈیولپڈ ممالک کا اسے خاصہ تجربہ ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ ویت نام میں رہ چکا ہے۔ اس کی بیوی نیویارک میں پریس فوٹو گرافر ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ اس نے جیب سے اپنے بیوی بچوں کی تصویر نکال کر دکھائی اور دیر تک اپنے چھوٹے بچے کا تذکرہ کرتا رہا۔ جو دو سال کا تھا، پھر اس نے ایشیا میں کمیونزم کے خطرے پر روشنی ڈالی اور کمال کو بتایا کہ مسلم ممالک اپنی مذہبی اور روحانی طاقت کے ذریعے کمیونزم کے خلاف جہاد میں امریکہ کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔

''اب تو کافی پی لو۔'' کمال نے جمائی لے کر کہا۔

''نہیں۔ اب میں کھانا کھاؤں گا۔'' اس نے مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات پر گفتگو شروع کی۔ کمال کو بڑا تعجب ہوا کہ مشرقی پاکستان کے متعلق ساری تفصیلات، اعدوشمار، ہر چیز اسے نوکِ زبان تھی اور اسے یہاں آئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔

اتنے میں دو اور امریکن رنگین بش شرٹ پہنے ڈرائنگ روم عبور کرتے ہوئے برآمد میں آگئے۔ ایک دفعہ پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت اخلاق کی باتیں کی گئیں۔ یہ دونوں یو۔ایس۔آئی۔ایس ڈھاکے کے افراد تے اور اسی جونی کے ہمراہ رانگامائی آئے تھے۔ لوکیشن ڈھونڈنے کے لیے وہ سارا دن چکمہ گاؤں میں گھومتے پھرے تھے۔ ان کے پاؤں گرد آلود تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔ بچوں کے ایسے جوش وخروش سے وہ کمال کو اپنے ایڈونچرز سناتے رہے۔

''تم کو معلوم ہے۔ ریڈ چائنا یہاں سے کس قدر قریب ہے............ ان پہاڑیوں سے ذرا ہی آگے بڑھ کر............'' جونی نے ایک اور انکشاف کیا۔

سرکٹ ہاؤس کے خدمت گار نے آن کر اطلاع دی کہ غسل کے لیے پانی لگا دیا گیا ہے، وہ سب اسی طرح باتیں کرتے اٹھ کر اندر چلے گئے۔

سرل نے منڈیا نکال کر پھر کھڑکی میں سے جھانکا۔

''گئے تمہارے یار دوست۔''

''آجاؤ۔ اب میدان صاف ہے۔'' کمال نے جواب دیا۔

سرل باہر آکر اپنی آرام کرسی پر لیٹ گیا، وہ دونوں پھر اپنے اپنے مراقبے

میں ڈوب گئے۔ کمال اور سرل پانچ چھ دن وہاں رہے۔

سرکٹ ہاؤس کے نیچے کرنافلی رواں تھی جس پر لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے بہا کر چندر گونا کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر اینگلو انڈین ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ تھا۔ اس کی آرٹسٹ لڑکی جین سفید ساری پہنے پہاڑیوں پر بیٹھی خاموشی سے تصویریں بناتی نظر آتی۔ بل کھاتے راستوں پر منگول شکلوں والے پہاڑی بوجھ پیٹھ پر لادے گزرا کرتے۔ سرکاری جیپ گاڑیاں زن سے نکل جاتیں۔ صبح شام مندروں میں گھنٹے بجتے۔ ہاٹ میں وادی سے آئی ہوئی چیزیں بکتیں۔ رنگ برنگے سوتی کپڑے، مونگے اور فیروزے کے ہار، چاندی کے زیور۔ لمبے لمبے پائپ پیتی ہوئی ہنس مکھ پہاڑی عورتیں دکانیں لیے بیٹھی رہتیں۔ ہندو، مسلمان، بدھ۔ سب سکون اور قناعت سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اناس کے کھیتوں میں کٹائی کر رہے تھے۔ چاول اگا رہے تھے۔ عمیق خطرناک جنگلوں سے بانس کاٹ کاٹ کر نیچے لا رہے تھے۔ اکثر کسی انتہائی ویران اور غیر آباد جنگل کی اونچی پگڈنڈی پر کمال کو ایک بوڑھا تہمد باندھے، سر پر بانسوں کا بھاری گٹھا اٹھائے اپنا راستہ طے کرتا دکھلائی دے جاتا۔ اس گٹھے کو بیچ کر وہ چند آنے کمائے گا۔ صدیوں سے وہ یہی کرتا آ رہا تھا۔ آج بھی اس کی حالت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ جنگلوں میں چکمہ اور ماگھ اور مونگ قبیلے اپنے بانس کے جھونپڑوں میں زندہ تھے۔ بیسیوں میل کا فاصلہ طے کر کے ہاٹ کے لیے رانگامائی آتے تھے۔ یہاں سڑکیں نہیں تھیں۔ یا ریل گاڑیاں یا ہوائی جہاز کی سروس۔ یہ حسین ترین، پرامن علاقہ، وحشیوں کا ملک، کہلاتا تھا۔ یہ جگہ اینتھروپولوجسٹ

کے لیے جنت ہے، جونی کہتا اور ان کو اپنے ساتھ لوکیشن پر گھسیٹ کر لے جاتا۔ یا دونوں خود ہی جیپ پر بیٹھ کر سا گوان کے جھرمٹوں میں گھس جاتے اور پرندوں کی چہکار سنتے پھرتے۔ پہاڑی لڑکیاں سیاہ دھاری دار سیرونگ باندھے، گگریاں اٹھائے ان جنگلوں میں سے گزر جاتیں۔ کسی بھکشو کے نارنجی لباس کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ کرنافلی کے دھارے پر انہوں نے دور دور تک کشتی رانی کی۔ بندربن جا کر موگھ راجہ سے ملے اور اس کا محل دیکھا اور وہ گھنے جنگل جن میں ہاتھی رہتے ہیں۔

''آسام میں اس سال جو سیلاب آیا تو بے شمار ہاتھی ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ ویسے بھی ان جنگلوں کی سرحد کا صحیح تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔'' ایک افسر نے کمال کو بتایا۔

''تو گویا ان پاکستانی ہاتھیوں میں، جن کا کھیدا ہوا، مہاجر ہاتھی بھی شامل تھے؟'' کمال نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

انہوں نے بندربن کے سارے علاقے کی سیر کی۔ انسانوں کو دیکھا۔ کمال ان کی زبان نہ سمجھتا تھا، وہ کمال کی زبان سے ناواقف تھے۔ یہ بھولے، معصوم لوگ جواب تک تقریباً پتھر کے زمانے میں رہ رہے تھے۔

ان جنگلوں میں خوبصورت جانور بھاگے پھر رہے تھے۔ چیتے اور گلدار اور بارہ سنگھے۔

یہ کیسی صاف ستھری، پاکیزہ دنیا تھی۔

ایک روز شام کو وہ رانگاماٹی سے کرنافلی کے اس پار راج باڑی گئے جہاں چکمہ

راجہ رہا تا تھا۔ یہاں گویا ہندوستانی ریاستوں کے دم واپسیں کا بڑا موثر منظر کمال کو دکھلائی دیا۔ باغ میں ایک چھوٹی موٹی توپ رکھی تھی۔ ایک مندر تھا۔ آم کے درختوں پر شام کی اداسی میں کوئلیں چلا رہی تھیں۔ سامنے معمولی سے محل میں مدھم بلب روشن تھے کیونکہ رانگا ماٹی کا پاور ہاؤس بے حد کمزور تھا۔

ہال میں راجہ کے پرکھوں کی قد آدم روغنی تصاویر آویزاں تھیں۔ "ان پرکھوں میں بنگال اور آسام کے مغل گورنر بھی شامل تھے۔" سرل نے فوراً اس علاقے کی ہسٹری کی اس کرم خوردہ کتاب کا حوالہ دیا جو سرکٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں رکھی تھی۔

انگلستان کے پڑھے ہوئے نوجوان راجہ اور اس کی ماں نے سرل اور کمال کا استقبال کیا۔

ڈرائنگ روم میں پیانو کے اوپر سادھنا بوس کی تصویر رکھی تھی۔ کیشپ چندر سین کی تصویر آتش دان پر موجود تھی۔ راج ماتا کیشپ چندر سین کی نواسی اور سادھنا بوس کی بڑی بہن تھیں۔ "کیشپ چندر سین نے جب اپنی کمسن لڑکی کی شادی مہاراجہ کوچ بہار سے کر دی تو برہمو سماج میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔" کمال نے سرل کے گوش گزار کیا۔

"ہاں۔ میں نے ستی دیوی، مہارانی کوچ بہار کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی ہے۔ شنیلا دیبی نے پڑھنے کو دی تھی جب وہ برہمو سماج پر لیکچر دیتی تھیں۔" سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

"آپ پاکستان سے آئے ہیں؟" راج ماتا نے پوچھا۔

کمال ایک لمحے کے لیے ہڑبڑا گیا۔ یہ بھی تو پاکستان ہے، پھر دوسرے لمحے اس نے صورت حال پر غور کیا۔ کیا یہ پاکستان نہیں ہے؟ کسی ملک کا تصور دراصل کیا ہے؟ یہ راج باڑی اب کس ملک میں شامل ہے؟ کیشپ چندر سین اب کدھر کھپتے ہیں؟

رانی صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں جو ایک خوبصورت سی سترہ سالہ لڑکی تھی جس نے ساری عمر دارجلنگ کے کانونٹ اسکول میں گزاری تھی، وہ دونوں فوراً تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے۔ کمال کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

اب راجہ، جو کافی خوش شکل تھا، اوکسفرڈ کے لہجے میں سرل سے کہہ رہا تھا:

''حکومت کرنافلی میں بند باندھ کر سارے صوبے کے کارخانوں کے لیے ہائیڈروالیکٹرک کا ذخیرہ بنانے والی ہے۔ میرے قبیلے کے لوگوں کا علاقہ بھی زیر آب ہوگا۔ ان کو حکومت معاوضے دے کر کہیں اور بسا دے گی۔ یہ میرا مکان مع رانگاماٹی کے غرقاب ہو جائے گا۔''

''تغیر کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔'' کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

''ہاں۔'' راجہ نے کہا۔

راج ماتا کلکتے کی باتیں کرنے لگیں۔ کمال کا ذہن پھر دور دور بھٹک گیا۔ بنگال کے راجوڑوں کا ماحول، بردوان، کوچ بہار، میمن سنگھ۔ یہ اس الف لیلوی سلسلے کی ایک چھوٹی سی گمنام کڑی تھی جو اب ہائیڈروالیکٹرک کے پانی کے ذخیرے میں غرق ہونے والی تھی۔

کمال اور سرل نے کچھ دیر بعد اجازت چاہی۔ راجہ اور راج ماتا دروازے تک

پہنچانے آئے......

''پھر کبھی ضرور تشریف لائے گا۔'' راج ماتا نے کمال سے کہا۔

''ضرور۔خدا حافظ۔''

وہ باہر آ گئے۔راج باڑی کی روشنیاں ٹمٹمایا کیں۔کرنافلی پر کشتیوں کا ٹریف اب کم ہو چلا تھا۔رات بھیگتی جا رہی تھی۔

دوسری صبح وہ رانگا ماٹی کو خیر باد کہہ کر نیچے میدانوں میں اتر آئے۔

چٹا گانگ سے وہ ٹرین میں بیٹھ کر سیتا کنڈ روانہ ہوئے۔

راستے میں نوجوان ٹکٹ چیکر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور ٹکٹ دیکھنے کے بعد دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

تشریف رکھئے۔سگریٹ لیجیئے گا؟ کمال نے کہا۔

اس نے ذرا بھونچکا ہو کر کمال کو دیکھا اور پھر جھجکتے ہوئے سیٹ کے کنارے پر ٹک گیا۔

''آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟'' کمال نے پوچھا۔

''جی ہاں۔سپاری کے اس جھنڈ کے ادھر میرا گاؤں ہے۔'' ٹکٹ چیکر نے جواب دیا۔

کمال کو اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں: اس کو ٹی بی ہو چکی ہے۔اس کی تنخواہ بہت کم ہے اور گھر کا خرچ بہت زیادہ ہے۔پانچ بہنوں کی شادی کرنا ہے، وہ موجودہ وزارت سے مطمئن نہیں، وغیرہ وغیرہ۔اس کی سیاسی معلومات حیرت انگیز تھیں، وہ یونیورسٹی کے کسی جوشیلے طالب علم کی طرح مدلل گفتگو کر رہا تھا حالانکہ وہ

محض ایک مدقوق ٹکٹ چیکر تھا جس کی زندگی چھوٹی لائن کی ٹرین پر سفر کرتے گزرتی تھی۔

''پاکستان بننے سے پہلے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں کوئی مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ بنگالی مسلمان سماجی اور اقتصادی طور پر اس حد تک پس ماندہ تھے۔ آج آپ لوگوں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔'' اس نے کمال سے کہا۔

اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار مدھم ہونا شروع ہوئی۔

''آپ کو پتا ہے'' ٹکٹ چیکر نے کھڑے ہوتے ہوئے معاً کمال کو مخاطب کیا، ''۴۷ء سے آج تک اس لائن پر چیکنگ کرتے مجھے اتنے برس بیت گئے۔ آپ پہلے بڑے افسر ہیں جنہوں نے مجھ سے اخلاق سے بات کی اور مجھے ایک باعزت انسان سمجھا۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

دوسرے لمحے وہ سرعت سے ڈبے کے باہر نکل گیا۔

کمال اور سرل اسٹیشن پر اترے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو تھی۔

''ہم سیتا کے مندر جانا چاہتے ہیں۔'' کمال نے ایک آدمی سے پوچھا۔

''اب اس وقت نہ جائیے۔ پہاڑی کی چوٹی بہت اونچی اور پرخطر ہے۔ لوٹتے لوٹتے رات ہو جائے گی۔'' اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔

''ہم ضرور جائیں گے۔'' سرل نے ضد کی۔

اسٹیشن ماسٹر نے ذرا محظوظ ہو کر اسے غور سے دیکھا۔ دس پندرہ لوگ جھجکتے

ہوئے ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سا خاندان تھا۔ اسٹیشن کا عملہ۔ پولیس کانسٹیبل۔ چاء کے اسٹال والا۔ گاؤں کے باشندے۔ مندروں کے سادھو۔ ان کی اس مکمل پرسکون دنیا میں یہ دوانوکھے اجنبی کہاں سے آن ٹپکے۔

فوراً بستی میں خبر پھیل گئی: دو یاتری آئے ہیں اور ان میں سے ایک انگریز ہے۔ (انگریز بھی یاتری ہی ہوگا ورنہ اس کا دماغ خراب ہوا تھا کہ جان جوکھم میں ڈال کر اتنی دور سیتاجی کی مقدس آگ کے درشن کرنے آتا؟) ایک پالکی لا کر پلیٹ فارم پر رکھی گئی۔ اس کے پردے ہٹا کر ساری کے گھونگھٹ میں سے ایک لڑکی نے بھی ان دونوں اجنبیوں کو حیرت سے دیکھا۔

سرل پالکی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"یہ ہمارے بڑے مولوی صاحب کی بٹیا ہے۔ اپنے سسرال واپس جا رہی ہے۔" کانٹا بدلنے والے نے بتایا۔

کانسٹیبل آگے بڑھا۔ "آیئے آپ کو گاؤں تک پہنا دوں۔" اس نے کہا۔ گاؤں کے راستے میں اس نے بھی سیاسی گفتگو شروع کر دی۔ گرانی۔ مسلم لیگ کی سیاست۔ مصنوعی قحط۔ عوامی لیگ۔ اے۔ کے۔ فضل الحق۔ کمال کا سر چکرا گیا۔ اس صوبے کا بچہ بچہ کتنے زبردست سیاسی شعور کا مالک تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک لڑکا کمال کے پیچھے چلنے لگا، وہ کانسٹیبل سے چٹا گانگ کی علاقائی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"پرفلا کہتا ہے کہ آپ کو کنڈ تک لے جائے گا۔" کانسٹیبل نے کہا۔

"ہلو پرفلا۔" سرل نے اس سے مصافحہ کیا۔

''تمہارا پورا نام کیا ہے؟''

کمال نے اس سے کلکتے کی بنگالی میں پوچھا۔

''پرفلا کمار بسواس۔''

''اسکول میں پڑھتے ہو؟''

''جی نہیں۔کھیتی کرتا ہوں۔''

''یہاں آرام سے رہتے ہو؟''

''آرام سے کیوں نہیں رہوں گا؟'' پرفلا نے حیرت سے پوچھا۔

کمال خاموش ہو گیا۔

بازار کی کچی سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر لوگ جمع تھے۔ سب کی نظریں ان دونوں کی طرف تھیں۔ سفید دیو کی طرح سرل آگے آگے اس ننھے سے بازار میں داخل ہوا۔ کمال ایک چاء خانے کے سامنے رک گیا۔ صاف ستھرے بانس کی ٹٹیوں سے بنے ہوئے چاء خانے میں بلڑ نہیں تھا اور نہ غنڈہ پن کا ماحول اس پر طاری تھا۔ چند آدمی چادریں لپیٹے بنچوں پر بیٹھے بنگالی اخبار پڑھ رہے تھے۔ کونے میں گراموفون بج رہا تھا۔ دیواروں پر بنگالی فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ یہ بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔ ''ہمارے لیے خوب گرم چاء بنانا۔ ہم ابھی پہاڑی پر سے واپس آتے ہیں۔'' کمال نے چاء خانے کے مالک سے کہا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے کیلے اور پھل لے کر خاطر کے لیے آن موجود ہوئے۔

''آپ یاتری ہیں۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض

ہے۔" ایک داڑھی والے مسلمان نے کہا۔

کمال حیرت سے یہ سب سنتا رہا۔ کیا ان ہی انسانوں نے نواکھالی اور بہار میں ایک دوسرے کو ذبح کیا تھا؟ اس کا سر پھر چکرا گیا۔

پرفلا کی معیت میں انہوں نے پہاڑی کی اور بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں خوبصورت جھونپڑے تھے اور سرسبز کنج۔ جگہ جگہ سرسوتی پوجا کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ گھاس پر اور مکانوں کے سامنے سرسوتی کی بے حد خوبصورت اور سب مورتیاں رکھی تھیں جن کو کمہاروں نے خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کمال ایک مورتی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ "علم کی دیوی۔ ہنس پر سوار ہو کر ستار بجانے والی برہما کی بی بی۔ مادر کائنات۔" اس نے کہا۔ "ہم انسانوں نے تیرا کیا حشر کیا۔"

سرل بھی گھاس پر دوزانو بیٹھ گیا۔ "تمہارے گاؤں کے کمار کس قدر زبردست ماہرِ فن ہیں۔" اس نے مورتی کو بغور دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔" کمال نے فخریہ جواب دیا۔

پھر وہ بانسوں کے جھنڈ میں سے نکل کر پہاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے سرخ پتھر کا تالاب تھا جس کے چاروں اور سرخ مندر تھے اور سنگ سرخ کی چوڑی سیڑھیوں پر برگد کی شاخیں جھکی تھیں۔ چاروں اور ہو کا عالم طاری تھا۔

تالاب کا چکر کاٹ کر وہ ایک اور کنج میں داخل ہوئے۔ یہاں لڑکیاں ننھی ننھی جھیلوں کے کنارے بیٹھی تھیں۔ جھونپڑوں اور مکانوں پر تر گی کے زرد پھولوں میں بیلیں پھیلی تھیں۔ درختوں سے معطر پھول گر رہے تھے۔

"یار یہ تو بالکل کسی ترقی پسند بنگالی فلم کا سیٹ معلوم دے رہا ہے۔" کمال نے

کہا۔

''بنگال کے گاؤں سے زیادہ حسین مناظر اور کہاں ہوں گے۔ بنگالی استادوں کے ناول انہی خطوں کے عکاس تھے۔''سرل نے جواب دیا۔

وہ پہاڑی کی سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ اب ان کے دونوں طرف بے حد گھنے ٹروپیکل جنگل تھے اور عمیق غار اور کھڈ۔ جگہ جگہ سینکڑوں برس پرانے مٹھ درختوں میں چھپے کھڑے تھے۔ بھورے رنگ کے لرزہ خیز ڈراؤنے معبد جن کی مقفل کوٹھریوں میں مہنت دفن تھے۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ عقیدتمندوں کے روپے سے بنائی ہوئی ہزارہا شکستہ سیڑھیاں پیچ در پیچ خطرناک موڑوں سے گزرتی چوٹی تک چلی گئی تھیں جہاں گندھک کے ذخیرے میں ہزاروں برس سے آگ روشن تھی۔

''سیتا مہارانی کو راون نے لنکا سے لا کر یہاں چھوڑ دیا تھا۔''پرفلا نے بڑے تیقن اور عقیدت کے ساتھ میٹر آف فیکٹ انداز میں اس طرح مطلع کیا گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔

چند سادھو نشیب میں مندروں کے ایک جھنڈ کی طرف جاتے دکھلائی دیے۔ سرل اوپر پہنچ کر ایک درخت سے ٹک گیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ شکستہ سیڑھیوں کے نیچے جھرنا گر رہا تھا۔ شام کے گہرے سناٹے میں پرندوں کی سیٹیاں، پتوں کی سرسراہٹ، پانی کی آواز اور شعلوں کی سنسناہٹ پجاریوں کے منتروں کی مدھم صداؤں میں گھل مل کر بلند ہوتی گئی۔ بہت دور، نشیب کے گاؤں میں روشنیاں اندھی اندھی ٹمٹما رہی تھیں۔ پرفلا اطمینان

سے اچک کر درخت کی شاخ سے لٹک گیا۔ ''صاحب! ذرا دھیان رکھیے گا یہاں اژدھے اور بچھو بہت ہیں۔''

''اچھا۔'' سرل نے کہا، مگر ان دونوں نے بالکل دھیان نہ رکھا اور مزید سیڑھیاں طے کر کے ایک اور مٹھ تک پہنچ گئے۔

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ اس کی کرنیں، جو اب تک پہاڑی کے جنگل پر طرح طرح کے رنگ بکھیر رہی تھیں، تاریکی میں گم ہو گئیں۔ اب واپس چلو، ہمیں دس بجے کی ٹرین پکڑنا ہے۔ کمال نے یاد دلایا۔

انہوں نے پہاڑی سے اترنا شروع کیا۔ آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ان کو ایک گھنٹہ لگ گیا کیونکہ تاریکی بہت گہری تھی اور ان کے پاس ٹارچ تک نہیں تھی۔

گاؤں کے چاء خانے میں ان کا انتظار ہو رہا تھا، وہ اندر جا کر ایک صاف ستھرے بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے چاء اور دو دو پیسے والے بسکٹ رکھے گئے۔ میز بان لوگ ذرا شرمائے شرمائے، سہمے سہمے، مہمانوں سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

''سرل۔''

''ہاں''

''دنیا میں اس چاء خانے سے زیادہ خوبصورت جگہ تم نے کوئی اور دیکھی ہے؟''

''نہیں۔'' سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

پھر وہ باہر نکلے۔ بہت سے لوگ ان کو اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ پرفلا پرانے

دوستوں کی طرح چپ چاپ ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گاؤں کے بچوں نے ان سے بخشیش کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ پرفلا نے بھی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ ایسا لگا جیسے روپے کی پیش کش کر کے کمال نے اس کی دل شکنی کی ہے۔

''میں بھکاریوں کی دنیا کا رہنے والا ہوں۔ اگر کوئی بھیک مسترد کر دے تو مجھے متعجب نہ ہونا چاہیے؟'' کمال نے کہا۔

''ہاں۔'' سرل نے جواب دیا۔

راستے میں ایک جھونپڑی کے برآمدے میں چراغ جل رہا تھا۔ کمال ٹھٹھک گیا۔ دیکھوں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے اندر جھانکا۔ ایک بوڑھا پھونس ہندو سفید براق دھوتی اور چادر لپیٹے مٹی کے دیے کی روشنی میں چند بچوں کو بنگالی قاعدہ پڑھا رہا تھا۔ بچے زمین پر بیٹھے تھے۔ گرد کے لیے انہوں نے ایک بوسیدہ چٹائی بچھا رکھی تھی۔ اجنبیوں کو دیکھ کر بوڑھا گھبرا کر باہر نکل آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم یہ منظر کبھی بھول سکو گے۔'' سرل نے کہا۔

''نہیں'' کمال نے جواب دیا۔

وہ اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین آئی، وہ چٹا گانگ واپس پہنچ گئے۔ جہاں جگمگاتے کلب میں پیٹر جیکسن بار روم میں ان کا منتظر تھا۔

''آپ سیتا کنڈ ہو کر آ رہے ہیں۔'' اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ''غضب خدا کا۔ معلوم ہے وہ پہاڑی، اژدھوں، چیتوں اور خطرناک ترین بچھوؤں کا مسکن ہے، وہاں تو دن کے وقت بھی سمجھ دار آدمی بندوق لیے بغیر نہیں جاتے۔''

''مگر وہاں جو اتنے انسان بستے ہیں وہ؟'' کمال نے اعتراضاً کہا۔

''اجی وہ آئے دن سانپ بچھو کے کاٹے سے مرتے رہتے ہیں اور پھر ان کا کیا ہے، وہ تو ہیں ہی جنگلی، وحشی، بن مانس لوگ۔''

دوسرے دن انہوں نے سلہٹ کا رخ کیا، وہاں سے سرل کمال کو راج شاہی لے جا کر پہاڑ پور کے گپتا عہد کی سنگتراشی کے شاہکار دکھانا چاہتا تھا۔ سارے ملک میں چپے چپے پر جو پرانے مندر، مٹھ، مسجدیں اور درگاہیں بنی تھیں سرل کسی ماہر آرکیالوجسٹ کی طرح ان کے متعلق کمال کو بتاتا رہا۔

''تم کو آرکیالوجی میں کب سے دخل ہو گیا۔'' ایک روز باریسال جاتے ہوئے کمال نے اداسی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔'' سرل نے اسٹیمر کی ریلنگ پر جھک کر سمندر کے ایسے وسیع دریا کی پرشور لہروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا، ''کہ میرے پاس ماضی ہی ایسی چیز ہے جو محفوظ ہے، جسے دوسرے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے، جو وقت کی دسترس سے باہر ہے، میں خود اب ماضی ہوں تمہاری طرح اور ہندو پاکستان کے یہ پرانے کھنڈر ہی میرے دوست ہیں، میں ان کی زبان سمجھتا ہوں۔ اس دیوانے برصغیر میں صرف وہ ہی میرے ہم نوا ہیں۔ مورخین کے متضاد نظریوں کو مسترد کر کے یہ اپنی رام کہانی مجھے الگ سے سنا رہے ہیں۔ میں ان کا واحد، تن تنہا آڈینس ہوں۔ یہ پتھر میرے دوست رہیں گے۔ کمال، خدارا یہ نہ کہنا کہ میں ایک اور مغربی یورپین برطانوی ڈی جنریٹ ڈیکیڈنٹ انٹلکچول بن گیا ہوں۔ مجھے اب ان لیبلوں کی پرواہ نہیں رہی۔ میں اب سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ روم اور بازنطیم میں پناہ کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے کائنات سے جو یہ نیا رشتہ قائم کیا ہے اپنی تلخی

جذبات کے ذریعے اسے توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔''

سلہٹ میں وہ خوبصورت بل کھاتے پہاڑی راستوں پر سے گزرتے ایک روز سرحد تک گئے۔ سامنے لکڑی کا بڑے شہتیر کا پھاٹک تھا جس کے ادھر پاکستانی سپاہی مستعد کھڑا تھا۔ شہتیر کے دوسری طرف چند آسامی کاہلی سے کھڑے پان چبا رہے تھے۔ چند قدم پر آسام کی سرسبز پہاڑیاں تھیں جن پر خوبصورت مکان بنے تھے۔ کمال لکڑی کے شہتیر پر کہنیاں ٹیکے دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

سلہٹ سے اگلے روز انہوں نے سری منگل کا رخ کیا، یہ بہت لمبا سفر تھا ندیاں اور گھنے جنگل اور مولی بازار کا خوبصورت علاقہ عبور کر کے وہ سرل کے مستقر پر پہنچے۔ ایک نیچے سے ٹیلے پر سرل کا بنگلہ تھا جس کی روشنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ اب رات ہو چکی تھی۔

یک لخت کمال نے محسوس کیا کہ اس کا جانا پہچانا سرل کسی پراسرار طریقے سے پل کی پل میں بڑے صاحب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کار روک کر وہ سر اٹھائے سامنے کی اور دیکھتا برساتی کی سیڑھیاں چڑھا۔ اس کے ملازمین کی پلٹن استقبال کے لیے لپک کر آگے بڑھی۔ برآمدے کے نیچے کھڑے ہوئے چند مزدوروں نے جھک جھک کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اس نے آواز دی: ''عبدالرحمٰن، غسل کا پانی لگاؤ۔'' پھر وہ کمال کو ساتھ لیے گیسٹ روم کی طرف بڑھا۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے۔'' اس نے کہا

بنگلہ شیر کی کھالوں اور چیتے اور بارہ سنگھے کے سروں اور بیش قیمت ساگوان کے فرنیچر سے مزین تھا۔ کمال کو محسوس ہوا وہ ۱۹۲۸ء کے ہندوستان میں داخل ہو

گیا ہے اسے گل فشاں شدت سے یاد آئی اور اس کا دوسرا مکان خیابان جو دہرہ دون میں تھا۔ عبدالرحمٰن کو دیکھ کر اسے امیر خان کا خیال آیا۔ سرل نے ڈرائیور کو پکارا تو کمال نے محسوس کیا شاید میاں قدیر لپکے ہوئے آئیں گے۔

جلا وطنی............جلا وطنی............خداوند! تو نے مجھے کیوں جلا وطن ہونے دیا کمال نے آرام کرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ڈرائننگ روم میں بیرے نے کھانا لگانا شروع کیا۔ سارے ملازمین اپنی اپنی جگہوں پر کام میں سرعت سے مصروف ہو گئے۔

بنگالی منشی جی مزدوروں کا حساب کتاب لے کر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ ٹریڈ یونین کا ایک فرد بہت دیر سے سرل کے انتظار میں برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ملازمین کا دستہ سرل کے غسل خانے سے برآمد ہونے کا منتظر تھا: بیرہ، خانساماں، خدمتگار، بوائے، اس کا یوریشین کلرک رالف جوزف برآمدے میں کاغذات لیے کھڑا تھا۔ سرل صاحب کئی دن بعد لوٹے تھے اور بہت سے ضروری کاغذات پر ان کے دستخط درکار تھے۔ کئی چپراسی ادھر ادھر موجود تھے۔ ایک تن تنہا سرل اور اس کے ذاتی عملے میں ان گنت آدمی شامل تھے: مالی اور گراس کٹ اور سائیس اور بہشتی، چوکیدار۔ دریا پر اس کی اپنی موٹر لانچ تھی۔ اس سلطنت کا، جو سری منگل میں دور دور تک پھیلی تھی، سرل اپنے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کی شرکت کے ساتھ مالک تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج میں بودیئر اور رایلیٹ کی کتابیں لیے گھوما کرتا اور کوہ نور میں مائیکل کے ساتھ جا کر آلو کھاتا تھا۔

صبح سات بجے چوکیدار نے بنگلے کے ہال کا دروازہ کھولا۔ دھوپ جھلملیوں میں سے چھن چھن کر اندر آنے لگی تو سرل اپنی مسہری سے اٹھا۔ کمال اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور ڈریسنگ گاؤن پہنے برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ''یادِ صبح وطن دے رہی تھی ہوا............ داغ دل پھول بن بن کر کھلنے لگے............ میری پلکوں پہ بدرِ کمال آ گیا۔'' اس نے زیر لب کہا اور لمبا سانس بھر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جس کی دیواریں مکل ڈے، اتل بوس، ابانی سین، رضا اور حسین کی پینٹنگز سے مزین تھیں۔ کونوں میں تانبے کے مجسمے رکھے تھے۔ الماریوں میں کتابیں چنی تھیں۔ بریکفاسٹ کے بعد وہ سرل کے ساتھ باہر نکلا۔ سرل نے سولا ہیٹ پہنی، وہ دونوں کار میں سوار ہوئے۔ پیٹر جیکسن اور رالف جوزف کی قیادت میں منشیوں اور کارکنوں کا جلوس جیپ گاڑیوں میں پیچھے پیچھے چلا۔ سرل نے کمال کو اپنی فیکٹری دکھائی جہاں چاء کی پتیاں تیار کی جا رہی تھیں۔

دوپہر کو لنچ کے لیے وہ کلب گئے اور چند ساتھی پلانٹرز سے نارائن گنج کی شیئر مارکیٹ کے اس روز کے نرخ پر سرل نے تبادلۂ خیالات کیا۔ اسٹیٹسمین اور امرت بازار پتریکا اور ڈھاکے کے مارننگ نیوز پر نظر ڈالی۔ ابھی کھانے سے قبل بیئر کا دور چل رہا تھا کہ دفعتاً کمال غائب ہو گیا۔

''مسٹر رضا کہاں گئے؟'' برآمدے میں آ کر سرل نے پیٹر سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ ابھی میں نے ان کو نورالاسلام چودھری کے ہمراہ باغوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔''

''نورالاسلام چودھری؟'' سرل خاموش ہو گیا۔

چودھری مزدوروں کا نمائندہ تھا اور رات سرل سے ملنے آیا تھا مگر سرل نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ صبح دفتر میں آئے۔

سرل کار میں بیٹھ کر کمال کو ڈھونڈھنے کے لیے نکلا۔ اپنی ٹی اسٹیٹ میں پہنچ کر وہ خاموش سایہ دار سڑکوں پر چکر لگاتا پھرا مگر کمال کا کہیں پتا نہیں تھا۔ آخر اکتا کر اس نے ایک جگہ کار روک لی اور بے دھیانی سے جھاڑیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ پرندے درختوں میں چہچہا رہے تھے۔ شاخوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ نے چاء کی جھاڑیوں پر طرح طرح کے پیٹرن بنا دیئے تھے۔ چوڑیوں کی جھنکار پر اس نے معاً نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ایک پوربن لڑکی بڑے ماہرانہ انداز میں پتیاں توڑ رہی تھی۔ بڑے صاحب کو دیکھ کر اس نے جلدی سے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ سرل مسکرایا۔ اس نے خیالات کے دھارے میں بہتے بہتے ایک لمحے کے لیے ساحل پر آ کر سوال کیا:

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ہمرا نام؟ چمپا۔''

''چمپا۔'' اس نے طرح دہرایا گویا یہ نام آج پہلی مرتبہ سنا ہے۔ ''چمپا .... اچھا نام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا پھر کار کی طرف لوٹ آیا۔

لڑکی ذرا تعجب سے اسے درختوں کی دھوپ چھاؤں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔ وہ اور اس کی پچھلی نسلیں ہر طرح کے انگریزوں کو دیکھتی آئی تھیں۔ سنکی، بد دماغ، بیہودہ، بے حد دارو پینے والے۔

یہ والا بڑا صاحب سنکی تھا۔

کلب واپس آ کر وہ دھڑام سے ایک آرام کرسی پر گر گیا۔ سامنے دیوار پر ملکہ الزبتھ کی تصویر آویزاں تھی۔ ایک تصویر میں شیر کے شکار کا سین تھا۔ ایک میم سفید ٹوپ پہنے احمقوں کی طرح بندوق سنبھالے ہودے پر بیٹھی تھی۔ برابر میں مہاراجہ کوچ بہار رونق افروز تھے۔ میم کی شکل میں اسے اپنی دادی لیڈی بارن فیلڈ کی جھلک نظر آئی جو پچاس برس قبل اکثر ہندوستان آ کر مہاراجاؤں کے ساتھ ٹائیگر شوٹ سے شغل کیا کرتی تھیں۔ گڈ مارننگ! گرینی۔ آج کی صبح تم کیسی ہو؟ اس نے دل میں کہا اور پھر سوچنے میں مصروف ہو گیا کہ کمال اس وقت کہاں ہو گا۔

شام کو سرل سے کمال کے اعزاز میں ایک مخصوص سے ڈنر کا انتظام کیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

''آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟''

''کہیں نہیں۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔''

''مزدوروں کی بستی گئے تھے؟''

''ہاں''

''میرا یہی خیال تھا۔''

''تم ناراض ہو؟''

''نہیں تو۔ تم بھی اس نظام میں اتنی ہی حد تک شامل ہو جتنا میں۔ ناراضگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''یہاں مزدوروں کو صرف ایک روپیہ چار آنے مزدوری ملتی ہے؟''

''ہاں''

''کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے؟''

''نہیں''

''کوئی کمیونسٹ عناصر؟''

''پتا نہیں''

''بکواس مت کرو، تم کو سب پتا ہے۔''

''کمال کائنات کی ذمے داری کا بوجھ میں نے بھی دنوں اٹھائے رکھا۔ آخر اسے اتار پھینکا تم بھی اس بوجھ سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ پھر اس ہٹ دھرم کا کیا فائدہ۔ اس طرح کیا تم اپنے ضمیر کو تسکین دینا چاہتے ہو کہ تم مجرم نہیں ہو؟ تم بہت بڑے مجرم ہو کمال رضا، مجھ سے کہیں بڑے مجرم۔''

کمال خاموش رہا۔ سرل نے اٹھ کر اس کے لیے وہسکی اور گلاس نکالا۔

''پھر میں تمہارے جیسے ایک نہایت چغد انسان سے ملا، وہ بھی تمہارے ساتھی پلانٹر ہیں شری نہار رنجن داس گپتا۔'' کمال نے کہا۔

''داس گپتا۔ اس سے تم کہاں ملے۔ واپس کلب گئے تھے؟''

''نہیں میں پیدل ایک پگڈنڈی پر سے آ رہا تھا۔ میرا سوٹ بوٹ دیکھ کر انہوں نے لفٹ دینے کے لے کار روک لی، وہ ہی مجھے تمہارے مکان تک چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تمہاری رح کے رئیس ابن رئیس ہیں۔''

سرل نے وہسکی دو گلاسوں مین انڈیلی۔ کمال کہتا رہا، ''میں نے ان سے پوچھا آپ ترک وطن کا ارادہ نہیں رکھتے۔ قہقہہ لگا کر ہنسے فرمایا، آپ بھی حد کرتے

ہیں۔انڈیا گورنمنٹ ہر چیز کو قومی ملکیت بنانے پر تلی ہوئی ہے۔سرمایہ داروں پر دھڑا دھڑ بھاری بھاری انکم ٹیکس لگائے جا رہے ہیں وہ الگ۔میرا دماغ خراب ہوا ہے جو ترک وطن کروں گا؟یہ صاف گوئی قابل تعریف تھی۔''

سرل خاموش رہا۔کچھ دیر بعد اس نے کہا: ''میں تم کو پھر یہی رائے دوں گا، دنیا بھر کی ہر چیز میں ناک ڈبونے کی جو تمہاری عادت ہے اسے خدارا اب چھوڑ دو۔ورنہ آفت میں پھنسوگے۔''

کمال وہسکی کے بلبلوں کو دیکھتا رہا۔

دوسرے روز صبح وہ راج شاہی روانہ ہو گئے۔کئی دن تک اس خوبصورت ضلعے کی وسعتوں میں خاک چھانتے پھرے۔دورافتادہ سنتھال گاؤں میں پہنچے جہاں راستے اتنے خراب تھے کہ کئی بار ان کی جیپ الٹتے الٹتے بچی۔سنتھالوں نے کمال کو اور زیادہ مغموم کر دیا۔

''ان بیچاروں کے لیے تو میں ذہن مس بڑا رومینٹک تصور لیے بیٹھا تھا۔لوک ناچ اور زین العابدین کی مشہور و معروف آبی رنگوں کی تصویر اور جانے کیا کیا۔''

''اور اصلیت میں بوجہ اپنے افلاس یہ درختوں کی جڑیں کھاتے ہیں اور جنگلی جانوروں کی طرح زندہ ہیں۔ہے نا؟''سرل نے جیپ چلاتے چلاتے مڑ کر کہا۔

''میرا ابھی شروع میں قدم قدم پر یونہی دل ٹوٹا تھا۔''

''جونی یہاں نہیں آیا اپنی مووی بنانے کے لیے۔''کمال نے کہا۔

''یہاں بھی آ جائے گا۔''سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔

سنتھالوں سے بھی ان دونوں کا بڑا دوستانہ ہو گیا۔جس روز وہ لوگ واپس

لوٹ رہے تھے ایک گاؤں میں سارے سنتھال ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے ۔ایک سیاہ فام بے حد دلکش لڑکی نے آگے بڑھ کر گیندے کے ہار ان کے گلے میں ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے جھکی ۔ان کا مکھیا، جس کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی، جس سے اس نے لاٹھی باندھ رکھی تھی، ان کے اعزاز میں اپنی اکلوتی تار تار قمیض پہن کر ان کو رخصت کرنے بستی کے موڑ تک آیا۔ ایک نوجوان نے تالاب میں سے سرخ کنول نکال کر سرل کو پیش کیا۔

رات کو وہ راج شاہی کے سرکٹ ہاؤس واپس پہنچے تو ڈرائنگ روم میں چند امریکنوں کی آوازیں آئیں۔

جونی سنتھالوں کے متعلق ایسٹ مین کلر میں ڈاکومنٹری بنانے کے لیے پہنچ چکا تھا۔

سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں گنگا بہتی تھی۔ دوسرے کنارے پر مرشدآباد تھا۔

مرشدآباد؟ سراج الدولہ؟ کرنل کلائیو؟ کیا بے کار کی باتیں ہیں، وہ سنو۔ زن سے گولی چلی ۔کوئی اوراسمگلر مارا گیا، وہ دونوں گھپ اندھیری رات میں گنگا کے کنارے کنارے خاموش سڑک پر ٹہلا کرتے اور آگے بڑھ کر ضلع کے اعلیٰ حکام کی کوٹھیاں تھیں اس کے بعد بازار چھوٹے چھوٹے چوراہے ۔گلیاں ۔اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اداس مکانات۔

''مکان کیسی کیسی کہانیاں سناتے ہیں۔'' سرل نے پھر دہرایا۔

سایہ دار کنجوں میں بڑے بڑے ہندو زمینداروں کی حویلیاں اور کوٹھیاں چھپی ہوئی تھی جن میں سے بیشتر سنسان پڑی تھیں۔

''سنا ہے زمینداری ختم کردی گئی ہے۔'' کمال نے کہا۔

سرل نے اسے پھر دیکھا۔ ''اب تم نے پھر ناک ڈبونا شروع کی۔'' اس نے ڈانٹا۔

وہ اسٹیشن واپس جارہے تھے۔

ڈھاکے واپسی میں پھر ٹرین دریا کے گھاٹ پر رکی۔ مسافر اتر کر اسٹیمر پر سوار ہوئے۔ ٹرین کا تجارتی مال اتار کر اسٹیمر پر چڑھایا گیا۔ یہاں کرین نہیں تھے۔ سینکڑوں قلیوں نے آواں یں لگا لگا کر سامان ڈھونا شروع کیا۔ اس طرح کی صداؤں کو کمال نے IPTA والوں کے ساتھ خود کورس میں گایا تھا اور ترقی پسند فلموں میں اس طرح کے گیت سنے تھے مگر اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سارا مشرقی بنگال ایک نہایت شدید حقیقت پرست، ترقی پسند فلم کے مناظر کا بہت بڑا Sequence ہے۔

جہاز پر داڑھیوں والے چند بوڑھے اور برقعہ پوش عورتیں آ کر تھرڈ کلاس کے فرش پر بیٹھ گئیں، یہ بھی بڑا ترقی پسند فلموں والا منظر تھا۔ بے شمار بوڑھے ہندو اور مسلمان، شالیں اوڑھے، ان کی لڑکیاں اور بہوئیں گود میں بچے اٹھائے گینگ وے پر سے گزرتی سیکنڈ کلاس میں ٹھنس رہی تھیں۔

اب فرسٹ کلاس میں لوگ آ آ کر بیٹھنا شروع ہوئے۔ کیبن میں گئے، ڈیک پر بکھر گئے، دوربینیں اور کیمرے نکالے گئے، اخبار کھولے گئے۔ دو اسمارٹ بیگمات نے نٹنگ شروع کر دی۔ چند امریکن، جو کسی دور افتادہ ضلعے میں یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس کی شاخ کھولنے جارہے تھے، ایک نوجوان طالب علم سے

مصروف گفتگو ہو گئے، جو تعطیلات کے بعد ڈھاکے واپس جا رہا تھا۔ ایک طرف دو بنگالی مولانا عوامی لیگ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ ڈھاکے کا ایک اردو اخبار نویس۔ یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس والوں کی دعوت پر بحیثیت ان کے مہمان ان کا ہم سفر تھا۔ ایک اعلیٰ افسر کیبن میں بیٹھے تھے۔

کمال جہاز کے اس منظر کو دیکھتا رہا۔

یہ کیسا جھمیلا تھا؟ یہ کیسی دنیا تھی جو وجود میں آ گئی تھی؟ یہ گتھی کس نہج پر سلجھے گی؟ اور اس سارے گھپلے میں کتنی لاکھوں جانیں تلف ہوئیں، کتنے گھر لٹے، کتنے لاکھوں انسان خانماں برباد اور جلاوطن ہوئے اور کتنے کروڑوں انسان جو پہلے بھوکے مرتے تھے اب بھی بھوکے مرتے ہیں۔

کمال ریلنگ پر جھک کر افق کو دیکھتا رہا جہاں تک صرف پانی ہی پانی تھا .... عظیم دریا، عظیم **ملک**، عظیم انسان۔ کیا یہ سارے انسان عظیم نہیں جو سلاخوں کے ادھر مرغیوں کی طرح ٹھنسے بیٹھے تھے؟

اردو اخبار نویس ٹہلتے ہوئے کمال کے پاس آئے اور اپنا تعارف کرایا۔

"آپ بھی مغربی پاکستان سے تشریف لائے ہیں؟" انہوں نے پان کی ڈبیا نکالتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی" کمال نے مختصر جواب دیا۔

"کراچی؟"

"جی"

انہوں نے دوبارہ کمال سے ہاتھ ملایا۔ "صاحب ہم تو یہاں یوں سمجھئے کہ

کالے پانی میں پڑے ہیں۔اپنے ہم جنسوں کے لیے بسا اوقات آنکھیں ترس جاتی ہیں (یہ مغربی یو۔پی کے رہنے والے تھے) سچ عرض کرتا ہوں قبلہ، اس خطے کو تو علیحدہ کر دینا ہی مناسب ہے۔بالکل نتھنوں میں دم کر رکھا ہے ہمارا ان لوگوں نے۔"

ایک نوجوان سرل سے باتیں کرتا قریب سے گزرا۔اخبار نویس ایک ذرا کی ذرا رکے۔جب وہ آگے چلا گیا تو بولے: دیکھا آپ نے انگریزی کیا لاجواب بولتے ہیں۔بات کرنے کی تمیز نہیں۔بس آ گئے جوٹ کوٹا میں۔

"جوٹ کوٹا۔" کمال نے حیرت سے دہرایا۔اس نے یہ اصطلاح آج ہی سنی تھی۔

"جی ہاں صاحب۔آپ کا قیام ڈھاکے میں ہے؟ شاہ باغ؟ اچھا کہیں اور ٹھہرے ہیں۔"

اب اعلیٰ افسر بھی کیبن سے باہر نکل آئے۔انہوں نے کمال کو سگریٹ پیش کیا۔دریا کا پانی سورج کی کرنوں میں سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا۔برابر سے ایک جوٹ کی بار برداری کرنے والی سیاہ رنگ کی مہیب کارگو بوٹ بڑی تمکنت سے تیرتی ہوئی نکل گئی کمال مسحور ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

"کس قدر حسین منظر ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"جی ہاں" اعلیٰ افسر نے کہا۔"ان مناظر کی پبلسٹی کرنے کے علاوہ آپ کی مرکزی حکومت کو اور کوئی کام سجھائی نہیں دیتا۔مگر بس دور ہی سے یہ نظارے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔یہاں رہنا پڑے آپ کو تو اصل حقیقت کھلے۔ہم کو

دیکھیے تین سال سے اس وحشی علاقے میں گویا قید تنہائی کی سزا بھگت رہے ہیں۔"

"قید تنہائی؟"

"جی ہاں اور کیا۔ بالکل بیک ورڈ ملک ہے یہ ذرا یہاں کے باشندوں سے آپ کو سابقہ پڑے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ ایک سے ایک کاہل، سازشی، متعصب اور بے ایمان۔ ان پر حکومت کرنا اور ان کو قابو میں رکھنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔"

کمال کو یاد آیا: اٹھارہویں انیسویں صدی کے انگریزی سفرناموں میں اہل بنگالہ اور عموماً سارے نیٹوز کے لیے یہی الفاظ پڑھے تھے۔ اسے لگا گویا وہ اٹھارہویں صدی کے کسی انگریز کلکٹر کی معیت میں سفر کر رہا ہے۔

"یقین فرمایئے" اعلیٰ افسر نے بات جاری رکھی، "جس روز یہ خطہ پاکستان سے علیحدہ ہو گا میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا اور خوشی کے مارے سات روز تک ڈرنک رہوں گا۔ ان کی ہر شے ہم سے مختلف ہے۔ غیر اسلامی زبان بولتے ہیں۔ وزیر اعظم کو پردھان منتری اور امن کو شانتی کہتے ہیں۔ سنسکرت سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا ہے۔"

بیرے نے چاء لاکر میز پر رکھی۔ "جہاج جگن ناتھ گھاٹ کو بے پہنچے۔"

کمال نے اس سے پوچھا: "امرا اونی کھن دھورے جہاجے روئے چھی۔"

اخبار نویس اور اعلیٰ افسر دونوں نے اسے چونک کر دیکھا۔

"معاف کیجیے گا، آپ کے لب و لہجے سے میں سمجھا تھا کہ آپ بھی لکھنؤ کی طرف ہیں۔" اخبار نویس نے کہا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' کمال نے مسکرا کر جواب دیا۔

''جناب کا اسمِ شریف تو اب تک پوچھا ہی نہیں۔''

''سید کمال رضا۔''

''آپ مٹیا برج کے نواب علی رضا بہادر کے خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتے؟''

''جی ہاں۔ انہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔''

''اوہو............ ہو............ ہو............ بڑی خوش قسمتی ہے میری کہ جناب سے ملاقات ہو گئی۔'' اخبار نویس نے تیسری بار کمال سے مصافحہ کیا۔ ''کیا لوگ تھے۔ صاحب کیا خاندان تھا۔ لکھنؤ کی کلچر کی آخری یادگار تھے یہ حضرات کلکتے میں۔ واہ............ واہ............ وہ زمانے ہی خواب خیال ہو گئے۔ سنا ہے نواب عباس رضا بہادر کا بھی انتقال ہو گیا۔''

''جی ہاں۔''

اعلیٰ افسر کی بیگم اور سالی گوگلز لگائے آرام کرسیوں پر دھوپ کے رخ بیٹھی تھی سالی فلم فیئر کے مطالعے میں مشغول تھی۔ سرل مقابل کی ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے سنہرے بال سورج کی کرنوں میں سونے کی طرح جگمگا رہے تھے اور وہ غیر معمولی طور پر حسین نظر آ رہا تھا۔

زینے کے دوسری جانب سیکنڈ کلاس کا عرشہ تھا۔ ایک سیاہ فام اینگلو انڈین لڑکی جالی سے ٹیک لگائے بیٹھی ٹرو اسٹوری میگزین کے مطالعے میں مصروف تھی۔ اس کے قریب فرش پر اس کا بڑا سا دارجلنگ کا بنا ہوا بیگ رکھا تھا جس میں اس کی

ننگ، میک اپ کا سامان اور ایک ٹافی کا ڈبہ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں چند ہالی ووڈ
کے فلمی رسالے اور برطانیہ کا زنانہ رسالہ ووُمن اور ایک رومانی ناول ٹھنسا ہوا تھا۔
ناول کی چمکدار کاغذی سرورق پر ایک سنہرے بالوں والا ہیرو، نائیلون کے نائٹ
گاؤن میں ملبوس، ہیروئن کو گلاب کا پھول پیش کر رہا تھا۔ لڑکی نے کچھ دیر بعد سنہرا
رومانی ناول نکالا۔ سرورق کے ہیرو کے دیکھتے دیکھتے ان کی نظر ہینڈسم انگریز تک
پہنچی جو جالی کے ادھر ریلنگ کے سہارے کھڑا بالکل مارلن برانڈو معلوم دے رہا
تھا۔ لڑکی نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر ناول پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔

اس سانولی سلونی لڑکی کا پورا نام مس مارگریٹ ازابل کرسٹینا ٹیبز ڈیل تھا۔
یوں اس کے بوائے فرینڈ اور دفتر کے ساتھی اسے میگی کہتے تھے۔ گو اس کے اتنے
لمبے چوڑے نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ خاندانی روایت کے مطابق اس کی پردادی
مارگریٹ ازابل، سرسرل ایشلے کی اور ایک نیٹو عورت کی اولاد تھی۔ سرسرل ایشلے
پچھلی صدی کے بنگال کے بہت نامور آدمی تھے قحط کے زمانے میں اس کی ماں
ڈھاکے سے کلکتہ آ کر نواب ایشلے کے حرم میں داخل ہوئی۔ مارگریٹ ازابل نے
بڑے ہوکر کانپور چھاؤنی کے سارجنٹ جارج ٹیبز ڈیل سے شادی کر لی تھی جو اصل
نسل گورا تھا اور بوجہ کثرت شراب نوشی جوانی ہی میں خدا کو پیارا ہوا۔ چنانچہ
مارگریٹ ازابل اپنے بچوں کو لے کر پھر کلکتہ واپس آ گئی اور اس کا خاندان کلکتے
کے نچلے طبقے کی اینگلو انڈین سوسائٹی میں رل مل گیا۔

میگی ٹیبز ڈیل کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے، وہ گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں
ٹیلی فون آپریٹر تھی اور چھٹی لے کر اپنی بیمار خالہ کو دیکھنے آئی ہوئی تھی جو ٹیکسی میں

رہتی تھی اب وہ ٹیکسی سے کلکتے واپس جا رہی تھی۔

وہ ناول کے کلائمیکس تک پہنچی ہی تھی کہ جس میں ہیرو اسپین جا کر ہیروئن کو ایک بدمعاش کاؤنٹ کے چنگل سے چھڑانے والا ہے کہ اسٹیمر کی سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گھاٹ قریب آ رہا تھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کے عرشے پر کھڑا ہوا ہیرو بھی ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ اس کا دل ڈوب سا گیا، اس نے جھک کر اپنی سینڈل کے تسمے باندھے۔ اپنے رنگین پھولدار سکرٹ کی سلوٹیں ٹھیک کیں آئینے میں اپنے بالوں کے کرل سنوارے اور بیگ اور رسالے سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرل اور کمال جہاز سے اتر کر کنارے پہنچے۔ مسافروں اور قلیوں کا جم غفیر ٹرین کی طرف بڑھا جو گھاٹ سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ گھاٹ پر ہندو عورتیں اشنان میں مشغول تھیں۔ چاروں طرف اہل ہنود کی ریل پیل تھی۔ متوسط طبقے کے خوشحال ہندو مرد اور عورتیں۔ غریب طبقے کے بدحال ہندو مرد اور عورتیں۔ کمال اٹیچی کیس اٹھائے سرل کے ساتھ ساتھ پٹڑی پر چلتا رہا۔ ''ان اضلاع میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔'' سرل نے کہا۔

''یہاں کس قدر سکون ہے۔'' کمال نے دوبارہ کہا۔ ''دراصل میری سائیکولوجی اتنی خراب ہوگئی ہے۔ میرے ذہن اور اعصاب پر ہندو مسلم پرابلم اس تکلیف دہ شدت سے مسلط ہے۔ جب میں ان دونوں فرقوں کو کہیں پرسکون انداز اکٹھے زندگی گزارتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں فساد کیوں نہیں ہو رہا۔''

چڑھائی پر کالی اینگلو انڈین لڑکی سر جھکائے اس کے آگے آگے جا رہی تھی۔ ٹرین کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا اٹیچی کیس زمین پر رکھا اور رومال سے چہرہ پونچھنے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے سرل نے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈھاکے پہنچ کر کمال اور سرل اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ روز شام کو وہ کلب میں ملتے اور اکٹھے اپنی جائے قیام واپس لوٹتے۔ کام ختم کرنے کے بعد سرل ڈھاکے کی گلیاں اور کونے کھدرے سونگھتا پھرتا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزرتی ہوئی جھلملیوں والی بند گھوڑا گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً ٹیگور اور سیتا دیوی کے ناولوں کا حوالہ دیتا۔ پیچ در پیچ قدیم محلوں میں سے نکلتے ہوئے ارمنی ٹولہ کے چار سو سال پرانے قبرستان میں جا کر اس نے سارا دن ارمنی تاجروں کی قبروں کے کتبے پڑھنے میں گزارا۔

اسٹیٹ بنک کی عمارت کے جغادری پیل پائے دکھا کر اس نے کمال کو بتایا کہ یہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اولین گورنمنٹ ہاؤس تھا۔

ایک روز وہ ویز گھاٹ گئے جہاں دریا کے کنارے ایک شکستہ، کھنڈر ایسی دو منزلہ کوٹھی میں بلبل اکیڈیمی قائم کی گئی تھی۔ ہال کے دروازے کے اوپر بلبل کی تصویر آویزاں تھی جس پر پھولوں کا ہار پڑا تھا، ہال میں اندھیرا تھا۔ اندر اور اوپر کی منزل میں بڑے بڑے ڈھنڈار لق و دق شکستہ کمرے پڑے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ زینے کی لکڑی پر برما کا انتہائی خوبصورت نقش و نگار کا کام بنا تھا، وہ سارے کمروں میں گھومتے پھرے۔ نیچے ایک کمرے سے گھنگھروؤں کی آواز آئی، وہ

دونوں اندر گئے جہاں ایک اور خستہ حال کمرے میں، جس کی دیواروں سے پلاستر گر رہا تھا اور جس کا اینٹوں کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑ ہوا تھا، ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی اور چند موسیقار ناچ کی گت بجا رہے تھے۔ چار پانچ لڑکیاں بنگالی مسلمان وائلن بجا رہا تھا۔ دبلے پتلے شری سوشل کمار میتر اا چک اچک کر لڑکیوں کو ناچ سکھانے میں مصروف تھے۔ کمال دروازے کی چوکھٹ میں مسحور کھڑا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس شکستہ کمرے میں، اس ویران جگہ پر، یہ چند لوگ، جوان بوڑھے، باہر کی دنیا کے سارے دکھ اور کمینے پن اور ظلم و ستم اور مجبوریوں اور پریشانیوں کو فراموش کر کے تھوڑے سے لمحات کے لیے تال اور سر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان میں کسی نے نوواردوں پر توجہ نہیں دی اور ناچنے اور ساز بجانے میں مصروف رہے۔ کمال دبے پاؤں وہاں سے لوٹا اور وسطی ہال عبور کر کے پچھلے پورٹیکو کی طرف گیا۔ دو لڑکیاں ماتھے پر کم کم کے بڑے بڑے ٹیکے لگائے دریا کے رخ، شکستہ سیڑھیوں پر خاموش کھڑی تھیں۔ سامنے ایک گائے گھاس چر رہی تھی۔ احاطے کی دیوار کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں۔ اوپر کی منزل میں برآمدے کے جنگلے پر دھوتیاں دھوپ میں سکھانے کے لیے پھیلی تھیں اور پیتل کی گڈویاں چم چما رہی تھیں۔ یہاں کتنی بے پناہ، اتھاہ اداسی تھی۔ ان سب لوگوں کے چہروں پر کیسا الم برس رہا تھا یا ممکن ہے وہ سب بے حد بشاش ہوں۔ کمال ہی کو ہر شے میں غم نظر آتا تھا، وہ سرل کو آواز دیتا ہوا باہر نکل آیا، وہ نواب پور روڈ کی رکشاؤں، چھکڑا ایسی بسوں، فقیروں کی ٹولیوں اور یونیورسٹی کے طلباء کے ایک احتجاجی جلوس میں گزرتے رمنا کی طرف واپس لوٹے۔

ریس کورس کی سڑک پر ڈھاکہ کلب جگمگا رہا تھا۔ آج وہاں گیسٹ نائٹ تھی۔ اعلیٰ طبقے کی موٹریں باہر کھڑی تھیں اور بال روم میں بیگمات رقصاں تھیں جو کلکتے سے ساریاں خرید کر لاتی تھیں اور جن میں سے اکثر کے بچے دارجلنگ اور شیلانگ کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لاؤنج میں بڑے بڑے تاجر اور مل اونر بیٹھے تھے۔

ذرا آگے بڑھ کر نیا شاہ باغ ہوٹل تھا جس میں امریکنوں کی فراوانی تھی۔

دوسرے روز وہ سرل کے ہمراہ لانچ کے ذریعے بوڑھی گنگا پر سرکاری کام سے ایک اور ضلعے کی سمت جا رہا تھا۔ سرل کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھتا رہا پھر معاً اس نے مڑ کر کمال کو مخاطب کیا:

"وہ سامنے درختوں کے جھنڈ دیکھتے ہو؟"

"ہاں"

"یہ بکرم پور ہے۔ یہاں سروجنی نائیڈو اور پی سی رائے وغیرہ کے بے حد خوبصورت گارڈن ہاؤس ہیں اور بے حد خوبصورت مناظر ہیں۔ یہ گاؤں اب سنسان پڑے ہیں۔ ان کے باسی مغربی بنگال ہجرت کر گئے۔ چلتے ہو دیکھنے؟"

"میں قبرستانوں کی زیارت کرتے کرتے عاجز آ گیا ہوں۔ کیا تم مجھے جینے نہیں دو گے۔"

"نہیں۔" سرل نے جواب دیا۔

"مہاراجہ وکرم سین کی مانند، جو لاش کو کندھے پر اٹھائے مرگھٹ سے آتا تھا اور لاش کا عفریت راستے میں وقت کاٹنے کے لیے روزان کو ایک قصہ سناتا تھا، تم

مجھے قصے سناتے ہو میں نہیں سنوں گا تمہارے قصے۔'' کمال نے ضد سے کہا۔

''وہ دومنزلہ گارڈن ہاؤس نظر آیا تمہیں؟'' سرل نے اسی طرح ساحل کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں رابندناتھ ٹیگور رہا کرتے تھے۔''

''چلو میں تم کو آج کا منظر دکھاؤں۔'' لانچ پانی پر چکر کاٹ کرنارائن گنج کی سمت مڑ گئی اور کمال نے ریلنگ پر جھک کر سرل کو مخاطب کیا:

''ہم آدم جی جوٹ مل جارہے ہیں۔'' اس نے فاتحانہ انداز میں سرل سے کہا۔

''اور وہاں پہنچ کر تم مینجر کے ساتھ لنچ کھانے کے بجائے مزدوروں کی اجرت کے متعلق اعدادوشمار جمع کرنا شروع کر دینا ،مفسد کہیں کے!!'' سرل نے جواب دیا۔

کمال مسکراتا رہا۔ وہ ملز پہنچ گئے عظیم الشان کارخانے جن میں بہاری عورتیں اور بنگالی مزدور کام کر رہے تھے بھاری مشینیں شور مچا رہی تھیں۔ کمال مبہوت بنا مشینوں کو دیکھا کیا۔

پھر وہ لانچ میں سوار ہو کر واپس مڑے۔

ساحلوں پر بیل گاڑیاں پٹ سن کے گٹھے لادے آرہی تھیں کسان تنکوں والی ٹوپیاں اوڑھے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ دریا کی سطح پر چاروں طرف چھوٹے بڑے اسٹیمر اور لانچ رواں تھے جن کے انگریزی نام تھے :میری اینڈرسن، اینی لاری، لیڈی فلورا، روز ماؤنٹ۔ انگریزوں کے عہد کی یادگاریں۔ دریائی جہاز رانی آج بھی ایک برطانوی کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔

لانچ دریا کے چوڑے دھارے پر چلتی رہی۔ آسمان کے اودے بادلوں میں سے سورج سرخ تلک کی طرح چمک رہا تھا۔ لہریں سورج کی کرنوں میں سونے کی ایسی جھلملانے لگیں۔ ہزاروں کشتیاں سطح پر حدِ نظر تک تیر رہی تھیں ایک بوڑھی عورت تیزی سے اپنا نو کا کھیتی ہوئی لانچ کے قریب سے نکل گئی۔ دریا پر ایک عظیم الشان، طاقت ور دنیا آباد تھی۔

مغرب کا وقت ہوا۔ کشتیوں میں چراغ جلے۔ پانی پر دیوالی منائی گئی۔ مانجھیوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ ہوا اٹھی اور روشنی کی مخالف سمت میں جاتے ہوئے کشتیوں کے بادبان سفید بگلوں کے پروں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

یہ سارا منظر ایک عظیم سمفنی تھا۔ بڑا گمبھیر راگ تھا۔ سارا بنگال راگ میں ڈوبا تھا۔ دکھ کا راگ، موت کا راگ، زندگی کا راگ۔

رات کو رمنا کی سڑکوں پر مدھم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ دور ایک مندر سے ایک ویشنو بھجن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ سرل اور کمال برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ساون کی گھٹائیں امنڈ کر اٹھی تھیں۔

سرل نے دوبارہ کتاب کھولی: ''تالاب کے چاروں اور چمپا کے پھول کھلے ہیں۔ آسمان پر کالے بادل گرجتے ہیں۔ میرے جی میں جذبات کا دھارا موجیں مارتا ہے جیسے اگست کے مہینے میں ندی میں بہیا آ جاتی ہے۔ ندی تو تو نہیں جانتی کہ کدھر کو جا رہی ہے، پھر اتنی تیزی سے کیوں بہتی ہے؟ او گھڑے! پانی میں بوند کی طرح ڈزب جا۔ میں بھی تیری طرح اتھاہ سمندر میں ڈوب چکی ہوں۔''

سرل قرون وسطیٰ کے بنگال لوک گیتوں کے صفحات پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ باہر اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جو صرف بنگال کی بھیگی فضاؤں میں رات کے وقت گھنے باغوں پر چھاتا ہے۔ لیمپ کی مضمحل سی زرد روشنی برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً بجلی کی چمک کے ساتھ زور کی گھٹا اٹھی اور ہوا چلنی شروع ہو گئی۔

''میں کل صبح انڈیا کے راستے کراچی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔'' کمال کہہ رہا تھا۔ سرل چونکا۔

''معلوم ہے۔''

''تم سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔''

''ہاں۔''

ہوا کا جھکڑ تیز ہو گیا۔ برآمدے کے نیچے اسوک کی شاخیں سرسرانے لگیں۔

''اسوک کا درخت!'' سرل نے گوجا اسے مخاطب کیا۔ ''جسے کوئی حسین لڑکی چھو لے تو اس میں فوراً پھول کھل جاتے ہیں!''

کمال نے بارش کی پھوار سے بچنے کے لیے کرسی اندر کو گھسیٹ لی۔

''کوا کالا ہے۔'' سرل نے پڑھا۔ ''کوئل اس سے زیادہ کالی ہے اور رنجا کھالی ندی کا پانی اس سے بھی زیادہ کالا ہے۔ پر اس کے بال سیاہ ترین تھے۔''

بارش کی بوندوں نے باہر تالاب میں جل ترنگ بجانا شروع کر دی۔ بجلی چمکی تو باغ کا ایک ایک پتا ایک پل کے لیے اس میں جگمگا اٹھا۔

''چمپک کے درختوں کے پار، بوڑھی گنگا کی موجیں بیکار شور کر رہی ہیں۔'' سرل نے کہا۔ ''ان سے کہہ دو کہ میں نے تمہاری آواز کی طرف سے کان بند کر

لیے ہیں میں اپنی کشتی کنارے سے باندھ چکا ہوں۔''

''اچھا میں کہہ دوں گا۔'' کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

دوسری صبح کمال نے سرل اشلے کو ڈھاکے میں چھوڑا اور فلائنگ کلب کا طیارہ لے کر کلکتے پہنچا۔ اس نے سوچا اپنے مرحوم ماموں نواب عباس رضا بہادر کے گھر والوں سے ملنے دت ہاؤس جائے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ٹرین میں بیٹھ کر لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

وہ ہوڑہ اسٹیشن پر ایک پولیس افسر کو اپنی اور آتے دیکھ کر ہڑبڑا گیا اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ویزا اور پاسپورٹ کے کاغذات کو چھوا اور مطمئن ہوا کہ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل نہیں ہو رہا ہے۔ ٹرین چلا گی۔ بردوان، آسنسول، پٹنہ، مغل سرائے، الہ آباد، لکھنؤ، ٹرین ایک اجنبی سرزمین میں چل رہی تھی۔ سال بھر قبل یہ اس کا اپنا ملک تھا، اب اس میں وہ ایک غیر ملکی کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اسے لگا لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں اسی کی طرف ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ تھانے چلو۔ تم پاکستانی ہو۔ مسلمان۔ جاسوس۔ مسلمان جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے یہی آواز نکل رہی تھی۔ غدار۔ جاسوس۔ غدار جاسوس۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین حسب معمول بڑی شان و شوکت کے ساتھ چار باغ جنکشن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

چار باغ۔ لکھنؤ۔ لکھنؤ۔

دو دن وہ عزیزوں کے پاس ٹھہرا۔ اب اسے خیابان کے کلیم کی خانہ پری کے

سلسلے میں ضروری کاغذات لینے دہرہ دون جانا تھا۔تیسرے دن وہ لکھنؤ سے چلا۔ (یہاں اب کیا رکھا تھا، وہ کس کے لیے یہاں ٹھہرتا، وہ بدل چکا تھا لہذا لکھنؤ بھی بدل گیا تھا) جب ٹرین مرادآباد کے قریب پہنچی تو اسے معاً یاد آیا کہ لکھنؤ میں سیتا ڈکشت نے اسے بتایا تھا کہ چمپا ولایت سے لوٹ آئی ہیں اور اپنے چچا کے پاس مرادآباد میں مقیم ہیں۔اس اطلاع پر کمال نے ویزا پر مرادآباد کا اضافہ کروالیا تھا۔

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی تو وہ اپنا سامان اٹھا کر گاڑی سے اتر آیا۔اسٹیشن سے باہر آ کر اس نے ایک تانگہ لیا اور سیتا ڈکشٹ کا بتایا ہوا پتا دیکھنے کے لیے جیب سے نوٹ بک نکالی۔پھر اس نے تانگے والے سے کہا: ''کٹھ گھر چلو۔''

تانگہ روشن بازاروں اور کالجوں اور ہسپتالوں کی بلند عمارتوں کے سامنے سے گزرتا ایک سمت کو چلا۔سڑک پر ٹھیلے چل رہے تھے اور پردے دار ریڑوے اور ڈولیاں اور یکے۔لڑکے بالے۔برقعہ پوش عورتیں سلیپر گھسیٹتی گلیوں میں گھس رہی تھیں۔تانگہ اب ایک محلے میں داخل ہوا جو شاید کمال کی منزل مقصود تھی۔دروازوں کے آگے ٹوٹے پھوٹے چبوترے تھے اور مسجد کی منڈیر پر ایک چیل بیٹھی اونگھتی تھی، یہ چمپا باجی کا محلّہ تھا؟

وہ تانگے سے اترا سامنے بڑا سا پرانے وقتوں کا پھاٹک تھا جس کے دروازے میں ایک چھوٹی کھڑکی کھلتی تھی۔اندر سلین تھی اور بھوسے کا ڈھیر۔دو تین کھٹیاں پڑی تھیں۔اندر ایک اور بے حد تنگ و تاریک زینہ تھا جو شاید اٹھارہویں صدی میں بنا ہوگا پھاٹک میں وہ چاروں طرف آوازیں دیتا پھرا، جب کسی نے اس کو جواب نہ دیا تو وہ ہمت کر کے خود ہی اس زینے پر چڑھ گیا۔دوسری منزل پر چھوٹا

سا آنگن تھا جس میں چینی کے گملے رکھے تھے۔ سامنے برآمدہ تھا اور ایک بڑا کمرہ جو شاید اس گھر کی بیٹھک کا کام دیتا ہوگا۔ اس میں صرف ایک کرسی پڑی تھی اور ایک مسہری۔ ایک الماری میں خدائی فوجدار اور اودھ پنچ کی جلدیں رکھی تھیں۔ دروازوں میں ان گنت اودے، نارنجی، سبز اور سرخ شیشے لگے تھے۔ باہر کے رخ چھجا تھا جو پھاٹک کے عین اوپر شہ نشین کی طرح نظر آتا۔ چھجے میں کھڑے ہو کر اس نے پچھم کی اور نظر ڈالی۔ گلی بے حد صاف تھی، اس نے غور سے دیکھا۔ نیچے مسجد میں پیش امام نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی جا نماز کے سامنے سجدہ گاہ کے قریب تام چینی کی رکابی میں کچھ رکھا تھا اور محلے کے تین چار لڑکے بالے ''بٹ کلیجی، بٹ کلیجی'' کہہ کر ان کو چڑا رہے تھے۔ امام صاحب سلام پھیر کر جلدی سے اٹھے۔ لڑکوں کو ڈھیلے سے مار بھگانے کے بعد پھر جا نماز پر واپس چلے گئے، ناقابل بیان سناٹا سارے میں طاری تھا۔ اسی مکان کے دائیں ہاتھ ایک سرسبز ڈھلان پر قبرستان تھا۔ اسے ایک جھرجھری سی آئی۔ زندہ روحیں، مری ہوئی روحیں، یہاں کتنی نحوست تھی۔ مردوں کا شہر۔ چمپا باجی تم یہاں کہاں ہو؟ قبرستان کے سرے پر چھپر تھا اور نیم کا درخت جس کے نیچے بکری بندھی تھی۔ چھپر کے اوپر کھڑکی میں سے کوئی لڑکی جھانک رہی تھی۔ کمال کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے جھٹ کھڑکی بند کر دی۔ وہ زینے سے نیچے اتر کر دوسرے پھاٹک کے سامنے آیا۔ اس کی بھی وہی وضع تھی۔ رنگ برنگے شیشوں والا شہ نشین۔ نیچے دربان کے کھڑے ہونے کے لیے طاقچے، شکستہ چبوترہ۔ اس نے پھاٹک کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

''کون ہے؟'' اندر سے آواز آئی۔

مایوسی اور ڈیپریشن کی وجہ سے کمال کے حلق سے آواز بھی نہ نکلی۔

''کون ہے؟'' دھاری دار گبرون کا سیاہ تنگ پائجامہ پہنے ایک بڑھیا نے اندر سے جھانکا۔

''میں ہوں۔''

''گے کیا بات ہوئی۔ اے نام تو بتاؤ بھیئے۔''

''میں ہوں کمال رضا۔ پاکستان سے آیا ہوں۔''

بڑھیا نے کچھ دیر بعد واپس آ کر کھڑکی کھولی۔

''آؤ۔ آ جاؤ میاں۔'' اس نے کہا

وہ اندر آ گیا۔ انگنائی میں اینٹوں کا فرش تھا۔ دیوار کے ساتھ کیاری میں کسی زمانے میں پودے رہے ہوں گے، اب وہ ویران پڑی تھی۔ باورچی خانے کے سامنے مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ مرغیوں کے پر ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ سامنے بڑا دالان تھا۔ دالان میں تخت، اس پر چمپا بیٹھی تھی۔

''ارے دلو۔ کمال، بھئی حد ہوگئی!''

''چمپا باجی!''

''تم! گڈ گاڈ!!'' وہ آہستہ سے اٹھی اور معذرت طلب انداز میں جلدی جلدی تخت پوش ٹھیک کرنے لگی۔

''میں سامنے والے مکان میں گھس گیا تھا۔'' کمال نے کہنا شروع کیا۔

''میرے گھر والے سب چچا میاں کے یہاں گئے ہوئے ہیں، وہیں چلو، وہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

اس نے الگنی پر سے دلائی اتاری اور اسے بڑے سلیقے سے اوڑھا تا کہ سر سے پاؤں تک دلائی اسے ڈھانپ لے اور گھونگھٹ سا نکال کر کمال کے ساتھ گلی میں آ گئی۔ ''ہمارے یہاں برقعے کا رواج نہیں ہے اب تک چادریں اور دلائیاں ہی اوڑھی جاتی ہیں۔'' اس نے گویا تشریح کی، وہ قدیم مسجد کے پاس پہنچ کر دوسری گلی میں مڑ گئی جو قبرستان کی ڈھلان کے برابر سے گزرتی تھی، یہ بھی بے حد صاف ستھری تھی۔ دیواروں میں گھاس اور پیپل کے درخت اگ آئے تھے۔

''یہ؟'' کمال نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم ہی لوگ ہیں۔'' چمپا نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہیں جیتے ہیں اور یہیں مریں گے۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔

چند قدم چل کر ''دیوان خانہ'' آ گیا۔

''چچا میاں کا مکان؟''

''ہاں۔''

وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ آنگن میں بہت سے تخت بچھے تھے۔ ویرانی کی شدت سے جگہ سنسنا رہی تھی۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا؟'' کمال نے ذرا وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

''نہیں'' چمپا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''یہ امام باڑہ ہے، یہ جو تخت پڑے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے اس میں ہمارے یہاں کی مشہور تختوں کی مجلس ہوا کرتی تھی۔''

اب انہوں نے پھر ماضی کی گردان شروع کر دی، کمال نے بوکھلا کر سوچا۔

''اصل مکان اندر ہے۔'' چمپا نے بات جاری رکھی۔ '' چلے آؤ۔تم سے پردہ کوئی نہیں کرے گا۔''

وہ ڈیوڑھی میں سے گزرتا اندر چلا گیا۔صحن میں کرسیاں اور چار پائیاں بچھی تھیں،ایک چار پائی پر کڑھا ہوا پلنگ پوش پڑا تھا۔باورچی خانے میں بگھار کی تیز مہک آرہی تھی، دوتین غیر واضح،غیر اہم سے لوگ ادھر ادھر بیٹھے تھے۔بادل گھرے ہوئے تھے مگر ہوا بند ہونے کی وجہ سے شدید حبس ہو گیا تھا، برساتی کیڑے چراغوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔

''چا ابا............یہ کمال ہیں............''نیم تاریکی میں چمپا کی آواز آئی۔

''آؤ......آؤ......بیٹھو میاں...... بڑی عزت افزائی کی تم نے ہماری۔'' چا ابا نے ، جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے،اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لالٹین اٹھا کر ایک لڑکی باورچی خانے کی اور لپکی ۔ایک اور لڑکی دالان میں میز پر بیٹھی پڑھ رہی تھی ۔یااللہ!مڈل کلاس اس قدر ڈیپریسنگ ہوتا ہے؟ کمال نے لرز کر سوچا۔آنگن میں آنے والوں کی آہٹ سن کر دالان والی لڑکی نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا ۔کمال نے جلدی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔اس نے مسلمان مڈل کلاس لڑکیوں کے فرسٹریشن اور رومان پرستی کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ یہ لڑکی یا وہ لڑکی جو باورچی خانے میں اس کے لیے چاءبنا رہی تھی اس کے ساتھ وقتی رومان شروع کر دیں اور بعد میں اسے لمبے لمبے کھرے لکھا کریں۔محبت نامے۔

اس کی کوفت میں اضافہ ہوتا گیا۔

''یہ میری کزنز ہیں دونوں۔'' چمپا اسی آواز میں پائینتی بیٹھی اسے بتا رہی تھی۔
''وہ والی زیب النساء ہیں انہوں نے دلی سے لائبریری سائنس میں ایم۔اے کیا ہے۔چھوٹی والی مریم زمانی ہیں، یہ اگریکلچر میں ایم۔ایس۔سی کر رہی ہیں۔جب میں انٹر کے بعد لکھنؤ پڑھنے گئی تھی یہ دونوں کی دونوں بالکل ذرا ذرا سی تھیں۔کس قدر تیزی سے گزرتا ہے، تم کو چپ کیوں لگ گئی؟''

''کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی۔''

پھر چچا میاں اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔وہی پرانے قصے۔ پاکستان، ہندوستان ہماری تو میاں بدھیا بیٹھ گئی۔انہوں نے کہا۔

''یہاں اتنا سناٹا کیوں ہے؟'' کمال نے گھبرا کر پوچھا۔پھر اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا۔

''ساری آبادی کہاں چلی گئی۔''

''وہیں جہاں تم چلے گئے۔'' چچا میاں نے جواب دیا۔''کھوکھرا پار کے راستے سے سب نکل لیے، روہیل کھنڈ خالی ہو گیا۔بس ہم چند بڈھے ٹھڈے باقی رہ گئے ہیں۔دو تین سال کی بات اور ہے، جب ہم مر جائینگے تو یہاں ہمارے بعد گدھے لوٹیں گے۔''

کمال اٹھ کر ٹہلنے لگا۔مریم زمانی نہایت بےتعلقی سے چاء بنا کر لا رہی تھی۔ اس کا رومان شروع کرنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا۔کمال نے ذرا اطمینان اور ذرا مایوسی سے سوچا۔

''پاکستان کے کیا حال ہیں؟'' چا ابا پوچھتے رہے۔''سنا ہے یہاں سے دیکھنے

جولا ہے جا کر وہاں لکھ پتی ہو گئے، اپنے کو سید کہویں ہیں اور کوٹھیوں میں رہیں ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے میاں؟ میرے بھانجے نے لکھا ہے کہ وہاں ہر جگہ پنجابیوں نے یو۔ پی۔ والوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اندھیر گردی مچی ہے۔ میاں ہم تو تباہ ہو گئے تباہ اور وہاں بھی کون سے لڈو مل جائیں گے۔ میرے بھانجے کا خط کل ہی آیا ہے جہلم سے، اس نے شعر لکھا ہے، وہ کیا شعر ہے زیبا بیٹی؟''

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ہی.....ہی۔ انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ''مریم سکٹ بھی تو لا ؤ بھیّے کے لیے۔ کمال میاں اسی ڈیوڑھی پر چار چار ملازم موجود تھے، اب یہاں سارے میں الو بول رہا ہے۔''

کمال چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے مسلمان قوم کے متعلق پھر اپنی محبوب تھیوری دل میں دہرانا شروع کر دی۔ یہی بڑے میاں ۴۶ء میں سٹی مسلم لیگ صدر رہے ہوں گے۔ سن اڑتالیس تک سوچتے ہوں گئے کہ لشکر اسلام سری نگر فتح کرنے کے بعد لال قعلہ، دلی پر فتح کر پر چم لہراتا یہاں کے مسلمانوں کو لبریٹ کرنے کے لیے بس اب آیا ہی چاہتا ہے، کمال کا دم گھبرانے لگا۔

''یہاں بجلی کی روشنی اب تک نہیں آئی۔'' چمپا غیر شخصی آواز میں بتلا رہی تھی۔ محلے میں تو کب کی آ چکی ہے جہاں پھوا ماں کی کوٹھی تھی، وہ چلی گئیں حیدر آباد سندھ مع اپنے گھر والوں کے لہذا کوٹھی کسٹوڈین نے لے لی۔ اس میں سکھوں نے اسکول کھول کر بجلی منگا لی ہے ہمارے مکانوں میں نہیں آ سکی۔ چمپا کی آواز نیم تاریکی میں ڈرون کرتی رہی۔

''بجلی کے لیے میاں پیسے چاہئیں۔'' چا ابا نے چاء کی سینی زور سے اسٹول پر رکھتے ہوئے کہا۔ سینی کا توازن قائم نہ رہ سکا، جگ ٹوٹنے سے سارا دودھ انگنائی کے فرش پر بہہ گیا۔ چمپا اسے افسوس سے دیکھتی رہیں۔ ''اب اتنی رات گئے دودھ کہاں سے آئے گا۔'' انہوں نے کہا۔

''اس پر افسوس نہ کرو چمپا باجی۔'' کمال نے گہری آواز میں آہستہ سے کہا۔

چمپا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

کمال نے چمپا کو آج ان کی زندگی کی ایک اور سیڑھی پر ایک پس منظر میں دیکھا جو ان کا حقیقی پس منظر تھا۔ اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھ بند کر لی۔ لکھنؤ، پیرس، کیمبرج، لندن، روم اور میڈرڈ والی چمپا، مرادآباد کے محلے کٹھ گھر کے اس نیم تاریک مکان والی چمپا، مڈل کلاس چمپا، بہادر چمپا عرف نئے ہندوستان کی عاقلاو رولا اور حسینہ۔ واہ بجیا۔ تمہارا جواب نہیں۔ مانتا ہوں۔

کمال مرادآباد میں دو دن رکا۔ رات کو اسے اسی اودے اور نارنجی شیشوں والے کوٹھے کے کمرے پر پہنچایا گیا۔ جہاں وہ سب سے پہلے جا پہنچا تھا۔ آدھی رات تک وہ چھجے میں کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا جہاں چاند نے اپنی مٹیالی روشنی مکانوں کی چھتوں، مسجدوں کے میناروں اور نیم کے درختوں پر پھیلا رکھی تھی۔

دوپہر میں قیلولے کے لیے اس کا کھٹولہ زینے کی آخری سیڑھی پر بچھا دیا گیا جہاں رام گنگا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔

''سنا ہے تمہارے یہاں ہندوستان کی ساریوں کی بڑی مانگ ہے۔'' چمپا باجی نے آکر دہلیز پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بشاشت سے بات شروع کی۔

"تمہاری ہم وطن اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین یہاں آتے ہی کپڑے کی دکانوں پر یلغار کرتی ہیں۔ سنا ہے تمہارے یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی۔"

"کیا اعلیٰ سوسائٹی کی گردان کر رہی ہو۔" کمال نے جھنجھلا کر اس کی بات کاٹی۔ "یہ نہ بھولو چمپا باجی کہ خود تم کو طبقاتی شعور حاصل کرنے میں پورے پندرہ سال لگے۔"

چمپا زور سے ہنسی۔ "طبقاتی شعور کی بات کرنا ہے تو میری کزنز سے گفتگو کرو۔ زیبا اور مریم، بڑی بھاری اسٹوڈنٹ ورکرز ہیں دونوں۔ دلی کے سالانہ انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹول میں ہمیشہ یہ لوگ جانے کیا کیا کرامات کرتی ہیں۔ جھانکیاں عوامی ناچ، موسیقی کے مقابلے۔ زیبا نے پچھلے سال کے فیسٹول میں سنگتراشی میں پہلا انعام حاصل کیا۔"

کمال کی سمجھ میں آ گیا۔ اس کا خدشہ بے کار تھا، یہ مڈل کلاس لڑکیاں اپنے فرسٹریشن اور اپنی رومانیت پر فتح حاصل کر چکی تھیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اگر وہ چمپا کی جگہ ہوتیں تو شاید اسی کی طرح رومان پرست ہوتیں، یہ نئی لڑکیاں تھیں۔ چمپا عبوری دور کی لڑکی تھی اس لیے لامحالہ اس نے تجربے کیے اور ٹھوکریں کھائیں۔

زیبا اور مریم، ہمت والی لڑکیاں۔ ان کے دماغوں میں کوئی الجھن نہیں۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے دیس میں ایسی لڑکیاں نہیں، وہاں ابھی عبوری دور بھی پوری طرح شروع نہیں ہوا۔

"کاش میں ۱۹۴۱ء میں ان دونوں کی ایسی بن گئی ہوتی۔" چمپا نے گویا کمال کے دل کی بات پڑھ لی۔ "اب ہم لوگوں کے اختیار میں تو واقعات نہیں ہوتے۔"

کمال نے جواب دیا۔ اس نے محسوس کیا وہ کس قدر بوڑھا ہو چکا ہے۔ چمپا، جو اس کے سامنے چوکھٹ پر بیٹھی ہے، کتنی بوڑھی عورت ہے۔ ہم دونوں نے من کی دنیاؤں کی کتنی لمبی سیاحت کی۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

وہ اس وقت ایک اجنبی شہر مین ایک نیم تاریک زینے پر بیٹھا تھا۔ دریا پر سے آتی ہوئی برساتی ہوا اس کے بال پریشان کر رہی تھی۔ وطن کی برسات، مگر یہ وطن نہیں تھا۔ اس کے ویزے کی معیاد ختم ہونے والی تھی، کل سویرے وہ یہاں سے اپنے ملک روانہ ہو جائے گا۔ مراد آباد، کٹھ گھر، یہ زینہ، چمپا احمد، زیبا، مریم، چا ابا۔ سب یہیں رہ جائیں گے۔ کیا اس حقیقت پر اسے آنسو بہانا چاہیے؟ لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس میں ضبط آ گیا ہے۔ ضبط، توازن اور سکون، گریک آئیڈیلز .... اسے ہری شنکر کے الفاظ یاد آئے۔

چمپا نے پھر اس کے دل کی بات پڑھ لی اور اس نے پرانی عادت کے مطابق دہرایا: "کہاں ہے تمہارا ہمزاد ہری شنکر؟"

"چمپا باجی" اس نے ذرا غصے سے کہا: "ہری شنکر اب میرا ہمزاد نہیں رہا، مجھے کیا معلوم وہ اس وقت کہاں ہے۔"

"کیوں اسے خط نہیں لکھتے؟"

"چمپا باجی" اس نے پہلو بدل کر کہا، "تم کو یہ اب تک معلوم نہیں ہوا کہ میں دوستوں کو خط نہیں لکھا کرتا۔ میں ہری شنکر سریواستوا کو کیا لکھوں اور کیوں لکھوں؟"

"اب تک جذباتی ہو!"

''نہیں۔'' اس نے بل کھایا۔ چمپا نے اسے پھر چوری کرتے پکڑ لیا تھا۔

''ہٹایئے چمپا باجی۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''میں اس سارے انڈو پاکستان میلوڈراما سے، جو چاروں طرف کھیلا جا رہا ہے، قسم خدا کی عاجز آ چکا ہوں۔ ہری شنکر آج کل شاید بنگلور میں ہے، اب میں کیا جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤں؟ لاحول ولاقوۃ۔''

''تم اب تک مضبوط نہیں ہوئے۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا ''تم ہری شنکر سے ملنا نہیں چاہتے کیونکہ تم کو ڈر ہے کہ واقعی جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤ گے۔ اچھا پھر مجھ سے ملنے کیوں آئے؟ یہ بھی بڑی سخت میلوڈریمٹک بات تھی۔''

''آخر انسان ملتا ملاتا ہی رہتا ہے پرانے دوستوں سے۔'' کمال سے کوئی اور معقول جواب نہ بن پڑا۔ ''اور پھر مرادآباد راستے میں ہی پڑتا تھا'' اس نے منہ لٹکا کر کہا۔

بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹین کے چھجے پر برسنے لگیں۔ گلی کی مٹی کی سوندھی خوشبو اڑ کر کمال تک پہنچی۔ ایک عورت تنگ پائجامہ پہنے، آم کی کھانچی سر پر اٹھائے، آواز لگاتی نیچے سے گزری۔ چمپا دہلیز پر بیٹھی موکھے سے باہر دیکھتی رہی۔

بہت دیر سے کمال ایک سوال دل میں لیے بیٹھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ آخر اس نے دبی زبان سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا:

''چمپا باجی اب تم کیا کرنے والی ہو؟''

یہ بڑا بےرحم سوال تھا۔ ہم کسی سے اس کے مستقبل کے بارے میں کس طرح پوچھ سکتے ہیں!

''میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں بالآخر بنارس واپس جارہی ہوں۔ تم کو یاد ہے میں نے کیم کے کنارے بوٹ ہاؤس میں تم سے کہا تھا: میں واپس جانا چاہتی ہوں، کوئی ساتھ لے جانے والا نہیں ملتا۔ اب میں نے دیکھا کہ کسی دوسرے کا سہارا ڈھونڈھنا کس قدر زبردست حماقت تھی۔ میں خود ہی بنارس لوٹتی ہوں، جانتے ہو میرے آبائی شہر کا نام کیا ہے؟''

''ہاں۔ مسرت کا شہر، وہ بھی ایک نہ ایک دن واقعتاً مسرت کا شہر بنے گا۔ سارے شہروں کی طرح اس ملک کو دکھ کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دوسروں سے کیا مطلب؟'' اس نے اپنے ہاتھ کھول کر غور سے انہیں دیکھا۔ ''رقاصہ کے ہاتھ، آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ؟ نہیں .... یہ صرف ایک عام، اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جو اب کام کرنا چاہتی ہے۔''

وہ خاموش ہوگئی، کچھ دیر بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا۔

''کمال!'' کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ تم کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ تمہارا وطن ہے۔'' اس نے بے بسی سے انگلیاں مروڑیں۔ ''اور تم کیوں چلے گئے؟ کیا میں تمہارے یہاں آجاؤں تو مجھے ایک سے ایک عمدہ عمدہ نہ مل جائے گا! دیکھو میں پیرس اور کیمبرج اور لندن سے کتنی ڈگریاں لائی ہوں۔''

ہرسنگھار میں رنگے دوپٹے اور پتمبری ساڑیاں پہنے چمپا کے رشتے دار لڑکیاں

نیچے دالان میں پکوان چڑھا رہی تھیں۔ ''بھئی کچھ یہاں بھی بھجواؤ۔'' چمپا نے کھڑکی میں سر نکال کر آواز دی۔

''اچھا بجیا۔ ابھی تھمئے۔'' پھر انہوں نے ایک گیت شروع کر دیا۔ جھولا کن نے ڈالوری امریاں۔

کمال نے کھٹولے پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بچپن سے یہ گنت سنتا چلا آ رہا تھا۔ آتے ہی اس کے خاندان کی لڑکیاں بھی کڑھائی چڑھا کر یہ گیت الاپنا شروع کر دیتی تھیں۔

زینے پر پانچے کی جھونک دکھلائی دی۔ زیبا پھلکیوں کی پلیٹ لے کر اوپر آ رہی تھی۔ سہج سہج وہ اندر آئی اور پلیٹ فرش پر رکھ کر گنگناتی ہوئی پھر نیچے اتر گئی۔

چمپا چوکھٹ پر بیٹھی رہی۔ ''تم سوچ رہے ہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا، ''کہ اب میرے دوار کون آئے گا۔ لیکن کمال میں سمجھتی ہوں، جہاں تک ذاتی کامیابی کا سوال ہے، میں تم سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میں نے سراغ پالیا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو چمپا باجی۔''

نیچے حوض میں برکھا کی پھوہار کا جھالا بج رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے سارے میں ہریالی اور تروتازگی چھا گئی تھی۔ گلیوں میں ننھی ننھی ندیاں بہہ رہی تھیں، چھجوں اور پرنالوں سے پانی کے آبشار گر رہے تھے، نیچے آنگن میں پانی کی چھوٹی سی شفاف جھیل بن گئی تھی، اوپر چینی کے گملوں میں لگے ہوئے پودے پانی میں لہلہا رہے تھے۔ ''یہ میرا جل محل ہے۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا۔ ''یہاں میرے آنسوؤں کا پانی بہتا ہے۔''

دالان میں لڑکیوں کے دوپٹے لہرائے، ہلکی کاسنی، زرد اور سبز رنگ کی چنری اوڑھے ایک لڑکی نے، جو شاید مریم تھی، میرا کا گیت شروع کردیا۔

''میں ایک عام اوسط درجے کی لڑکی ہوں۔'' چمپا کہتی رہی۔ ''اگر میں خدا کا خاص الخاص بندہ ہوتی۔ میرا، ملکتا بائی، سینٹ صوفیہ۔ تو میرے جسم پر زخموں کے نشان نظر آتے، میرا لبادہ میرے مقدس خون سے سرخ ہوتا، میرے ہاتھوں میں میخیں گڑی ہوتیں، میرے سر کے گرد نور کا ہالہ ہوتا، مجھے وش کے پیالے اور سانپ کے پٹارے بھجوائے گئے ہوتے، لیکن میں محض چمپا احمد ہوں۔ میرے زخم کسی کو نظر نہیں آسکتے کیونکہ میرے تماشائی بھی میری طرح زخمی ہیں، وہ کمزور اور فانی انسان ہیں۔ چشم بینا نہیں رکھتے۔ لوگ ممکن ہے مجھ پر ہنستے بھی ہوں جبکہ سینٹ صوفیہ کی پرستش کی جاتی ہے۔''

ہوا کے زور سے بہت سی جامنیں ٹپ ٹپ کرتی سیڑھیوں پر آن گریں۔ چمپا نے اپنے بالوں میں سے ایک زرد پتا نکالا۔

''کمال'' اس نے سوچتے ہوئے کہا، ''تمہیں وہ لنکا کی آرٹسٹ لڑکی یاد ہے؟ برسوں تک وہ کینوس پر کینوس رنگتی چلی گئی۔ دنیا کے نگار خانوں کی اس نے خاک چھانی، لندن اور پیرس میں اس کی نمائشیں ہوئیں جن میں بیویاں نئی نئی ساریاں اور فراک پہن کر آتیں، معزز مہمان تقریریں کرتے، تصویریں لی جاتیں، پریس کے نمائندے اس کا انٹرویو کرتے، وہ ایک کونے میں کھڑی مسکرا مسکرا کر سب سے باتیں کرتی، آخر میں سب چلے جاتے، اس کا ہال خالی ہو جاتا، اپنی پینٹنگز کی معیت میں وہ تنہا رہ جاتی اور چپ چاپ باہر نکل کر بس میں بیٹھتی اور گھر کی راہ لیتی۔ تین

مرتبہ میں نے یہی منظر دیکھا۔''

''میں نے طرح طرح کے جینئس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت بتایا۔ان میں سے ہرایک کبھی اپنی جگہ خوش ہوتا کبھی رنجیدہ۔تم خوش کیوں ہو؟ میں ہرایک سے پوچھتی۔اتنے ذہین ہوتے ہوئے بھی بشاش ہو،حد ہے۔میں برامان کر کہتی،مگر آخر میں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں اپنے غم کوجنہوں نے دنیا کے غم میں سمودیا تھا۔کس قدرآسان بات تھی۔پہاڑ کے نیچے پہنچےتو معلوم ہوا ہم خود اورہماراذاتی الم کس قدرحقیر شے ہے۔''

''آٹھ سال بعد تمہاری طرح میں اپنے وطن واپس لوٹی اور میں نے یہاں کے حالات دیکھے۔ایسی باتیں دیکھیں جن سے میرا سر ندامت سے جھک گیا اور میرا دل دکھی ہوگیا۔میرے سامنے مسائل کا بہت اونچا پہاڑ کھڑا تھا۔تب جانتے ہو کیا ہوا؟ چیونٹی نے کیا کیا۔اس نے کانوں مین ہاتھی لٹکا کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کردیا۔''

''اب بھی معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں کیا کرنے والی ہوں؟''

دوسرے روز شام کو وہ وہاں سے چلا۔اس کے لیے تانگہ منگوایا گیا۔چمپا اور مریم اور زیبا اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئیں۔''ہم اب تک اس محلے میں زبردست پردہ کرتے ہیں ورنہ چااباکوخواہ مخواہ صدمہ ہوگااس لیے ہم بوجہ پردے کے تم کو اسٹیشن تک چھوڑنے نہیں جاسکتے۔''چمپا نے ہنس کر کہا۔

کمال تانگے پر بیٹھا۔تانگہ گلی سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل دیا اور کمال نے دیکھا:چمپا باجی ایک بار پھر دور کھڑی رہ گئیں،ٹوٹے ہوئے مکان کی دہلیز پر۔اسی

طرح اس نے ان کو اوکسفرڈ اسٹریٹ پر چوزے کی سرائے کے شیشوں والے دروازے کے پیچھے تنہا کھڑا چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح وہ ایک مرتبہ گل فشاں کے پھاٹک کے سامنے اندھیری سڑک پر کھڑی رہ گئی تھیں جب بھیا صاحب ان کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔

لیکن اس وقت وہ اکیلی نہیں تھیں، اب وہ ہجوم کا حصہ تھیں۔ انہوں نے بالآخر غیر مشروط طور پر ہجوم کی دوسراتھ قبول کر لی تھی۔ چند سال پہلے کمال سوچا کرتا تھا: وہ آگے جا رہا ہے۔ چمپا پیچھے رہ گئی ہیں، وہ دور نکل جائے گا...... نئی دنیائیں، نئے خواب، عزائم، آئیڈیلز۔

مگر آج، اس سمے، اس نے دیکھا کہ وہ آگے نہیں جا رہا، وہ مع اپنی دنیا کے مسلسل، مستقل مراجعت میں ہے اور تنہا ہے۔ چمپا، جواب تنہا نہیں، جلوس میں شامل ہیں، آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے محلے کی گلیاں، مسجد کے مینار، زیبا اور مریم، سڑک پر گولیاں کھیلتے ہوئے لڑکے، ٹھیلے والے، برقعہ پوش عورتیں، سب ہیں۔ چمپا باجی ان سب کی ساتھن بن گئی ہیں۔ یہ لوگ آگے بڑھنے کے لئے تیار ہیں۔ آج نہیں، کل سہی۔ ایک نہ ایک روز بہت جلد یہ لوگ ترقی یافتہ ہو چکے ہوں گے۔ اس نکتے پر پہنچ کر سرل کے فلسفے کے سارے غیر مرئی تار جھن جھنا کر ٹوٹ گئے۔

تانگہ اب قاضی کے بازار سے گزر رہا تھا، دکانیں بڑھائی جا رہی تھیں۔ چاء خانوں میں ریڈیو بج رہے تھے، سینما گھروں کے آگے ہجوم تھا مغرب کے آسمان پر ایک آدھ کنکوا اڑتا ہوا دکھلائی دے جاتا تھا۔

کیا کروں پارٹنر............ٹرین میں بیٹھتے ہوئے اس نے دل میں کہا،میرا بڑا افسوسناک خاتمہ ہوا ہے۔

ٹرین شوالک کی پہاڑیوں سے گزرتی ہمالیہ کے ہرے بھرے دامن میں پہنچی۔ ہردوار، رشی کیش، ہرکی پوڑی، دیودار کے جنگل، بانسوں کے جھنڈ، جھرنے، پہاڑی ندیاں، مندر، سادھو، چٹانیں، پھولوں سے لدے ہوئے درخت، دہرہ دون کے اسٹیشن پر اتر کر وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔ کلیم اور منقولہ اور غیر منقولہ کے کاغذات اور مکان کے قبالے نکالے گئے۔سرکاری قسم کی گفتگو ہوئی۔پھر اس نے ڈالن والا کی خوبصورت سڑکوں پر گھومنا شروع کیا۔ اس نے آخری بار مکانوں کے ناموں کی تختیاں پڑھیں۔

سامنے رسپنا بہہ رہی تھی۔

''یار ہری شنکر۔'' کمال نے کہا۔

''ہاں یار۔''

''یار یہ پروفیسر ٹھیک تو کہتا تھا۔ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں خدا کی قسم۔''

اس روز انہوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور وخوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہی۔آ ؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی سائیکولوجی آشکار ہوتی ہے۔ چلتے چلتے رک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر نے کہا۔

''ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔'' کمال نے

کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوازی کس قدر افسوسناک طور پر جذبات زدہ ہے۔ ذرا یہ نام پڑھنا۔''

''خوابستان۔ لاحول والا قوۃ۔''

''مگر تم خود گل فشاں میں رہتے ہو۔''

''جانتا ہوں۔''

''یار کمال۔''

''ہاں یار۔''

''ذرا سوچو لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں، یہاں سے وہاں تک، ایک سے ایک خوبصورت ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔''

''ہاں یار بڑی عجیب بات ہے۔''

وہ دونوں ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوص کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ''ایک صحیح الدماغ انسان، سائنس دان اور لے کر چل دیا جنگل کو، حد ہے۔''

''اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ معنی کے معنی.........''

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے ''دفسترن'' ''دولت'' ''شیم روک'' ''راج محل''

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پہاڑی پھلوں کی مہلک سارے میں اڑ رہی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا۔ ایک لمبی سی کار آ کر اس کے قریب رکی، وہ چونک پڑا۔ آنکھیں مل کر اس نے چاروں اور دیکھا ہری شنکر غائب ہو چکا تھا۔ یہ ۴۲ء نہیں تھا، وہ ۵۶ء کے دہرہ دون میں موجود تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں ملیں، وہ تو اپنے ہی مکان کے پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ کار میں سے ایک خوش پوش سردار جی اتر کر اس کی طرف بڑھے۔

''آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں جی؟''

''میں.........میں.....'' وہ گڑبڑا گیا، اس کا دل دھڑکنے لگا۔ سردار جی شاید اسے ٹھگ سمجھ رہے تھے جو ان کے ڈرائنگ روم سے ریڈیو چرانے کے ارادے سے آیا تھا۔ اس نے دوبارہ پھاٹک میں لگی ہوئی سنگ مرمر کی تختی پڑھی: نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور۔

یہ اس کا مکان تھا، وہ پلیا پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ اس نے ثبوت کے طور پر قبالے کے کاغذات نکال کر سردار جی کو پیش کیے اور کھسیانی ہنسی ہنسا۔

''اوہ.........آپ مووا ایبل پراپرٹی کے سلسلے میں آ ہے ہو۔ تشریف لاؤ جی تسی۔''

وہ سردار جی کے ساتھ باغ کی سڑک پر داخل ہوا۔

''آپ کا اسٹور روم حفاظت سے بند ہے جی۔ کنجی لائے ہو آپ؟''

''جی ہاں۔''

ڈرائنگ روم میں لے جا کر سردار جی نے اسے چاہ پلائی اور کھانا کھلانے پر مصر رہے۔

سردار جی راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور یہاں بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ دیر تک وہ اپنے وطن کی یاد میں رویا گایا کیے۔ کمال گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''باکس روم کھولنے میں کل صبح آ سکتا ہوں؟''

''ضرور جی اپنا ہی گھر سمجھو۔'' سردار جی نے کہا اور اپنی کار میں بٹھال کر اس کی قیام گاہ تک پہنچایا۔ صبح کو وہ پھر ''خیابان'' پہنچا۔ اب دھوپ نکل آئی تھی۔ باغ میں دو نوجوان لڑکیاں ننگے پیر بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ سردارنی جی نوکروں پر چیختی چلاتی پھر رہی تھیں اور بھینسوں کی سانی کروا رہی تھیں۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا، بڑا پرسکون منظر تھا، وہ پہلو کے راستے سے گزرتا اسٹور روم پہنچا اور تالہ کھولنے سے پہلے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

وہاں ان سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا وہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی ''گم شدہ نسل'' کا ایک فرد تھا۔ اس نے محسوس کیا اس کے خاندان والوں کی دنیا خزاں زدہ جنگلوں، گلاب کے پھولوں، پہاڑی کانجوں اور تیسرے پہر کی چاء میں چاندی کی جھلملاتی ہوئی چاء دانی کی دنیا تھی۔ سامنے دیوداروں کے درمیان سے جو پگڈنڈی گزرتی تھی اس کے خاندان کی خواتین رنگین چھتریاں سنبھالے اس پر چلتی ہوئی کسی پرانی ترکی یا یورپین افسانے کی خوابناک فضاؤں میں تیرتی معلوم ہوا کرتی تھیں۔

''خیابان'' میں چھ بڑے بڑے کمرے تھے جن کے چاروں اور مزید کمرے اور برآمدے اور گیلریاں۔ جاڑوں میں جب کبھی وہ یہاں آتے وسط کے کمرے میں فرش پر گدے بچھا دیے جاتے۔ پہاڑی خانساماں فقیرا چاء کی کشتی لا کر آتشدان کے سامنے رکھ دیتا۔ آنگن میں چمپا کا ایک درخت کھڑا تھا۔ اس کے تین طرف برآمدے تھے جن میں سے ایک کے سرے پر یہ اسٹور روم تھا۔ آنگن میں اس طرح کا گھریلو ماحول رہتا جس کا ذکر سرت چندر کے ناولوں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ جاڑوں کی راتوں میں کمال اور طلعت کے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ رنگ بھرنے کی کتابیں، پریوں کی کہانیاں، گڑیاں اور میکنو سیٹ، جب کبھی یہ گودام کھلتا تو سب بچوں کی طرح شدید تجسس اور اشتیاق سے وہ بھی اماں بیگم کے پیچھے پیچھے اس میں جا گھستا۔ کیسی کیسی پراسرار چیزیں اس میں بند رہتی تھیں۔ صندوق، ٹوکریاں، برتن، جھاڑ فانوس، بڑے بڑے لیمپ، پرانے رسائل، خطوں سے بھرے ہوئے اٹیچی کیس، نواڑوں کے بنڈل، دریاں۔

سردیوں میں کرسیاں بجری پر ڈالے بابا بیٹھے حقہ گڑگڑایا کرتے۔ لیچیوں کے درختوں پر سے کمرہ رفتہ رفتہ چھٹتا۔ شاگرد پیشے میں ترلوچن مالی نے کمرے کی دیوار پر ایک بڑی سی رنگین تصویر لئی سے چپکا رکھی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ جو منش دنیا میں برے کام کرتے ہیں نرک میں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ (مثلاً ایک تصویر تھی کہ ایک آدمی نرک میں ایک گاڑی میں جتا تھا اور لمبی لمبی زبانیں نکالے بندر نما فرشتے گرز مار مار کر اس کو ہانک رہے تھے) اور روزی جمعدارنی جس کی لڑکی انگریزوں کے یہاں آیا گیری کرتی تھی، جب چاء دانی کوڑے کی بالٹی میں

انڈیلی جاتی تو وہ چاء کی پتیاں اس میں سے نکال کر گھاس پر سکھاتی اور ان کی چاء بنا کر پیتی۔

لکھنؤ سے سارا عملہ ساتھ آیا۔ قدیر جو ہرے رنگ کی لوئی اوڑھے ٹھاٹھ سے بے ٹانگ کی کرسی پر اپنے کمرے کے آگے بیٹھے رہتے۔ باورچی خانے کے سامنے کٹھل کا درخت تھا۔ حسینی کی بی بی روز کھڑی ہو کر اس کے پھل گنتیں۔

فرنیچر پر سرخ رنگ کا کپڑا منڈھا تھا۔ موجّ کے فرش، سرخ اور عنابی قالین۔ سامنے برآمدے میں دیوار پر ایک رنگین تصویر فریم میں لگی تھی جس میں شکاری کتے ایک بارہ سنگھے کا تعاقب کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کا آتشدان بانات کی کارچوبی جھالر سے آراستہ تھا۔ اس پر چاندی کے فریموں میں اہل خاندان کی تصویریں دھری تھیں۔ کونوں میں پیتل کے بول اسٹینڈز پر رکھے تھے جن میں پام کے گملے رکھے جاتے۔ ڈرائنگ روم کی چلمچی میں روز تازہ پتے بھرے جاتے جن کی بڑی اچھی سی مہک آتی۔ ڈنرز کے موقعے پر میز خالص انگریزی اسٹائل سے سجائی جاتی۔ چھری کانٹے، فنگر بول جن میں گلاب کی پتیاں تیرتیں۔ بیرہ ہمیشہ ضابطہ چپکن پہنتا اور صافے پر چاندی کا بلا لگاتا اور کمر میں پٹا باندھتا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو کمال چپکے سے باہر نکل کر لیچیوں کے خنک جھنڈ میں جا بیٹھتا۔ ایک عظیم آفاقی کاہلی سارے میں چھائی ہوتی۔ بڑے پرسکون خیالات دماغ میں آتے۔ دور دیوداروں میں ایک پرندہ متواتر بے تکان چلائے جاتا: میں سوتا تھا............ میں سوتا تھا...... کہا جاتا ہے کہ یہ پرند شوالک کی وادیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا اور اسے کبھی کسی نے دیکھا

بھی نہیں۔ پہاڑی نوکر کہا کرتے تھے کہ جب پرجاپتی دنیا بنا رہے تھے اور سارے جانداروں کو ان کی قسمتیں اور اوصاف بانٹے جارہے تھے (مور کو پر ملے، کوئل کو آواز، وغیرہ) اس وقت یہ یہیں پڑا سو رہا تھا۔ لہذا یہ اس کا جنم جنم کا رونا ہے۔ اس کی آواز پر کان لگا کر سنو تو صاف سنائی دیتا تھا: میں سوتا تھا۔

سردانی جی ننگے پیر سٹر پٹر کرتی ایک کمرے سے دوسرے میں جارہی تھیں۔ انہوں نے زور سے پنٹری کا دروازہ بند کیا۔

کمال چونک کر ۳۵ء کے دہرہ دون سے بھی واپس آ گیا۔

سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اس نے جیب سے کنجی نکالی اور گودام کا دروازہ کھولا۔ اندر جا کر وہ الماریوں کو بے دھیانی سے کھولتا بند کرتا رہا۔ صندوقوں میں جھانکا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ملکیت کا کیا مصرف ہے۔ اس نے اس انبار پر نظر ڈالی جسے انسان اپنی ذاتی ملکیت کہہ کر خوش ہوتا ہے اور اس طرح کے سامان کے لپشتارے ابھی گلفشاں اور رکایان پور کی حویلی کے کمروں میں مقفل تھے۔ کمرے کے وسط میں تھوڑی سی خالی جگہ کا جو جزیرہ سا بن گیا تھا اس میں کھڑے ہو کر وہ سوچتا رہا: اس ملکیت کے لیے دنیا مری جاتی ہے! ان سب کے بدلے میں ایک مرگ چھالا، ایک مرگ چھالا!

اب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ لوگ دنیا تج کر جنگلوں میں کیوں جا بیٹھتے تھے۔

پھر اس نے اکڑوں بیٹھ کر کاغذات کی صندوقچیاں کھولیں۔ چاروں طرف رسالوں اور کتابوں اور پرانی تصاویر کے انبار لگے تھے۔ اس نے ''خط و کتابت'' کا ایک ٹوٹا پھوٹا اٹیچی کیس اٹھایا۔ لفافے جن پر عجیب و غریب مہریں تھیں۔ پٹنہ

۱۹۳۳ء۔ بلاسپور ۱۹۲۸ء۔ جھالاوار ۱۹۳۷ء۔ جانے ان خطوں میں کیا تھا اور کن لوگوں نے یہ خط لکھے تھے اور اب وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ مثلاً راس بہاری لال کا خط جو ۱۹۳۴ء میں پیلی بھیت سے آیا تھا اور شکست میں لکھا تھا، یہ صاحب کون تھے اور کیوں تھے؟ اور وشوا نندن پانڈے، رانی کھیت اور محمد احمد عباسی منصف ضلع گونڈہ، فرہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے ''خط و کتابت'' کے صندوقچے واپس ایک الماری میں ٹھونس دیے۔ قالینوں کے انبار کے نیچے فائلیں دبی تھیں۔ مقدمات، زمینیں، مکانات، نان ونفقہ، خالی چنی بیگم کا جھٹم چھٹا جب میر مرغی سے ہوا تھا اس کے سارے کاغذات اور ایک تاریخ اودھ باتصویر جس کا کاغذ اتنا پیلا ہو چکا تھا کہ ہاتھ لگنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ جس کے اولین صفحے پر ہزہائی نس دی آنریبل سر مہاراجہ ڈگپے سنگھ بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی بلرام پور و تلسی پور، صوبہ اودھ کی نہایت مسخرے پن کی قلمی تصویر چھپی تھی اور ان کے قلم سے لکھا ہوا نہایت مقفع و مسجع عبارت کا دیباچہ تھا: ''القصہ ایسی بے التفاتی کی باتوں سے مضطر ہو کر ایک دن عالی جاہ بسبب تحریک مصاحبان سفاہت شعار بغور تائل وفکر و مال اندیشی لباس گیروا فقرا کا پہن کر بعد یے پر بیٹھے رفقائے خاص بھی اسی صورت سے بنے انگشت نمائے خاص و عام ہوئے۔ جناب عالی نے اپنی رفع بدنامی سمجھ کر علی ابراہیم خان کو نواب عالیہ کی طرف سے کہلا بھیجا کہ میں نے بادشاہ کے حکم سے.........''

کمال نے دوسرا صفحہ پلٹا:

''پس صاحبان عالی شان نے سمجھا تسخیر بلاد ہندوستان تو اسی دن ہو چکا تھا۔

شرق سے غرب تک حقیقت کھل چکی تھی لہذا اس زینہ وزارت پر مستقل رہنا چاہیے پھر مدارج سلطنت پر جانا آسان ہوجاوے گا اور یکا یک کسی کے گھر میں چلے نجانا چاہیے اگر چہ اس مین ایک مدت گزر جائے ۔اب یہ سب حقیقت حال اس زمانے کی کھل گئی ۔اتفاق قوم سب کا جاتا رہا۔گویا سب چراغ ہندوستان بجھ گئے ۔"

"انتقال مرزا وزیر علی خان.........بابت ماہ جون ۱۸۱۶ء کلکتہ کے کاسی باغ میں، جہاں ٹیپو سلطان کا بیٹا بھی دفن ہے، مدفون ہوئے ۔چند غربائے شہر وزیر ہند سمجھ کر ساتھ تھے ۔ کچھ شہر کی کسیاں ان کی سخاوت و بیکسی یاد کر کے اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی روتی تھیں ۔صاحب نے حکم دیا گورے قنات کے باہر کھڑے رہیں ۔تابوت پر گوروں کا پہرہ تھا۔اوس عہد میں صاحب ریذیڈنٹ لکھنؤ جان لمسڈن صاحب۔ بنارس میں جان چیری صاحب مقتول نائب تفضّل حسین خان تھے ۔"

"مرزا مظفر بخت شاہزادے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ ایک دفعہ اپنی اولوالعزمی و طمع دنیا سمجھ کر لکھنؤ سے باہر نکلے ۔لکھنؤ کے جو لوگ پریشان حال و معطل تھے ساتھ ہوئے، جب ناکام لکھنؤ پھرے سیلی بیگم منجملہ بی بی ہائے جرنل مارٹن سے نکاح کیا اونہیں کی پنشن میں بسر اوقات رہی ۔بعد گوری بی بی کے مرنے کے انہیں کے مکان میں رہتے تھے ۔"

"جانا کرنل ڈبوا صاحب و فریل صاحب و مولوی محمد اسماعیل کا لندن کو سفارت مع ہدایائے شاہ جم جاہ جارج چہارم.........."

کتاب اس نے ٹوکری مین واپس پھینک دی۔اس کے ہاتھ جو گرد لگ گئی تھی

چند لمحوں تک وہ اسے افسردگی سے دیکھا کیا۔ بہت دیر تک اس نے اپنے ہاتھ نہیں پونچھے۔

یہ سامان کہیں نہیں جائے گا۔ ان سب چیزوں کو ضبط ہو لینے دو۔ اس نے دل میں کہا گودام سے نکلتے ہوئے اس نے ایک بیس سال پرانا گروپ فوٹو فرش پر سے اٹھالیا۔ اس مین بڑے ابا مرحوم ہار پھول پہنے درمیان میں بیٹھے تھے، یہ کسی ضلع کا الوداعی گروپ تھا جس میں بہت سے ڈپٹی کلکٹران او روکلاء قطار میں بیٹھے تھے۔ پیچھے بڑے بڑے درواوزوں والا برآمدہ تھا۔ سکینہ صاحب، رضوی صاحب، ٹھاکر رام نرائن صاحب، مسعود الحسن صاحب، یہ کیسے عجیب لوگ تھے۔ سیدھے سادے۔ شریف۔ بھولے بھالے جعلسازی غالباً ان میں سے کسی کو نہ آتی ہوگی۔ ریکٹ چلانا ان کا مشغلہ نہ رہا ہوگا۔ فراڈ اور چارسوبیس سے یہ حضرات ناواقف تھے۔ کس قدر بے وقوف لوگ تھے۔ ان کے مخصوص طرح کے مذاق ہوتے تھے۔ مخصوص مشغلے۔ مشاعرے۔ مقدمے بازیاں۔ شکار پکے گانے کی محفلیں۔ کیسی پرامن زندگیاں یہ لوگ گزار گئے۔ اسے ان لوگوں کے مذاق یاد آئے۔ رضوی صاحب کی چڑ گلاب جامن تھی۔ ان کے سامنے گلاب جامن کا دونا دھرا ہے اور وہ ہائے توبہ کررہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی توند پر پھبتیاں کسی جارہی ہیں۔ میرٹھ کی نوچندی جانے کے پروگرام بن رہے ہیں، چھڑیوں کے سیلے کا تذکرہ ہے، سالے بہنوئیوں کی چوٹیں چل رہی ہیں، کیسا پرسکون ان کا معاشرہ تھا۔ کمال اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ ہم نے کس طرح ان کی نسل سے خود کو بہتر ثابت کیا؟ بےچارے بوڑھو۔ میں تمہارے آگے شرمندہ ہوں۔ میں تم کو اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتا۔ میں اپنا

منہ چھپا کر دور بھاگ رہا ہوں۔ خدا حافظ۔ اس نے گروپ کو آہستہ سے پھر گودام کے فرش پر گرا دیا اور تالہ لگا کر باہر آ گیا۔

دیواروں میں پرندہ بدستور چلائے جا رہا تھا: میں سوتا تھا......... میں سوتا تھا۔

ارے سوتا بھی تھا تو کیا حرج تھا؟ کمال نے جھنجلا کر دل میں کہا۔ جگ رہا ہوتا تب بھی پرجاپتی تجھے کون بڑا اسکھ عطا کر دیتے مگر پچھتاوے کے احساس اور تو بہ تلا سے بھی تو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ارے میں پوچھتا ہوں آپ ہیں کون چیز، کمال رضا اور سرل ایشلے اور گوتم نیلمبر؟ جو طرح طرح کی ٹرٹر لگا رکھی ہے۔

دلی کے اسٹیشن پر جیجا جی اس کے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ وہ جمنا روڈ آیا۔

لاج برآمدے میں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی: ''مت جاؤ کمن۔ نرمل سورگباشی ہو گئی۔ تنکر سدا باہر رہتا ہے۔ تم پاکستان چلے گئے۔'' روتے روتے لاج وتی کی ہچکی بندھ گئی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ''کاہے روتی ہو؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''روؤ متی۔''

اس کی ٹرین شام کو امرتسر جاتی تھی مگر وہ جلد از جلد لاج وتی کے گھر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جیجا جی کے ساتھ نئی دلی جانے کے لیے تیار ہوا۔

''ارے گوتم کو تو فون کر لو، وہ چندی گڑھ گیا ہوا تھا، شاید لوٹ آیا ہو۔'' جیجا جی نے کہا۔

کمال نے بے دلی سے ٹیلیفون ڈائریکٹری اٹھائی اور اوراق پلٹنے لگا۔ بہت

سے جانے پہچانے نام صفحات پر ابھر آ رہے ہیں۔ مس صولت رحمٰن، فلم ڈویژن، مس کملا اسپال، منسٹری آف ایکسٹرنل افیرز۔

اس نے صفحے پلٹے تروالا، ہریش چند، نرائن ایم جے، نیلمبر، گوتم..... اس نے نمبر ڈائل کیا۔

''ہلو..... ارے تم یہیں موجود ہو۔ الو کے..... پٹھے'' اس نے بے حد کوشش کر کے نارمل بشاش آواز میں بات شروع کی۔ ''ابے یار.......... ہاں ہاں۔ آج ہی صبح دہرہ دون سے.......... ہیں؟ ہاں ڈھاکہ سے آ رہا ہوں بذریعہ ریل گاڑی۔ لکھنؤ میں؟ ہاں۔ اپی نے تم کو دعا کہلوائی ہے۔ ہاں..... ہاں مزے میں ہیں۔ سب مزے میں ہیں الامیرے۔ کیا کہا میں نے؟ کچھ نہیں میں کہہ رہا تھا میں بھی بہت ٹھاٹھ کر رہا ہوں آج کل۔ نام بنام سب کی خیریت بتاؤں؟ پوچھو..... قدیر اور قمرن؟ بھئی واہ۔ تم کو خوب یاد رہے۔ تم کو کون چیز یاد نہیں ہے؟ سب یاد ہے؟ تمہارا حافظہ بہت تیز ہے ماشاءاللہ قدیر تو زمانہ ہوا مرزاپور واپس چلے گئے۔ موٹر کب کی بک گئی۔ کیوں بک گئی؟ اجی یہاں زندگیاں ہی بک گئیں۔ تم ایک موٹر لیے پھرتے ہو۔ تم نہیں بکے؟ ہاں ہاں میں کب کہتا ہوں میں تو اپنی بات کر رہا تھا۔ قیمت اچھی مل رہی تھی۔ یونہی کا وقت تھا۔''

''اور پوچھو۔ کس کس کی خیریت دریافت کرنا ہے۔ چھٹکی۔ رم دیا؟ غضب خدا کا، تم کو چھٹکی اب تک یاد ہے؟ اس غریب کا انتقال ہو گیا۔ ہاں بڑا افسوس ہوا۔ کیسے؟ برسات میں گلفشاں مرحومہ کے باغ کی گھاس کھود رہی تھی، سانپ نے کاٹ لیا۔ ہاں کئی سال ہو گئے اسے مرے۔ گنگا دین تو آج کل کہیں مدھیہ

پردیش میں ٹریکٹر چلا رہا ہے۔اس نے اپنی بتارہی تھیں ایف۔اے۔ پاس کرلیا ہے ہاں۔اسے اصل ترقی کہتے ہیں۔ میں گنگادین کے کیریر کا احوال سن کر بہت خوش ہوا اور باتیں کروں؟ نہیں میں تم سے مل نہیں سکتا۔ مجھے فرصت نہیں۔ ہیں؟ تمہاری کانفرنس تین بجے ختم ہوگی، اس کے بعد تم میرا انتظار کروگے، اولپس میں؟ کیا کروگے انتظار کرکے۔نہیں۔ میں کسٹوڈین سے ملنے جارہا ہوں پی بلاک۔ اس کے بعد۔اچھا دیکھو پہنچنے کی کوشش کروں گا۔مگر میرا زیادہ انتظار نہ کرنا۔اچھا سولونک۔''

کمال نے ٹیلیفون بند کردیا۔لاج وتی دروازے میں کھڑی تھی۔''اچھا اب میں چلا۔''

''جلدی آنا۔''

''ہاں ہاں۔''

''تمہارے ناشتے کے لیے کیا کیا بنادوں۔''

''وہی سب جو ہمیشہ بناتی ہو۔'' وہ ذرا جھنجھلا کر بولا۔تم یہ اپنا بہنوں کی محبت والا جال پھیلاتی رہو۔میرا دل اس سے تھوڑا ہی پسیج سکے گا۔نہ میرے قدم ڈگمگائیں گے، میں مضبوط ہوں، میں بوڑھا ہوں مجھ میں ضبط اور توازن اور سکون ہے۔اس نے دل میں کہا۔

وہ جمنا روڈ سے نکلا۔علی پور روڈ، کشمیری گیٹ۔سینما کے بڑے بڑے اشتہار، لال قلعے کا میدان، دکانیں، نئے نئے بازار، کناٹ پلیس پہنچ کر وہ دکانوں میں رکھی ہوئی نئے ہندوستانی مصوروں کی پینٹنگز دیکھتا پھرا۔ برآمدے میں سے

گزرتی ہوئی ایک لڑکی میں اسے سریکھا کی جھلک نظر آئی، وہ ذرا آگے بڑھا، وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی تین بجنے میں بہت دیر تھی۔ سارا دن باقی پڑا تھا۔ سریکھا ہی سے چل کر مل لوں۔ اس نے کاہلی سے سوچا۔

''یہاں ڈانس اکیڈمی کا پتا بتا سکتے ہیں۔''اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

''کون سی ڈانس اکیڈمی؟ یہاں بے شمار ڈانس کالج ہیں۔ آپ سنگیت اکادمی تشریف لے جایئے، وہاں سے آپ کو شریمتی سریکھا دیوی کا پتا معلوم ہو جائے گا۔'' اس نے یہ ارادہ بھی ترک کیا۔ اپنے جانے پہچانے کناٹ پلیس میں وہ اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا۔ موٹر کاروں، خوشحال، مطمئن انسانوں، مصروف کاروباریوں، عظیم الشان دکانوں کے وسط میں کھڑے ہوئے اسے بے حد ڈر لگا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ جانے سے پہلے اسے سول لائنز کے تھانے میں جا کر اطلاع کرنی ہے کہ وہ ہندوستان سے جا رہا ہے۔

بھادوں کے مہینے کی دھوپ بڑی سخت تھی، وہ بہت مضطرب، بہت تھکا ہوا تھا، وہ چاہتا تھا کہ پر لگا کر کراچی واپس پہنچ جائے۔ اس نے طے کر لیا اب وہ ہندوستان کبھی نہیں آئے گا۔

''وہ دیکھو سامنے سے کون آتا ہے؟''اس نے ڈاکٹر ہینس کریمر کو دیکھ کر مصنوعی بشاشت سے کہا۔ دل میں خوش بھی ہوا کہ پہاڑ سی دوپہر ان کی سنگت میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔

''ہلو۔ ہلو۔ مائی ڈیئر بوائے۔'' ڈاکٹر ہینس کریمر نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔''کیا عجیب اتفاق ہے۔''

ان کے ساتھ انفرمیشن ڈویژن کی ایک لڑکی تھی۔ اس نے متانت سے کمال کے سلام کا جواب دیا اور ایک پمفلٹ سے پنکھیا جھلتی رہی۔

''بڑی شدید گرمی ہے۔'' ڈاکٹر ہینس کریمر نے خوشی سے باغ باغ ہوتے ہوئے کہا۔

''بالکل خالص مشرقی موسم!!''

کمال بھی تکلفاً ہنسا۔

''میں ڈاکٹر کو قومی میوزیم لیے جا رہی ہوں۔ آپ بھی چلئے اگر آپ کو اور کوئی کام نہ ہو۔'' لڑکی نے، جس کا نام شاید کماری ارونا باجپئی تھا، کمال کو مخاطب کیا۔ کمال نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر نرملا زندہ ہوتی تو آج وہ بھی اسی طرح کام میں مصروف ہوتی۔

''جی ہاں۔ ضرور۔'' اس نے جواب دیا۔

براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے دو اور یورپین دانشوروں کو ہمراہ لیتے ہوئے وہ راشٹر پتی بھون روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر ہینس کریمر اور ان کے ساتھی اسی دنیا کے باسی تھے جس مین کمال کچھ عرصہ قبل خود شامل تھا۔ ان کا بھی زندگی سے وسیع تر آوٹ لک تھا۔ اُنہین بھی چیزوں میں رمزیت نظر آتی تھی۔ ان کے پاس بھی علم کے علاوہ ادراک تھا، یہ بدھ جینتی کے لیے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور سری نگر کے ایک ہاؤس بوٹ میں رہ کر ہندوستانی فن سنگتراشی پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے ان ہی کی طرح دوسرے ملکی اور غیر ملکی دانشور ان کے یہاں جاتے، یہ ہاتھ ملتے جاتے اور فرش پر کشن اور چٹائیاں بچھاتے اور سبز چاء تیار

کرتے اور کپل کا تذکرہ ہوتا۔ ''ابھی میں راہل سنکرائتن سے ملنے الموڑے گیا تھا۔'' ڈاکٹر کریمر نے کمال سے کہا۔

''خوب۔''

''مارگ میں میرا نیا مضمون ضرور پڑھنا۔''

''ضرور''

''تم ملک راج سے واقف ہو۔''

''جی ہاں۔''

پھر انہوں نے دوسرے ناموں کا ذکر شروع کیا: ہمایوں کبیر۔ تارا علی بیگ۔ ذاکر حسین۔ کارل کھنڈالا والا۔ کمال موٹر کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

راشٹرپتی بھون کی سیڑھیوں پر پہنچ کر ڈاکٹر ہینس کریمر نے ہاتھ ملتے ہوئے نظریں اوپر اٹھائیں اور سونے کے شیروں کے نیچے لکھا ہوا ''سیتہ میو جیتے'' بآواز بلند پڑھا۔ ''سچ جیتے گا۔'' انہوں نے کمال کی خاطر اس کا ترجمہ کیا اور ذرا کی ذرا آنکھیں بند کرلیں پھر وہ سب کماری ارونا کی قیادت میں اندر داخل ہوئے۔ سابق وائسریگل لاج کے عظیم الشان مرمریں ایوانوں میں بے اندازہ خنکی تھی جو باہر کی کڑی دھوپ کے مقابلے میں بہت آرام دہ معلوم ہوئی۔ عہد عتیق اور قرون وسطی کے مجسموں نے کمال کو اپنی بے نور آنکھوں سے گھورنا شروع کیا۔ ڈاکٹر ایک ایک مجسمے کے سامنے ٹھٹھک کر فرانسیسی یا جرمن میں تبادلہ خیالات کرتے۔ دربار ہال میں وائسرے ہند کے تخت کی جگہ مہاتما بدھ کا شاندار قدیم مجسمہ ایستادہ تھا۔ اس کے پس منظر میں عنابی رنگ کے مخملیں پردوں کا آبشار سا گر رہا تھا۔ کمال

تخت کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف برٹش میوزیم کا سا ماحول طاری تھا۔

''یہ تو عارضی میوزیم ہے۔'' اس کے قریب آ کر کماری ارونا نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔ ''ہمارا زیرِ تعمیر قومی عجائب خانہ ہمارے ورثے کے شایانِ شان ہو گا۔''

''جی...... یقیناً.............'' کمال نے جواب دیا۔ سال بھر قبل وہ خود اسی دلی میں ٹام سے اسی لہجے میں باتیں کرتا رہا تھا۔ آپ نے ہماری تازہ ترین عمارات دیکھیں؟ ریزرو بنک آف انڈیا............ اور...... اخباروں کے دفاتر کی فلیٹ اسٹریٹ جو بننے والی ہے اور اسوکا ہوٹل............ کماری ارونا نے بحیثیت ایک فرض شناس انفارمیشن آفیسر اس سے پوچھا۔

''جی۔'' کمال نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ خود بھی یہیں کا رہنے والا تھا

''آیئے ادھر چلیں۔ آپ نے ہمارے موہن جوڈارو کی قدیم تہذیب کی ''ڈانسنگ گرل'' دیکھی؟''

کماری ارونا اسے سنگ مرمر کی گیلریوں میں گھماتی پھری چین ہو دارو۔ موہن جوڈارو وادی سوات۔ ہڑپہ۔ ٹکشلا۔ روپڑ۔ اب ہم موجودہ زمانے کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ اس نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ''یہ پتھر دیکھیے، یہ اشومیدھ تیسری صدی قبل مسیح میں دہرہ دون کے علاقے میں منعقد کیا گیا، یہ اہی چھتر کے مجسمے ہیں۔ اہی چھتر کو اب ضلع بریلی کہتے ہیں۔'' اس نے مڑ کر ہینس کریمر سے کہا

جو اس دوران ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک عورت کے مجسمے کے سامنے آئے۔ archaic وضع کا تھا۔ ''یہ شرواستی کی کھدائی سے اسی سال نکلا ہے۔'' ایک لڑکی کدم کی ٹہنی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔ ''سرخ مٹی کی اس مورتی کا سنہ غالباً چوتھی صدی قبل مسیح ہے۔'' ڈاکٹر ہینس کریمر نے اپنا مسودہ نکال کر پروفیشنل آرکیالوجسٹوں کے انداز میں اپنے فرنچ ساتھی سے کہا۔

وہ ٹھنڈے فرش پر مورتی کے آگے بیٹھ گئے۔ مورتی کے نقوش میں قوت تھی، زندگی کی سرخی اور تپش۔ ماورائے حیات کے بجائے حیات۔ زمین کی اپنی تخلیق۔ اس کی بانہیں بہت گداز تھیں۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی، جسم مضبوط اور سڈول، خطوط اور حجم اور توازن شانت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج، ایک لرزہ خیز حسن پتھروں سے تشکیل ہوا ہے: بھاری، منجمد، خوفناک، موسیو راول نے ایٹس کی مانند کہا۔

''فن سنگتراشی کے آئندہ نظریوں کی داغ بیل یہیں سے پڑی۔'' ڈاکٹر کریمر نے کہا۔ ''یہ متھرا سے پہلے کا نمونہ ہے۔ اب ہمیں اس فن کی تاریخ کے متعلق بہت سی تھیوریز کو بدلنا پڑے گا۔''

''اس عہد کے فن کاروں کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہو گا کہ خیال محض علامت کے ذریعے دیکھنے والے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی نظریے نے ویدوں کے عہد کے بعد اصنام پرستی کی ترویج کی۔'' ارونا نے اظہار خیال کیا۔

روپ اور اروپ اور بھاؤ اور ابھاؤ کے متعلق وہ جو کچھ جانتا تھا اب وہ کس سے

کہنے جائے گا۔ اس سارے علم کا اسے اب کوئی فائدہ نہیں۔ کمال نے سوچا۔ اس حیرت انگیز مورتی کے پاس اس کے لیے کوئی پیغام نہیں۔

"ویدانت کے نزدیک خالق جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آنند ہے۔" ڈاکٹر راول نے کہا۔ "بجلی کی طرح اکھنڈ ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ خود ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی سوپرکاش ہے۔ جس طرح فن کار کا تصور وشوا کرمن کے تصور میں شامل ہے اسی طرح دیکھنے والا آتمایا خود میں موجود ہے جو ہمہ وقت دیکھتا ہے اور جس کا سروپ ساری کائنات کا مظہر ہے۔ وشوا روپ روپم روپم پرتی روپ۔ تمہارا کیا خیال ہے ویدانت کے اس نظریے کے متعلق؟ تمہیں یہ مجسمہ اچھا لگا یا تم متھرا کے اسٹائل کو ترجیح دو گے؟" ڈاکٹر موصوف نے مڑ کر کمال سے پوچھا۔

"بھوکشتم ناپرتی بھاتی کم چت۔ (بھوکے کو کوئی شے اچھی نہیں لگتی) میں جمالیات اور ما عبدالطبیعیات کی موشگافیاں کرنے سے قاصر ہوں۔" اس کی آواز کی بے پناہ تلخی اور اداسی نے سب کو چونکا دیا۔

"یہ کمیونسٹ ہے۔" ڈاکٹر آئیورٹ نے طے کیا۔

اس کے فرسٹریشن کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کماری ارونا نے سوچا جو امریکہ سے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا اور سوچا۔

پڑھا لکھا لڑکا ہے اور کتنا خوش شکل۔ "آپ سنسکرت بھی پڑھ چکے ہیں۔" اس نے توصیفاً پوچھا۔

"پڑھی تھی ایک زمانے میں۔" کمال نے مختصر جواب دیا۔

پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ کسٹوڈین سے ملنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔

وہ مورتی کے چبوترے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مورتی کا پتھر خنک تھا۔ پتھر جو become timeless کی علامت ہے۔ حال کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ جو پتے پچھلے کلپوں سے بہتے ہوئے آ رہے ہیں، وہ اب ان کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اس نے دل میں سوچا۔ جبھی سے تو میں کہتا ہوں، ایک کدال لے کر ان پتوں، اس کوڑے کرکٹ کی صفائی کر دو۔ آج کل میں صفائی میں لگا ہوں: دماغ کی، دل کی، ذہن کی، عقل کی صفائی، اسپرنگ کلیننگ۔ اس ماضی سے میں ناطہ توڑ چکا ہوں۔ اس نے ان یورپین ماہرین کو بتانا چاہا، پھر وہ مورتی کی طرف مڑا۔ اسی لیے، شرواستی کی سدرشن یکشنی! جو کوئی بھی تیرا بنانے والا تھا وہ اپنا پیغام مجھ تک نہیں پہنچا سکتا۔ تیرا خالق اب مجھ سے کمیونی کیٹ نہیں کرے گا۔ میں روپ اور اروپ کی بحث میں حصہ لینے سے انکار کرتا ہوں، یہ قومی عجائب خانہ مع سارے ماضی، سارے ہندوستان کے میں نے کماری ارونا کو سونپا، وہ وہاں سے آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ آگے چلتا ہوا گیلری عبور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کانوں میں یورپین دانشوروں کی آواز آتی رہی۔

"کاش ہم جان سکتے کہ سنگتراش کا نام کیا تھا جس نے یہ مورتی بنائی۔ مگر اس عجیب و غریب ملک میں تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں۔" ڈاکٹر کریمر کہہ رہے تھے۔ "واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ حقیقت روایت ہے۔ وقت کا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لمحہ لافانی ہے۔ انسان گمنام ہے، اس کی تخلیقات، فن پاروں، تصنیفات کی بھی ابدیت کے اس سمندر میں کوئی علیحدہ حیثیت نہیں سمجھی جاتی۔"

"ہاں۔" موسیو راول نے کہا۔ "انسان مر جاتا ہے تو اس کو جلا دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تاریخی معنویت کچھ نہیں۔"

"کوئی کرائس ہندوستانی ذہن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی کرائسس بھی وقت بھی شامل ہے، تاریخ نہیں ہے۔ ماضی، مستقبل، فنا، بقا..... کسی شے کا وجود نہیں لہذا اب اس جسم کو جلا دو کیونکہ یہ اب حال میں شامل نہیں رہا۔" ڈاکٹر اسٹیوارٹ نے کہا۔

"اسی لیے مشرق کے فن کار نے اپنا نام ثبت کرنے کی ضرورت کبھی نہ سمجھی۔ کاش ہم ان سنگتراشوں کے متعلق بھی کچھ جان سکتے۔" ڈاکٹر کریمر نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "یہاں کتنے مائیکل اینجلو اطمینان سے ہنسی خوشی گمنام مر گئے!؟"

کمال گیلری سے باہر نکل آیا۔

"یہ احساس کہ ہم خود وقت ہیں۔" موسیو راول کہہ رہے تھے۔

"وسعت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ وقت کو صرف سوچا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر کریمر کہہ رہے تھے۔

کمال سیڑھیاں اتر کر باہر سرخ بجری کی چوڑی سڑک پر آ گیا اور پی بلاک کی طرف روانہ ہو گیا۔

کسٹوڈین سے دماغ کھپانے کے بعد وہ گوتم نیلمبر سے ملنے الپس نہیں گیا، وہ سیدھا لاج کے گھر پہنچا اور اس نے لاج سے کہا، اگر میرا فون آئے تو کہہ دینا میں ابھی واپس نہیں آیا ہوں، پھر وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے اسٹیشن جانے کے وقت تک پڑا سوتا رہا۔

گوتم ایک گھنٹے تک ریسٹوران میں کمال کا منتظر رہا۔ اس نے کئی جگہ ٹیلیفون کیے، جب کمال کی طرف سے بالکل نا امید ہو گیا تو پھر اپنے دفتر لوٹا۔ بدھ جینتی کے سلسلے میں حکومت بڑے زوروں کی پبلسٹی کر رہی تھی اور اسے چراغ جلے تک دفتر میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ ایک انتہائی ضروری اور فوری فائل کے سلسلے میں اس نے اپنی نمبر ٹو کماری ارونا باجپئی کو فون کیا۔

مگر معلوم ہوا کہ کماری ارونا باجپئی ڈاکٹر کریمر کو لے کر نیشنل میوزیم گئی ہوئی ہیں۔

لاحول ولاقوۃ! اس نے غصے سے کہا۔ کمال سے نہ مل سکنے کی وجہ سے وہ بے حد مضمحل تھا۔ اسے اس ملک پر اپنے آپ پر، کمال پر، دنیا کی ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو ڈاکٹر کریمر اور ڈاکٹر اسٹیوارٹ اور کماری ارونا باجپئی............ان سب کو کچا چبا ڈالتا۔

فائل بے حد ضروری تھی اور اسی جلد از جلد محکمے کے جوائنٹ سیکرٹری کو پہنچانا تھا، وہ کار میں بیٹھ کر راشٹر پتی بھون پہنچا۔ میوزیم کے اندر جا کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ بے دھیانی سے وہ کمروں میں گھومتا رہا۔

ایک مورتی کے سامنے انفرمیشن ڈویژن کے پمفلٹ پڑے تھے جو شاید ڈاکٹر کریمر یہاں بھول گئے تھے۔ گوتم نے جھک کر وہ اٹھائے، پھر اس نے بے دھیانی سے مورتی کو دیکھا۔ شراوتی کی سدرشن یکشنی۔

اس کی شکل بھیلا کیسی تھی؟ اس نے دفعتاً سوچنا شروع کیا، پھر اس نے غصے

سے چلتے چلتے مرمریں فرش پر ذرا زور سے پیر پٹخے۔ تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو
میں نے تمہیں کبھی کچھ بھی نہیں سمجھا۔ میں تو تمہاری شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل
تو محض ہیولی ہوتا ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے اسے صرف
وشواکرمن ہی پہچان سکتا ہے۔

مورتی، جو شراوستی کی کھدائی میں برآمد ہوئی تھی، کدم کی ٹہنی جھکائے اپنی بڑی
بڑی آنکھوں سے اسے دیکھا کی۔ گوتم نے اس کے قریب جا کر اس کے چہرے کو
چھوا۔ archaic سنگتراشی کا اچھا نمونہ ہے، اس نے دل میں کہا۔ کلچرل پبلسٹی
کے رسائل میں اس تازہ دریافت کے متعلق ایک مضمون ہو جانا چاہیے۔ اس نے
ایک مستعد اور فرض شناس پبلسٹی ایکسپرٹ کی طرح سوچا، پھر باہر نکل آیا۔

شام پڑے کمال لاج کے گھر سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔

''ابھی ٹرین میں دیر ہے۔ آؤ تمہیں گھما لائیں۔'' چچا جی نے تجویز کیا۔ ''تم
دن بھر گھام میں مارے مارے پھرے ہو اب تازہ ہوا کھاؤ گے طبیعت ٹھیک ہو
جائے گی۔'' وہ پہاڑی پر گئے۔ حد نظر تک نئی بستیوں کی روشنیاں تیزی سے جگمگا
رہی تھیں۔ پٹیل نگر آزاد نگر، قرولباغ، رج کے علاقے میں کالجوں کی دنیا میں چہل
پہل تھی۔ یونیورسٹی، میرانڈا ہاؤس، سینٹ اسٹیونز، بے شمار نئے کالج بن گئے
تھے۔ سپرو ہال میں بڑے غلام علی خاں کا کونسرٹ ہو رہا تھا۔ ایک تھیٹر میں ہیر
رانجھا کا اوپیرا دکھایا جا رہا تھا۔ آرٹ گیلریوں میں نمائشیں منعقد ہو رہی تھیں۔
بڑی بڑی دکانوں پر ساریاں پہنے، جوڑے باندھے سیلز گرل باوقار انداز میں
سامان فروخت کر رہی تھیں۔ برلا مندر کے سامنے ہجوم تھا۔ اوپر سنگ مرمر کے

فرش پر جگہ جگہ لوگ منہ کے بل پڑے ہوئے تھے۔

لکشمی نرائن کی بھدی، بدذوق، خالص مڈل کلاس بنیا مورتیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجمعے کو دیکھ رہی تھیں۔اوپر گیتا بھون میں ہارمونیم پر کیرتین ہو رہا تھا، چاندنی کے فرش پر مڈل کلاس عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ جامع مسجد کے سامنے شکستہ حال مسلمان اپنی دکانیں لیے بیٹھے تھے۔

''دلی دنیا کے خوبصورت ترین دارالسلطنتوں میں سے ہے۔'' کار میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی لاج خوشی سے کہہ رہی تھی۔''کل امریکن سفیر کی بیوی روشن آرا ءکلب میں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ تو واشنگٹن کی طرح خوبصورت ہے اور ٹوکیو کی طرح ترقی یافتہ......اور پرانی دلی کو دیکھ کر لندن کی گلیاں یاد آتی ہیں۔تم تو دنیا گھوم آئے ہو،ٹھیک ہے یہ بات؟''

راج گھاٹ میں لوگوں کے غول ہوا خوری کر رہے تھے۔فوارے چل رہے تھے ایک بوڑھی عورت گاندھی جی کی سادھی کے سامنے سجدے میں پڑی تھی۔

ٹرین کا وقت ہو گیا، وہ لاج اور جیجا جی کو خدا حافظ کہہ کر کمپارٹمنٹ میں بیٹھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ اسٹیشن سے باہر نکلی۔ جمنا کا پل۔ لال قلعے کی دیواریں۔ بازار۔سڑکیں۔مکانات۔وہ کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔وہ جا رہا ہے۔

براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے زینے پر رکھا ہوا نٹ راج کا عظیم الشان مجسمہ۔جامعہ نگر۔نظام الدین اولیاء۔متھرا روڈ۔سب یہیں رہ جائے گا۔زندگی جاری رہے گی۔ایک آدمی کے نکل جانے سے کوہی فرق نہیں پڑتا، یہ لوگ اب مختلف تھے۔ دوسرے راستے پر جا رہے تھے، ان کے اور کمال کے پاس اب کوئی موضوع

مشترک نہیں۔ اسے اب ان سے کوئی غرض نہیں، وہ بھی اب کمال کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کریں گے۔

پریس کلب میں دنیا بھر کے اخباروں کے نمائندے جمع تھے۔ لوک سبھا میں پنڈت نہرو تقریر کر رہے تھے۔ جامعہ نگر میں اردو ڈرامے پر ریسرچ کی جا رہی تھی۔ للت کلا مندر میں سریکھا دیوی رقصاں تھیں۔

موسیقی۔ تھیٹر۔ مووی۔ ڈوکومنٹری فلمز۔ بچوں کے تھیٹر اور ہسپتال۔ عورتوں کی یونیورسٹیاں۔ فیشن شوز۔ بلیے یونیورسٹیوں کی ائیر کنڈیشنڈ لائبریریاں۔ دوسرے پانچ سالہ پلان کے بلیو پرنٹ۔ بھاری انڈسٹری۔ افلاس۔ سوشلسٹ اسٹیٹ۔ نئی دلی کے انتہائی پوش ریستوران۔ امپریل دلی۔ سوشلسٹ دلی۔ ضلعوں کی کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خواتین۔ سادھو اور بھکاری۔ بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے قصبے اور گاؤں۔ بھودان کی تحریک۔

قدسیہ باغ، روشن آراء باغ اور بیلا روڈ پر ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اولڈ سول لائنز کی کوٹھیوں میں پھول کھلے تھے۔ ان کے گھاس کے قطعوں پر پرانے زمانے کے کائستھ خاندانوں کے چند افراد بیٹھے طباطبائی کی شاعری پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

نیشنل فزیکل لیبارٹریز کی عظیم الشان ائیر کنڈیشنڈ گیلریوں میں سے سائنس دان لڑکیاں سرعت کے ساتھ نکل کر الٹرا ماڈرن سیلف سروس کیفے ٹیریا میں داخل ہو رہی تھیں۔ نئی دلی میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ روشن آراء کلب کے وسیع لان پر پنکھوں کے نیچے چند اعلیٰ عہدے داروں اور سیٹھوں کی بیبیاں تاش کھیلنے

میں مصروف تھیں۔

ٹرین اب کھیتوں میں آ گئی ہر سفر میں بڑی معنویت ہے۔ ہمارا ادھر سے ادھر جانا۔ ایک مرتبہ گوتم نے کہا تھا جب وہ بقول طلعت خلیل جبران کے المصطفیٰ کی طرح مکالے ادا کیا کرتا تھا۔

ہندوستان کا سارا سمبل سفر ہے۔ چلتے رہنے، تلاش کرنے کی عادت............ شاید اشپنگلر نے لکھا تھا۔ اس نے رادھا کرشنن کی کتاب اٹھائی:

''ہندوستانی فلسفے میں کوئی کسی کو حکم نہیں دیتا: یہ ضرور کرو یا یوں تم کو کرنا پڑے گا۔

یہاں انسان اپنے فعل کو خود مختار ہے۔''

اس نے کتاب کھڑکی سے باہر پھینک دی اور سیٹ پر لیٹ گیا۔

پنجاب کے اسٹیشن گزرتے رہے۔ انبالہ، لدھیانہ، امرتسر، دیواروں پر اردو میں فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ پلیٹ فارم کے دھلے ہوئے فرش پر سکھ عورتوں کی رنگین شلواریں رات کی روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔

صبح ہوئی۔ ٹرین امرتسر پہنچ رہی تھی۔ جگہ جگہ مسلمان پیروں کی زیارات تھیں جو سنسان پڑی تھیں۔ سکھ عورتوں کے غول پگڈنڈیوں پر سے گزر رہے تھے۔ سکھ ہلوا ہے کھیتوں میں پہنچ چکے تھے۔ جگہ جگہ اب بھی مکان جلے ہوئے پڑے تھے۔ امرتسر کے پلیٹ فارم پر شکستہ حال برقعہ پوش عورتیں اور بوڑھے ساکھوں کے ادھر ویزا پر دستخط ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ایک موٹا سکھ افسر ایک غریب مسلمان عورت سے درشتی سے پوچھ رہا تھا: ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''امینہ، یہ میری بیٹی سکینہ ہے، یہ پاکستانی ہے۔ میں خورجے سے اسے لینے آئی ہوں۔ اس کا باپ مر رہا ہے۔'' پاکستانی سکینہ اپنی بھارتی ماں امینہ سے علیحدہ، سلاخوں کے اس پار کھڑی، سہمی نظروں سے افسر کو دیکھ رہی تھی۔ ''اس کا وی جا ٹھیک ہے نا'' ماں پر امید آواز سے پوچھ رہی تھی۔

ٹرین چلی۔ دونوں طرف کے سپاہی ڈبوں میں چڑھے۔

یکا یک دوسرا ملک شروع ہو گیا۔ دوسر دار جی گھاس پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔

میں اب پاکستان میں ہوں۔ ہندوستان سے آیا ہوں۔ مہاجر۔ یو۔ پی کا مسلمان۔

مہاجر............ پناہ گزین............ بے خانماں۔

جب ٹرین نے بارڈر کراس کیا تو وہ، جو اتنے دنوں سے اپنی ساری ہمت صرف کر کے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا، کھمبے کے پاس ایک سردا جی کو کھیسیں نکالے، بندوق تانے کھڑے دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہم سفر، جو پولیس کا افسر تھا اور امرتسر سے واپس جا رہا تھا، اسے غور دیکھ رہا ہے۔

کمال بہت پشیمان ہوا اور اسے لگا جیسے پولیس افسر کہہ رہا ہے: تم اب تک دو متضاد وفاداریوں کے دوراہے پر کھڑے ہو، لعنت ہو تم پر۔

اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہیں۔ تم ہندوستانی ہو، ہندوستانی جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے بھی یہی آواز نکل رہی ہے:

جاسوس۔غدار۔جاسوس غدار۔اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ٹرین آہستہ آہستہ لاہور اسٹیشن کے کسٹم کی سلاخوں والے حصے میں داخل ہو رہی تھی۔اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

لاہور سے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ہوائی جہاز نے کراچی کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیا۔

اب اس کی نئی زندگی اس کے سامنے تھی۔اس نے ڈائری نکالی۔کراچی واپس پہنچ کر اسے کتنے ضروری کام کرنے تھے۔چچا فلاں سے کلیم کے متعلق سفارش کرانا تھی۔کوٹھی کے لیے بلیک سے سیمنٹ اور لوہے کا انتظام کرنا تھا۔مسٹر ایکس کو جم خانہ میں ایک پارٹی دینا تھی۔بتاؤ میں کہاں جاؤں، اس نے خود سے سوال کیا۔خراب، انحطاط پذیر سوسائٹی میں انسان کا شریف رہنا کہاں تک ممکن ہے؟ اس مسئلے پر سوچنے کی ضرورت تھی۔اس نے ایئر ہوسٹس سے پھر کافی منگوائی اور ڈان اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

کابینہ میں کرائسس۔وزیر اعظم کا استعفیٰ۔نئے وزیر اعظم کا جہانگیر پارک میں ملت سے خطاب۔اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔آسمان پر بادل تیزی سے پھیلنے لگے۔کوئی دم میں بارش شروع ہو جائے گی۔

اس نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

میں ہی لاش ہوں اور میں ہی گورکن اور میں ہی نوحہ گر۔اس نے دل میں کہا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

۱۰۱

کچی سڑک پر لڑکا بیل گاڑی ہانکتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک اسٹیشن ویگن دھواں چھوڑتی، دھول اڑاتی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک بیل گاڑی اور آ رہی تھی۔ گاڑیبان نے بیل کی دم مروڑ کر موٹر والوں کو ڈانٹا۔ ''دیکھ کر نہیں چلات ہو موٹریا۔ ابھی جو ہمرا بیل چمک جایت۔'' امریکن اخبار نویس نے فوراً کیمرہ نکال کر اس کی تصویر لے لی۔ پیچھے پیچھے ایک اور موٹر آ رہی تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی مسز راج واڑے نے منڈیا نکال کر جھانکا اور پھر لیڈی کملیش ورما سے باتوں میں لگ گئیں۔ شراوستی ابھی بہت دور تھا۔ سورج بادلوں میں چھپا جا رہا تھا اور بارش سر پر کھڑی تھی۔ ڈاکٹر راول نے اگلی اسٹیشن ویگن میں بیٹھے ہوئے کماری ارونا باجپئی سے پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ اس نے فوراً پبلیکیشنز ڈویژن کی کتابوں کا بنڈل ان کی ناک میں ٹھونس دیا اور سوالات سے بچنے کے لیے نٹنگ میں جٹ گئی۔ تیسری موٹر میں لنکا اور جاپان کے چند بھکشو لدے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی فلمز ڈویژن کا کیمرہ مین تھا۔ دو تین کسان لڑکیاں منڈیر پر کھڑی اس قافلے کو دیکھتی رہیں پھر ارہر کے کھیت میں کود کر کام میں لگ گئیں۔ دوسری طرف ٹریکٹر چل رہے تھے۔ سامنے کی موٹر میں بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں نے جن گن من گانا شروع کر دیا پچھلی سیٹ پر زور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اس سارے ہنگامے سے بے نیاز گوتم نیلمبر نے، جو اب تک موٹر چلا رہا تھا، مڑ کر کماری ارونا باجپئی سے کہا:

''اگر وہیل تم لے لو تو میں یہاں سے اتر کر پیدل اپنے گھر چلا جاؤں۔''

''کیا بہت بور ہو گئے؟'' کماری ارونا نے پوچھا۔ اسے خود سفر کی تکان کی وجہ سے نیند آ رہی تھی۔

''ہاں میں یہیں سے کھیتوں کھیتوں نکل کر چلا جاؤں گا، شارٹ کٹ سے۔ ذرا جا کر نہا دھو کر آرام کر لوں۔ صبح سے پھر یہ سارا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ موسیو راول اگر آپ اجازت دیں۔'' اس نے فرنچ مصنف کو مخاطب کیا۔

اس نے موٹر روکی اور اتر کر منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ موٹریں ایک ایک کر کے دھول اڑاتی آگے نکل گئیں۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ بارش کا ایک قطرہ ٹپ سے اس کے بالوں پر آن گرا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر ہوا کو سونگھا اور ارہر کا ایک ڈنٹھل توڑ کر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ اس نے پھوار سے بچنے کے لیے آم کے ایک گھنے جھنڈ میں پناہ لی۔ درخت کی جڑ پر بیٹھ کر وہ دیر تک ہوا اور پتوں کے سنگیت سنا کیا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے پھر اپنا راستہ طے کرنا شروع کیا۔ حد نظر تک کھیت لہلہا رہے تھے۔ شہر ابھی بہت دور تھا۔

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہو چکی تھی گو اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے۔ اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد

کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بیلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں۔ برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے۔ سارس اور مور سمٹے سمٹائے اداس کھڑے تھے۔ چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھتا رہے تھے۔

بہرائچ کے مضافات شروع ہو گئے۔ سول لائنز کی سایہ دار سڑک پر پہنچ کر وہ اپنے باپ کی زرد رنگ کی دومنزلہ کوٹھی میں داخل ہوا۔

اس کے بابا سر دیپ نرائن لان پر ٹہل رہے تھے۔

''ہلو بیٹے۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں سمجھتا تھا۔ تم غیر ملکی مہمانوں کو لے کر سیدھے سہت مہت چلے گئے۔''

''جی نہیں بابا۔'' اس نے جھک کر ان کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔ ''پہلے راستے میں ان کو ہم فارم دکھانے لے گئے تھے۔ ان لوگوں کو سوائے فارم دیکھنے اور کانفرنسیں اٹینڈ کرنے کے اور کوئی کام نہیں۔ ایک مہینے سے مجھے سر کھجانے کی مہلت نہیں۔''

''تمہاری ڈاکٹر باجپئی تو بڑی قابل لڑکی ہے۔ وہ ان کو سارا ڈوپ دے رہی ہوگی۔''

''جی''

پھر وہ اندر جا کر اپنی ماں سے ملا۔

''دمینتی بوا کہاں ہیں؟'' اس نے غسل خانے میں نہاتے ہوئے آواز دی۔

''شہر میں، ان کے پاس بھی ہو آنا۔''

''جی اچھا۔''

''تم اچھی طرح ہو بیٹے۔''

''جی ہاں، بچن کا بیاہ کب ہو رہا ہے؟''

''اگلے پھاگن میں۔'' ماں نے جواب دیا۔

''پرکاش چاچا کی کوٹھی بن گئی۔''

''نہیں۔ وہ خان بہادر محمد حسن، نہیں تھے، ریٹائرڈ جج۔ وہ پاکستان چلے گئے، ان کی کوٹھی نیلام ہو رہی تھی۔ وہ پرکاش نے لے لی، بہت سستی مل گئی۔''

غسل خانے سے نکل کر کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اسی طرح کی دو چار اور گھریلو باتیں لیڈی دیپ نرائن سے اس نے کیں۔ پاکستان کے نام پر اس کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔ پاکستان کو تو وہ ہمیشہ بھلائے رکھتا تھا حالانکہ ابھی اسے شراوستی کے ان مغربی زائرین کو کشمیر کا مسئلہ بھی سمجھانا ہوگا۔

اس کا دم بے طور گھبرانے لگا۔ اس پر وہی وحشت طاری ہوگئی جس نے چند روز قبل اسے نئی دلی میں آ ناد بوچا تھا۔

''میں ذرا ہوا کھانے دریا تک جاتا ہوں۔'' اس نے اپنی ماں سے کہا۔

''ابھی تو اتنا لمبا سفر طے کر کے آ رہے ہو، اب پھر چل دیے۔ لیٹ کر آرام کرو۔'' ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

وہ باہر نکل آیا اور اپنے باپ کی کار لے کر دریا کی طرف چل دیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور ہوا بند تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ ایک شکستہ مندر کی سیڑھیوں پر جا

بیٹھا۔ یہاں مکمل تنہائی تھی اور وہ بالکل خالی الذہن ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے اسے زندگی میں پہلی بار خیال آیا: کاش نروان ممکن ہوتا۔ خوف، تنہائی کا احساس، رنج، نفرت، فرار کی خواہش، وسعت اور اضافیت کا تصور.........نروان.........جو زندگی سے، موت سے، سونے جاگنے، محبت، رحم اور لاتعلقی سے ماورا ہے اور پھر بھی حقیقی ہے۔ معدومیت.........صفر.........صفر.........

کیا یہ غیر ملکی مفکرین سمجھ سکتے تھے کہ اس کے، ہندوستان کی روح کے دکھ کیا ہیں؟ اس نے سگریٹ سلگایا اور مندر کے فرش پر نیم دراز ہو گیا۔ برسات کا زمانہ ہے، یہاں سانپ اور کیڑے مکوڑے ضرور ہوں گے۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔ اسے لگا گویا جنگل سے اس کی بہت پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ انہی فضاؤں، انہی پودوں اور درختوں کی معیت میں پلا بڑھا تھا۔

دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدہم ہنسی کی آواز سنائی دی۔

''تم کون ہو بھائی۔'' نیچے سے کسی نے پوچھا۔

''میں ہوں۔'' گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

دوسرا نوجوان مندر کی منڈیر کود کر اندر آ گیا۔

''یہ کیا وحشت ہے؟ میں تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ تمہارے گھر گیا۔ تمہارے اماں ابا نے بتلایا کہ تم دریا پر براج رہے ہو۔''

''ہاں یار۔ اس وقت غیر معمولی حبس طاری ہے۔ ایک پتا تک نہیں ہل رہا۔ تمہارا دن کیسا بیتا۔''

''بور ہو گئے میاں۔'' ہری شنکر نے قریب کی سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ

بدھا جینٹی کچھ دن اور اسی طرح چالو رہی تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس۔ دیکھو اسی چکر میں میں لکھنؤ نہ جا سکا۔ بنگلور سے جے۔ ایس کا تار ملتے ہی پہنچا دلی اور اب یہ یاتری لوگ، ارونا باچپئی کہہ رہی تھی کہ یہاں سے سیدھے کپل وستو اور گیا جانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ راستے بھر ڈاکٹر ہینس کریمر نے مجھے مہایانا اور زین کے فری پر وہ وہ لیکچر دیے ہیں کہ پڑا ہو گیا میرا۔ تمہاری موٹر میں تو صرف موسیو راول ہی تھے۔"

پھر یک بیک وہ چپ ہو گیا۔ ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دونوں بے حد اداس ہو گئے۔

"یار گوتم۔"

"ہاں۔"

"یار کمال ہمیں دغا دے گیا۔" ہری شنکر نے چند لمحوں بعد آہستہ سے کہا۔

"تم کو پتا ہے سالا دلی ہوتا ہوا گیا۔ اگر مجھے تار دے دیتا تو میں اس سے آ کر وہیں مل لیتا۔"

"میں تو دلی میں موجود تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے نہیں ملا۔" گوتم نے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"جانے اس وقت وہ کہاں ہو گا؟" ہری شنکر نے تاسف سے کہا۔

"کراچی میں ہو گا اور کہاں ہو گا۔" گوتم نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابوالمنصور کمال الدین کس

طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔

ندی رواں رہی۔ وہ دونوں جھک کر اس میں اپنا عکس دیکھنے لگے۔ گوتم نے ایک کنکر پانی میں پھینکا اور لہروں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا جس میں ان دونوں کے عکس پھیل سے گئے۔

گھاٹ سے کچھ فاصلے پر کمیونٹی پروجیکٹ کے سنٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لوک گیت منڈلی نے سالانہ یوتھ فیسٹول لیے کے اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کی آوازیں تیرتی ہوئی ان دونوں تک آ رہی تھیں۔ دور گاؤں کی چوپال میں نوٹنکی ہو رہی تھی۔ آم کے جھنڈ کے باہر آلہا اودل گایا جا رہا تھا۔ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دور مسلمانوں کے محلے میں پنڈال لگے تھے اور گیس کے ہنڈے نصب تھے اور شاید میلاد شریف پڑھا جا رہا تھا۔ آگے سول لائنز میں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی میں یورپین مہمان ڈنر کھا رہے تھے۔

گوتم نے ایک الٹی ہوئی ناؤ پر پیر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ندی کے کنارے اکیلا کھڑا تھا۔ ہری شنکر کسی کسان سے باتیں کرتا کمیونٹی پروجیکٹ سنٹر کی طرف جا چکا تھا۔ بادل اب دریا پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

اس نے اپنے تھکے ہوئے پاؤں کو دیکھا، بڑھتی ہوئی تاریکی پر نظر ڈالی لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی! وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی۔ زمین اس کا ساتھ دے گی۔

اس نے آگے چلنا شروع کیا۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا:
زمین، تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

طرح طرح کے پودے اور پھولوں کے ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک آئیں۔ پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے کھیتوں کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ۔ بڑھتی جاش او جو کی بالیو تاکہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفانوں سے محفوظ رہو۔ جو کی الوہی بالیو............ سمندر کی طرح اتھاہ رہو............ وہ سب امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں تمہارے کھلیان امٹ رہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پگڈنڈی پر آ گیا اور دریا کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پپیہے چلاتے تھے بھنورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔

گانے والوں کی آوازیں قریب آتی گئیں۔

منڈلی نے گایا۔

بنجر آج ہرے رے

کھیتن میں ناج بھرے رے

جیون آج سپھل رے

اچھی دھان اچھی فصل رے

وہ ٹہنیاں ہٹاتا اس طرف بڑھنے لگا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں:

ڈالوں کے بیچ بیچ پتیوں کے بیچ بیچ

موتین کی لالن کی لڑیاں اگائے ہو............

اونیرے آئے ہو............

وہ غور سے سنا کیا جب الفاظ اس کی سمجھ میں آئے اور تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھر گیا۔

چٹانیں، اوالانش، گلیشیر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ............ان سب میں سے گزرتا ہر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا۔ چوٹی پر وہ دو زانوں بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلاء ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا، شکست خوردہ، بشاش پر امید، انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔ وہ مسکرا کر نیچے اترا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔

جاگنے والوں کا جاگنا مبارک ہو

قانون کا پرچار مبارک ہو

سنگھ میں امن مبارک ہو

ان لوگوں کی ریاضت مبارک ہو

جنہیں شانتی میسر آ گئی ہے

شاکینہ منی نے کہا............

وہ منڈیر پر سے اترا، اس نے لمبا سانس لیا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا بستی کی طرف واپس چلا گیا۔

ماری پور، کراچی

اگست ۵۶ء............دسمبر ۵۷ء

ختم شد ---------------- The End

آگ کا دریا
جلد سویم
قرۃ العین حیدر
KURF
FlamingText.com
جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم دانش